زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی

...... ایک ہی مٹی کے لوگ ......

ہم انسان کو کتنا جان سکتا ہے۔کون دعویٰ کرسکتا ہے۔انسانی زندگی کا اچانک ظاہر ہونے والا کوئی ایک روّیہ اُس فرد کی گزشتہ ساری زندگی کے شب وروز کے حوالے سے حیران کردیتا ہے۔رات کے گھپ اندھیرے میں جب جگمگاتا ہوا نیلا آسمان ایک دبیز کالی چادر میں چھپ جاتا ہے تو بارش میں اُبھرنے والی تیز بجلی کی چمک میں ہزار بار کا دیکھا ہوا منظر ہر رُخ اور زاویہ ایک نئی طرح نظر آتا ہے۔یہی حال زندگی کا ہے اور یہی انداز انسان کا ہے۔ساری دنیا کے انسان، ایک جیسے تھے۔۔۔اور ایک جیسے ہیں۔زمانے کا فرق تو ایسا ہے جیسے سمندر، دریا یا کسی بہتے ہوئے جھرنے کا پانی گلاس میں رکھے ہوئے پانی سے مختلف نہیں ہوتا۔میں نے انسانی زندگی کے رازوں کو زیادہ سے زیادہ دیکھنے کی کوشش کی ہے۔لیکن آخر کار یقین اس بات پر آیا کہ رنگ، نسل، زبان، لباس اور معاشرت کے اختلاف کے باوجود۔سب ایک ہی مٹی کے لوگ ہیں۔ایک جیسے خون اور ایک جیسے آنسوؤں کے مالک۔اپنے اپنے آدرش کی خوشی تراشتے اور تلاش کرتے ہوئے۔اور ہر انسان کے چہرے کی مسکراہٹ کا رنگ زندگی کے ہر روپ کو خوب صورت بنا دیتا ہے۔ ...... سلطان جمیل نسیم

اشاعت:۲۰۱۴ء، قیمت:۴۰۰ روپے، دستیابی: بختیار اکیڈمی، A/49-3-، گلشن اقبال، کراچی۔

...... لاکلامی ......

مسدس ''لاکلامی'' کے خالق جناب آفتاب مضطر ہیں۔وہ عہدِ حاضر کے معتبر اور جدید ذہن رکھنے والے شعراء کے قبیل سے ہیں، جن کے یہاں سلیقۂ شاعرانہ ہے، جو زبان و بیان اور فنی اُمور پر محتاط رویے ساتھ ان پر مضبوط گرفت رکھتے ہیں۔میں نے آفتاب مضطر کی دونوں مذکورہ مسدسیں بالاستیعاب پڑھی ہیں۔ہیئت کے اعتبار سے تو یہ مسدسیں ضرور ہیں، مگر معنوی طور پر ان کا ہر مصرع دوسرے مصرع سے اس قدر مربوط و پیوستہ ہے کہ ''مثنوی'' کا مزا آتا ہے۔مسدس اگرچہ مثنوی کے مقابلے میں ذرا مشکل ہوتی ہے اور اس کے تمام مصرع اس درجہ پیوستہ و مربوط نہیں ہوتے جیسے مثنوی کے ہوتے ہیں۔آفتاب مضطر کے تصوّر میں مشہور مسدسیں ہیں، مثلاً ''مسدس مدو جزر اسلام'' (مسدس حالی) ''شکوہ، جواب شکوہ، از علامہ اقبال'' دونوں مسدسوں میں دین و مذہب، شریعت و طریقت، حاکم و محکوم، رعایا اور راعی، تہذیب و ثقافت، دینی و دنیوی اقدار، ظلم و بربریت، نسل، زبان و اوطان، مذہبی و علاقائی عصبیت، انصرام و انتظام، ناظر و نظارت وغیرہ کی نہایت واضح شعری صورت گری کی ہے، ان دونوں مسدسوں کو پڑھ کر شاعر کے انتقادی مشاہدے کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا اور بے ساختہ ایک ہنر مند شاعر کا تصور ذہن میں اُبھرتا ہے۔اس تصوّر کی توثیق قارئین بھی ان مسدسوں کو پڑھ کر ضرور کریں گے۔ ......محسن اعظم محسن ملیح آبادی

اشاعت:۲۰۱۴ء، قیمت:۲۸۰ روپے: دستیابی: بیونڈ ٹائم پبلی کیشن، کراچی۔

...... آنکھوں کے ساگر ......

احسان بن مجید افسانے کی دُنیا میں تعارف کا محتاج نہیں۔اس کے لفظوں میں مروج معانی سے الگ، قابل فہم معانی موجود ہوتے ہیں، اور اس کو جملوں سے اپنی مرضی کا رنگ کشید کرنے کا فن آتا ہے۔برسوں کی ریاضت کے بعد ہاتھ آنے والا یہی وہ ہنر ہے جو نام نہاد خام افسانہ نگاروں کی بھیڑ سے پختہ کار فن کار کو ممتاز اور جدا کرتا ہے۔میں اس کی افسانہ نگاری کا چشم دید گواہ ہوں، یہ اپنے چاروں طرف افسانے کو پھیلا لیتا ہے اور پھر آغاز سے انجام تک ایک ایک مرصع جملہ اُٹھا کر جڑتا جاتا ہے۔لفظوں کے استعمال میں اس قدر محتاط ہے کہ غیر ضروری لفاظی اسے دوسروں کے افسانے میں بھی پسند نہیں۔لفظ کے استعمال سے پہلے کسی ماہر معمار کی طرح اسے ہر زاویے سے دیکھتا، پرکھتا اور پھر ٹھوک بجا کر اپنے مقام پر لگاتا ہے، بھٹکے ہوئے پیراگراف جو افسانے کی طوالت کے غرض سے لکھے جاتے ہیں اس کے نزدیک حرام ہیں۔نتیجے کے طور پر جو عمارت کھڑی ہوتی ہے اسے افسانے کا تاج محل کہنا پڑتا ہے۔''آنکھوں کے ساگر'' افسانے میں گُندھے اس شخص کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے، مشاہدہ، تخیل اور تمنا کا ایسا دلکش مرقع آج کل کہاں ملتا ہے۔ ...... سید نصرت بخاری

اشاعت:۲۰۱۴ء، قیمت:۲۰۰ روپے، دستیابی: ادارہ جمالیات، اٹک (پاکستان)

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۴،شمارہ:جنوری،فروری ۲۰۱۵ء

رابطہ:537/D-1 'ویسٹریج-III' راولپنڈی، پاکستان۔

فون:5462495,5490181-51-(92+)

فیکس:5550886-(92+)

موبائل:0558618-336-(92+)

ای۔میل:chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر:فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازارراولپنڈی

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق۔۔۔۔۔۔۔شعیب حیدر زیدی
تزئین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔عظمیٰ رشید
کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تنویر الحق

قرطاسِ اعزاز

☆

منظوم خاکہ

○●○

ہزاروں سال تک صحرا کی ہم نے خاک چھانی ہے
ہوا ہے جب کہیں جا کر دکھن میں ''خاکہ ور'' پیدا
گلستانِ دکھن میں جو کبھی غنچہ کِھلا ہوگا
کسے معلوم تھا وہ پھول بن کر مجتبیٰ ہوگا
تُو اپنا وہ زمانہ خواب میں اب دیکھتا ہوگا
ترا بچپن دکھن کی وادیوں میں کھیلتا ہوگا
معطر تیری خوشبو سے ابھی وہ رہگزر ہوگی
گزرتی آج بھی اس راہ سے بادِ سحر ہوگی
دریچے سے کبھی اسکول کے تو جھانکتا ہوگا
کبھی کالج کی پریوں کو کہیں سے تاکتا ہوگا
نشیمن پر کسی کے برق بھی تیری گری ہوگی
پری پیکر کوئی اس وقت میں تجھ پر مری ہوگی
تجھے ماضی کے اپنے بام و در جب یاد آئیں گے
ستارے آج بھی پلکوں پہ تیری جھلملائیں گے
دکھن سے کھٹّا کھا کر تو اگر دلّی میں آیا ہے
نہاری کا تجھے دلّی کی، پھر چٹخارا لایا ہے
جوانی تیری پیری کا مزہ اب چکھنے والی ہے
ترے بالوں کی کھچڑی رفتہ رفتہ پکنے والی ہے
شکن ماتھے پہ اب گہری سے گہری پڑنے والی ہے
خمِ ابرو پہ تیرے برف اجلی جمنے والی ہے
بصارت سے زیادہ تیز اب تیری بصیرت ہے
کہ تیرے حسنِ بینائی کو چشمے کی ضرورت ہے
اگرچہ کان بے بہرا نہیں تیرے، سماعت سے
مگر محفوظ یہ کب تک رہیں گے اس علامت سے
یہ اونچی ناک چہرے پر تیرے اس کی ضمانت ہے
ترے اسلاف کی قائم ترے دم سے بھی عظمت ہے
ترے دانتوں کی گر بنیاد تھوڑی ہل گئی ہوگی
زبانِ ناتواں کو اس سے راحت مل گئی ہوگی
لب و رخسار کا تیرے رس گھلنے والا ہے
شبابِ زندگانی کا تیرے رس گھلنے والا ہے
تری تو شخصیت کا رنگ دنیا سے نرالا ہے
نہ گندم سا نہ انجم سا نہ گورا ہے نہ کالا ہے
تری سیرت کہیں صورت سے تیری خوبصورت ہے
ترے اخلاق کی کہتے ہیں عالم گیر شہرت ہے
تری آنکھوں میں شوخی ہے شرارت ہے مروت ہے
ترے دل میں محبت ہے، عقیدت ہے اخوت ہے
تو قد آور ہے لیکن قد ترا بالکل مناسب ہے
اسی سے پستہ قد لوگوں پہ تیرا رعب غالب ہے
جسامت نفس کی تیرے نہیں ہوتی ہے یوں موٹی
تجھے کھانے کو جو ملتی نہیں ہے مفت کی روٹی
تو عابد ہے نہ زاہد ہے تو فاجر ہے نہ فاسق ہے
ترا مسلک الگ تیری شریعت کے مطابق ہے
مؤدب ہو کے تو نے کی جہانگیری زمانے میں
سفر نامے ترے غماز ہیں، تیرے فسانے میں
نظر یورپ پہ تیری دل ترا جرمن میں رہتا ہے
تصور میں کنیڈا اور تو لندن میں رہتا ہے
تجھے جاپان کی چھتری میں جب تارے نظر آئے
عزائم تیرے اچکا کر تجھے پھر چین میں لائے
یہاں جب نکتہ چینی کی مزاج یار نے تیرے
لگائے ماسکو کے پھر کسی کی یاد میں پھیرے
گلا کر دال دنیا میں جب اپنی، اپنے گھر آیا
مؤدب ہو کے بیوی نے تری تجھ سے یہ فرمایا
جہاں میں لوٹ کر بدھو جب اپنے گھر کو آتے ہیں
حسینانِ جہاں کے کچھ نمونے ساتھ لاتے ہیں
وہ خود بچوں میں اپنے دیش کا پردھان کہلائے
سفر میں اپنی بیگم کو جو اپنے ساتھ لے جائے

متین امروہوی (بھارت)

○●○

قرطاسِ اعزاز مجتبیٰ حسین کے نام

○●○

عطائے ربِّ جلیل
سیدامتیازالدین
(حیدرآباد، دکن)

نام: مجتبیٰ حسین
والد: مولوی احمد حسین
والدہ: امیرالنساء بیگم
بھائی: محبوب حسین جگر مرحوم، عابد حسین مرحوم، ابراہیم جلیس مرحوم، یوسف حسین، اقبال حسین مرحوم، محمود حسین، خورشید حسین مرحوم، سرتاج حسین۔
وطن: گلبرگہ
(آباء و اجداد عثمان آباد کے تھے۔ والد صاحب ملازمت کے سلسلہ میں گلبرگہ میں رہ گئے)
تاریخ پیدائش: 15جولائی1936ء
(سرٹیفکیٹ کے مطابق15جولائی1933ء)
مقام پیدائش: ریاست کرناٹک ضلع گلبرگہ تحصیل چنچولی
تعلیم:
ا۔ ابتدائی تعلیم والد صاحب کی نگرانی میں گھر پر ہوئی۔ سیدھے چوتھی جماعت میں گلبرگہ کے مدرسہ تحتانیہ آصف گنج میں داخلہ ملا۔ اس کے علاوہ عثمان آباد میں بھی کچھ عرصہ زیر تعلیم رہے۔
۲۔ میٹرک، گورنمنٹ ہائی اسکول تانڈور 1951ء
۳۔ انٹرمیڈیٹ، انٹرمیڈیٹ کالج گلبرگہ 1953ء
۴۔ گریجویشن(BA) عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد1955ء
۵۔ ڈپلوما ان پبلک ایڈمنسٹریشن عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد1958ء
شادی: 11نومبر1956ء ناصرہ رئیس
(چچازاد بہن بنت مولوی محمد غوث صاحب)
اولاد: راشدہ رئیس، ہادی حسین، مصباح حسین، نجیبہ رئیس
ملازمت:
ا۔ ابتداء روزنامہ سیاست میں بحیثیت سب ایڈیٹر(1956ء)
۲ محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ حکومت آندھراپردیش 1962تا1972ء
۳۔ شعبہ ریسرچ، گجرال کمیٹی، دہلی10نومبر1972تا18ستمبر1974ء
۴۔ شعبہ پبلیکیشن NCERT، حکومت ہند19ستمبر1974تاجولائی1991ء
۵۔ بحیثیت ایڈیٹر ملازمت سے سبکدوشی کے بعد 'سیاست' میں مستقل کالم نگاری کے علاوہ خصوصی کرسپانڈنٹ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

پہلی مطبوعہ تحریر:
ا۔ 15اگست1962ء کالم شیشہ وتیشہ، روزنامہ سیاست میں کوہ پیما کے فرضی نام سے مزاحیہ کالم کی اشاعت
۲۔ 1964ء ماہنامہ صبا میں ''غالب کے طرفدار'' مجتبیٰ حسین کے اصلی نام سے مزاحیہ مضمون کی اشاعت

تصانیف:
ا۔ تکلّف برطرف(مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)۔نیشنل بکڈپو حیدرآباد1968ء
۲۔ قطع کلام(مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)۔نیشنل بکڈپو حیدرآباد1969ء
۳۔ قصہ مختصر(مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)۔حسامی بکڈپو حیدرآباد1972ء
۴۔ بہرحال(مزاحیہ مضامین کا مجموعہ) حسامی بکڈپو حیدرآباد1974ء
۵۔ آدمی نامہ(خاکے)۔حسامی بکڈپو حیدرآباد1981ء
۶۔ بالآخر(مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)۔حسامی بکڈپو حیدرآباد1982ء
۷۔ جاپان چلو جاپان چلو(سفرنامہ)۔حسامی بکڈپو حیدرآباد1983ء
۸۔ الغرض(مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)۔حسامی بکڈپو حیدرآباد1987ء
۹۔ سو ہے وہ بھی آدمی۔(خاکے)۔حسامی بکڈپو حیدرآباد1987ء
۱۰۔ چہرہ در چہرہ(خاکے)۔مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی1993ء
۱۱۔ سفرلخت لخت(سفرنامہ)۔حسامی بکڈپو حیدرآباد1995ء
۱۲۔ آخرکار(مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)۔مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی1997ء
۱۳۔ ہوئے ہم دوست جس کے(خاکے)۔تخلیق کار پبلیکیشنز نئی دہلی1999ء
۱۴۔ میرا کالم(کالموں کا انتخاب)۔حسامی بکڈپو حیدرآباد1999ء
۱۵۔ مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں۔مرتبہ حسن چشتی۔(جلد اوّل)۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔2001ء
۱۶۔ مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں۔مرتبہ حسن چشتی (جلد دوم)۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔2002ء
۱۷۔ مجتبیٰ حسین کے سفرنامے۔مرتبہ حسن چشتی۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی2003ء
۱۸۔ مجتبیٰ حسین کے منتخب کالم۔مرتبہ حسن چشتی۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی2004ء
۱۹۔ آپ کی تعریف (خاکے) مرتبہ سید امتیاز الدین۔ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی2005ء
۲۰۔ کالم برداشتہ(کالموں کا انتخاب)۔مرتبہ سید امتیاز الدین۔ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی2007ء
۲۱۔ مہرباں کیسے کیسے (خاکے) مرتبہ سید امتیاز الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی2009ء

۲۲۔ امریکہ گھاس کاٹ رہا ہے (سفرنامہ اور امریکہ کے بارے میں کالموں کا انتخاب)۔ مرتبہ احسان اللہ احمد۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔2009ء

۲۳۔ اردو کے شہر اردو کے لوگ (رپورتاژ اور شخصی خاکوں کا مجموعہ) مرتبہ رحیل صدیقی۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔2011ء

۲۴۔ کالم میں انتخاب (منتخب کالموں کا مجموعہ) مرتبہ سید امتیاز الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی 2011ء

(اس فہرست کی ابتدائی 14 کتابیں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی کے زیر اہتمام 2011ء میں دوبارہ شائع ہوئیں)

مجتبیٰ حسین کی مرتبہ کتابیں:

(۱) شیشہ و تیشہ (شاہد صدیقی کے کالموں کا انتخاب) آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی 1964ء

(۲) ضبط شدہ نظمیں (بہ تعاون ڈاکٹر خلیق انجم) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی 1975ء

(۳) ''آج کل'' طنز و مزاح نمبر (بحیثیت مہمان مدیر) دو شمارے۔ پبلیکیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات و نشریات حکومت ہند۔

ہندی کتابیں:

(۱) قصہ آرام کرسی کا۔ پستکائن نئی دہلی 1987ء

(۲) جاپان چلو جاپان۔ پستکائن نئی دہلی۔1988ء

(۳) سوئز بینک میں کھاتہ ہمارا۔ پستکائن نئی دہلی 1990ء

(۴) سند باد کا سفرنامہ۔ راج کمل پرکاشن دہلی 1994ء

(۵) چہرہ در چہرہ۔ سارانش پبلیشرز نئی دہلی 1999ء

(۶) مجتبیٰ حسین کے خاکے۔ وانی پرکاشن نئی دہلی 2009ء

(۷) جاپان چلو جاپان چلو کا جاپانی زبان میں ترجمہ (مترجم شاشورے) 1985ء میں شائع ہوا۔

(۸) سرس ساہتیہ سمیتی (کٹک) نے مجتبیٰ حسین کی تخلیقات کا مجموعہ اُڑیا زبان میں شائع کیا۔

☆ سماجی، تہذیبی اور ادبی موضوعات پر ہزاروں کی تعداد میں مضامین ہندوستان کے اہم اور نمائندہ اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

☆ دو سو سے زائد طنزیہ و مزاحیہ مضامین اور خاکے ہندی کے نمائندہ اخبارات و رسائل مثلاً دھرم یگ، سپتاہک ہندوستان، ساریکا، دینک ہندوستان، نو بھارت ٹائمز، نونیت، دنمان، ہنس، سنڈے میل، جے وی جی ٹائمس وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں۔

☆ ماہنامہ پونم حیدرآباد میں ایک عرصہ تک فرضی نام سے مستقل مزاحیہ کالم لکھتے رہے

☆ ان کے مضامین، سفرنامے اور خاکے کئی غیر ملکی زبانوں بشمول انگریزی، روسی اور جاپانی میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں

☆ ان کی تخلیقات ہندوستان کے کئی اسکولوں، کالجوں اور تقریباً تمام جامعات کے نصاب میں شامل ہیں۔

اداروں سے وابستگی:

(۱) ممبر گورننگ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت فروغ انسانی وسائل حکومت ہند۔2000۔1997ء

(۲) ممبر ٹیلیفون مشاورتی کمیٹی دہلی 2002۔2000ء

(۳) ممبر پریس کلب آف انڈیا۔ نئی دہلی

(۴) ممبر مجلس مشاورت ماہنامہ شگوفہ

(۵) جنرل سکریٹری مزاح نگاروں کی پہلی کل ہند کانفرنس 1966ء

(۶) جنرل سکریٹری جشن مزاح 1967ء

(۷) جنرل سکریٹری زندہ دلان حیدرآباد 72-1968ء

(۸) صدر زندہ دلان حیدرآباد 2011ء سے

(۹) صدر انجمن ترقی پسند مصنفین آندھرا پردیش 2010ء سے

بیرونی ممالک کے سفر:

۱۔ جاپان: ایک مہینہ پانچ دن 1980ء

۲۔ انگلستان: ایک ماہ 1984ء

۳۔ پیرس: ایک ہفتہ 1984ء

۴۔ امریکہ: ایک مہینہ دس دن 1984ء

۵۔ کینیڈا: چار دن 1984ء

۶۔ سوویت یونین: تاشقند، سمرقند، بخارا، ماسکو، لینن گراڈ، دس دن 1986ء

۷۔ سعودی عرب: 25 دن 1988ء

۸۔ پاکستان: 25 دن 1988ء

۹۔ مسقط: 5 دن دسمبر 1995ء

۱۰۔ سعودی عرب: 23 دن 1996ء بحیثیت رکن سرکاری وفد بموقع حج

۱۱۔ دبئی: 5 دن 1997ء

۱۲۔ امریکہ: ڈھائی مہینے 2000ء

۱۳۔ سعودی عرب: دس دن 2004ء

۱۴۔ امریکہ۔ کینیڈا: تین مہینے 2008ء

انعامات اور اعزازات:

۱۔ ہاسیہ رتن۔ سرس ساہتیہ سمیتی کٹک 1980ء

۲۔ نشان امتیاز۔ بزم ساز و ادب دہلی 19 نومبر 1983ء

۳۔ غالب ایوارڈ (برائے طنز و مزاح 1982ء) غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی (6 جولائی 1984ء)

۴۔ ایوارڈ برائے تخلیقی نثر اردو اکیڈیمی دہلی 1989ء

۵۔ کل ہند مخدوم ادبی ایوارڈ۔ اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش 1994ء

۶۔ کل ہندمہندرسنگھ بیدی ایوارڈ۔اردواکیڈیمی ہریانہ 1998ء
۷۔ کل ہندایوارڈبرائے مجموعی خدمات۔اردواکیڈیمی کرناٹک 2002ء
۸۔ کل ہندجوہرقریشی ایوارڈ۔مدھیہ پردیش اردواکیڈیمی 2003ء
۹۔ میرتقی میرایوارڈ۔امریکی فیڈریشن آف مسلمس آف انڈین آریجن (افمی)2006ء
۱۰۔ پدم شری۔حکومت ہند 2007ء
۱۱۔ کل ہندصوفی جمیل اختر ایوارڈ۔کولکتہ 2009ء
۱۲۔ کل ہندامیرخسرونیشنل ایوارڈ۔انجمن ترقی اردوجمشید پور،جھارکھنڈ 2009ء
۱۳۔ ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری۔گلبرگہ یونیورسٹی کرناٹک 2010ء
۱۴۔ سنت گیانیشورنیشنل ایوارڈ۔اردوساہتیہ اکیڈیمی حکومت مہاراشٹرا 2011ء
۱۵۔ وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے تقرر۔یونیورسٹی آف حیدرآباد 2013۔2011ء

دیگرسرگرمیاں:

۱۔ یونیورسٹی آف ورجینیاامریکہ کے شعبہ مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیائی السنہ کے زیراہتمام منعقدہ اردوفیسٹیول میں شرکت (ستمبر 2008ء)
۲۔ مہمان مقررکی حیثیت سے ہندی اردوفلیگ شپ پروگرام میں توسیعی خطبہ دیا جو یونیورسٹی آف ٹیکساس آسٹن امریکہ کے زیراہتمام آراستہ کیا گیا تھا(اکتوبر2008ء)

ریڈیواورٹیلی ویژن:

۱۔ پچھلی نصف صدی کے عرصہ میں ملک بھر کے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پروگراموں میں حصہ لیتے رہے ہیں
۲۔ بیرونی دوروں کے موقع پر بی بی سی، وائس آف امریکہ، کینیڈین ٹی وی، ماسکوریڈیواورریڈیوجاپان ٹوکیو(این ایچ کے) میں پروگرام پیش کئے۔
۳۔ ای ٹی وی اردونے ''عجب مرزاغضب مرزا'' کے عنوان سے مجتبیٰ حسین کی تحریروں پرمبنی 52ایپی سوڈس کاسیریل پیش کیا۔

فن اورشخصیت پرتحقیقی کام:

۱۔ ماہنامہ شگوفہ حیدرآبادنے 1987ء میں مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کے پچیس سال کی تکمیل کے موقع پرایک خصوصی نمبرشائع کیا
۲۔ مشہورومعروف نقاداوراسکالرپروفیسرشکیل الرحمٰن (سابق وائس چانسلر بہار یونیورسٹی و سابق مرکزی وزیر) نے ''مجتبیٰ حسین کا فن'' کے عنوان سے کتاب لکھی جو1988ء میں حسامی بکڈپوحیدرآبادسے شائع ہوئی۔
۳۔ پرموشن آرٹ بیوروشارجہ(یواے ای) نے ایک ضخیم سووینیرجشن مجتبیٰ حسین کے موقع پران کے فن اورشخصیت کے بارے میں شائع کیا جس میں برصغیرکے ممتازاہل قلم کے مضامین اورتاثرات شامل ہیں(1997)
۴۔ ریسرچ اسکالرحسن مثنی نے''مجتبیٰ حسین اورفن مزاح نگاری'' کے عنوان سے کتاب تصنیف کی جوایلیا پبلیکیشن دہلی کے زیراہتمام شائع ہوئی(2003)
۵۔ ڈاکٹرافسرکاظمی نے''مجتبیٰ حسین بحیثیت طنزنگار'' کے زیرعنوان کتاب لکھی جسے ماڈرن پبلشنگ ہاوس نئی دہلی نے شائع کیا(2003)
۶۔ ''کتاب نما'' دہلی کا خصوصی شمارہ ڈاکٹرمحمدکاظم کی زیرادارت مکتبہ جامعہ لمیٹیڈنئی دہلی سے شائع ہوا(2004)
۷۔ پروفیسرشفیع شیخ صدرشعبہ عربی ممبئی یونیورسٹی نے افسانوی انداز میں 'مجتبیٰ حسین ایسا کہاں سے لاوٴں' کے نام سے ایک کتاب بطورناول شائع کی(2004)
۸۔ گلبرگہ کے بارے میں مجتبیٰ حسین کی تحریروں پرمبنی احسان اللہ احمد نے 'مجتبیٰ حسین اورگلبرگہ' کے زیرعنوان ایک کتاب ترتیب دی۔
۹۔ پونے(مہاراشٹرا) کے مشہور تعلیمی ادارے غلام محمداعظم ایجوکیشنل ٹرسٹ کے زیراہتمام ممتازصحافی رفیق جعفرنے 'اردوادب کے تین بھائی' کے نام سے ایک ضخیم کتاب شائع کی، جس میں محبوب حسین جگر، ابراہیم جلیس اورمجتبیٰ حسین کے شاندارادبی کارناموں کاتفصیلی جائزہ لیا گیا(2009)
۱۰۔ غلام محمداعظم ایجوکیشنل ٹرسٹ کے زیراہتمام رفیق جعفرنے ''طنزومزاح کے تین ستون'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی جس میں مجتبیٰ حسین، مشتاق احمد یوسفی اور یوسف ناظم کی شخصیت اورفن کاجائزہ لیا گیا(2012)
۱۱۔ ''دکن میں طنزومزاح کی روایت اورمجتبیٰ حسین کی خدمات'' کے عنوان سے ڈاکٹرسیدہ شائستہ مقیم نے ایک ضخیم کتاب لکھی جسے ''کتابی دنیا'' 1955، گلی نواب مرزا، ترکمان گیٹ دہلی نے شائع کیا(2012)
۱۲۔ ''مجتبیٰ حسین: جیسادیکھاجیساپایا'' شخصیت کے بارے میں مشاہیرادب کے مضامین کا مجموعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی(2013)
۱۳۔ ''مجتبیٰ حسین: آئینوں کے بیچ'' فن کے بارے میں مشاہیرادب کے مضامین کا مجموعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی(2013)
۱۴۔ ماہنامہ صباحیدرآباد، ماہنامہ الفاظ علی گڑھ، ماہنامہ انشاء کلکتہ، روزنامہ جنگ کراچی، روزنامہ جنگ لندن، روزنامہ آزاد ہند کلکتہ، روزنامہ آفتاب بھوپال، ماہنامہ شاعر ممبئی، ماہنامہ سب رس حیدرآباد، رسالہ قرطاس (پاکستان)، ماہنامہ عدسہ حیدرآباد، ماہنامہ الانصارحیدرآباداورروزنامہ منصف حیدرآبادنے اپنے شماروں میں مجتبیٰ حسین پرخصوصی گوشے شائع کئے۔
۱۵۔ حیدرآبادسنٹرل یونیورسٹی، کشمیریونیورسٹی سرینگر، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، بروڈہ یونیورسٹی گجرات، روہیلکھنڈ یونیورسٹی یوپی، مرہٹواڑہ یونیورسٹی، اورنگ آباد اورپٹنہ یونیورسٹی کے طلباء مجتبیٰ حسین کے فن پرریسرچ کررہے ہیں۔ڈاکٹرافسرکاظمی (جمشیدپور)، ڈاکٹرشگفتہ پروین (دہلی)، ڈاکٹرگل رعنا (حیدرآباد) ڈاکٹرسیدہ شائستہ مقیم(اورنگ آباد)اورڈاکٹرآسیہ پروین(پٹنہ) کوپی ایچ ڈی کی ڈگریاں مل چکی ہیں۔سردارپاشاہ، حسن مثنی اورپیرزادہ ارشاداحمدکوعلی الترتیب گلبرگہ یونیورسٹی، رانچی یونیورسٹی اورکشمیریونیورسٹی سرینگر سے ایم فل کی ڈگریاں مل چکی ہیں۔
۱۶۔ آج کل مجتبیٰ حسین روزنامہ سیاست حیدرآباد میں میراکالم کے عنوان سے اپناہفتہ وارکالم تحریرکررہے ہیں جسے نہ صرف سیاست کے قارئین نہایت شوق سے پڑھتے ہیں بلکہ یہ کالم برصغیرکے کئی اخبارات ورسائل میں نقل کیا جاتا ہے۔

صادقین

مجتبیٰ حسین

۱۱رفروری 1987ء کی شام کو دہلی کے ایک بزرگ شاعر کی پچھترویں سالگرہ منائی جارہی تھی۔مسرت اورشادمانی کا ماحول تھا۔تقریروں کا سلسلہ جاری تھا کہ کسی نے چپکے سے آکر میرے کان میں کہا''کیا آپ کو پتہ ہے کہ صادقین صاحب چل بسے۔''

میں نے حیرت سے پوچھا''کب؟''

بولے''کل کراچی میں ان کا انتقال ہوگیا۔میں نے بی بی سی سے یہ خبرسنی ہے۔''میں صادقین کے انتقال کی تفصیلات کے بارے میں مزید کچھ پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ مائیکروفون پر میرا نام پکارا گیا اور میں بزرگ شاعر کو ان کی پچھترویں سال گرہ کی مبارکباد دینے ڈائس پر چلا گیا۔انھیں مبارک باد دینے کے بعد نیچے آیا تو صادقین کے انتقال کا پُرسہ دینے کا خیال آیا۔سوچا کسے پُرسہ دوں۔صادقین ان لوگوں میں سے نہیں تھے جن کے انتقال کا پُرسہ آپ اُن کے پسماندگان اورآل اولاد کو دے کر مطمئن ہو جائیں اورسوچیں کہ چلو ایک سماجی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوگئے۔وہ مجرد اور اکیلے تھے پھر بھی سب کے تھے۔وہ سب کے تھے مگر پھر بھی اکیلے تھے۔سوچا ان صاحب کو ہی پُرسہ دے دوں، جنھوں نے صادقین کے انتقال کی خبر سنائی تھی۔مگر وہ محفل سے جاچکے تھے۔میں سوچنے لگا زندگی کا حساب کتاب بھی کتنا عجیب ہے۔ایک بزرگ دوست پچھتر برس کے ہوگئے اور ایک دوست نے 57 برس میں ہی دنیا چھوڑ دی۔کون جانے کس کے حصہ میں عمر کی نقدی کتنی آئی ہے۔

میں چُپ چاپ محفل سے چلا آیا۔صادقین کی باتیں یاد آنے لگیں تو یاد آتی ہی چلی گئیں۔صادقین سے میری دوستی پرانی نہیں تھی۔1948ء میں ترکِ وطن کرنے کے 33 برس بعد وہ پانچ سال پہلے ہندوستان آئے تھے۔میں ان کے نام سے بہت کچھ اوراُن کے کام سے کچھ کچھ واقف تھا۔ایک دن پتہ چلا کہ دہلی کی غالبؔ اکیڈمی میں صادقین کی خطاطی کے نمونوں اورغالبؔ سے متعلق ان کی تصویروں کی نمائش مقرر ہے۔میں صادقین کو نہیں بلکہ ان کی تصویروں کو دیکھنے کے ارادہ سے وہاں پہنچا تو وہاں صادقین کے بھی دیدار ہوگئے۔نمائش کے افتتاح کے بعد وہ ایک گوشہ میں ایم۔ایف۔حسین کے ساتھ کھڑے تھے۔ایم۔ایف۔حسینؔ نے صادقینؔ سے میرا تعارف کرایا تو بولے:''آپ کے بارے میں بھائی ذہینؔ نقوی سے بہت کچھ سن رکھا ہے۔میں ہندوستان میں کئی دن رہوں گا۔آپ سے جلدی ہی ملاقات ہونی چاہیے۔''

میں نے پوچھا''ملاقات کب اورکہاں ہوگی؟''

فوراً بولے''کل شام غالبؔ کے مزار پر ٹھیک چھ بجے، میں آپ کا انتظار کروں گا۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے مدّاحوں میں گھر گئے۔میں شش وپنج میں پڑ گیا۔بھلا مزار غالبؔ بھی کوئی ملاقات کی جگہ ہے۔میں ملاقات کے مقام کی دوبارہ توثیق کرنا چاہتا تھا لیکن بعد میں وہ خواتین کو آٹوگراف دینے میں اتنے مصروف ہوگئے کہ اس حسین مصروفیت میں دخل انداز ہونے کی ہمت نہیں پڑی۔میں نے سوچا۔''مانا کہ صادقینؔ غالبؔ کے طرف دار ہیں،سخن فہم بھی شاید ہوں گے۔اپنے نام کے ساتھ بندۂ غالبؔ لکھتے ہیں،لیکن طرف داری کا مطلب یہ تو نہیں کہ غالبؔ کے مزار کو دیوان خانہ میں تبدیل کردیں۔تاہم وقتِ ملاقات تو طے ہوچکا تھا۔سوچا پہلے مزار غالبؔ کے اُوپر انھیں دیکھ لیں گے۔یہاں نہ ملیں تو مزار کے اندر انھیں ڈھونڈ لیں گے۔یہاں بھی نہ ملیں تو غالبؔ اورصادقینؔ دونوں پر فاتحہ پڑھ لیں گے۔دوسرے دن میں ٹھیک چھ بجے پہنچا تو صادقینؔ سچ مُچ غالبؔ کے مزار پر موجود تھے اور ان کی انگشتِ شہادت خلا میں کچھ تحریر کرنے میں مصروف تھی۔مجھے دیکھتے ہی خلا کو پینٹ کرنے کا سلسلہ روکا اور بولے:''میں آپ ہی کا انتظار کررہا تھا۔''

میں نے کہا''صادقینؔ صاحب! یہ غالبؔ کے مزار کو مقام ملاقات بنانے کی بھی خوب رہی۔''

ہنس کر بولے''اصل میں آج غالبؔ سے میرا وقت طے تھا۔اس میں آپ کو بھی شامل کرلیا۔''

میں نے کہا''غالبؔ سے اگر ملاقات ہوچکی ہو تو اب یہاں سے چلیئے کہیں اور بیٹھتے ہیں۔کیوں نہ ہم کناٹ پلیس چلیں اور وہاں کسی بڑھیا ریستوران میں بیٹھیں۔''

بولے''نہیں! یہیں نظام الدینؒ کے ایک ریستوراں میں بیٹھتے ہیں،اور مونگ پھلی کھاتے ہیں۔ریستوراں چاہے جیسا بھی ہو،اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے مالک امروہہ کے ایک صاحب ہیں۔اوریوں غالبؔ کے بعد انھوں نے اپنی دوسری کمزوری یعنی امروہہ کا ذکر مجھ سے کردیا —33 برس بعد وہ ہندوستان آئے تھے۔ان برسوں میں دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ایسا بچ رہا ہو، جہاں وہ نہ گئے ہوں۔لیکن ہر جگہ اپنے امروہہ کو اپنے ساتھ لے گئے۔میں نے ان کی کتاب''رقعات صادقینی''پڑھی ہے،جس میں وہ اپنے بھائی کے نام لندن، پیرس، واشنگٹن، نیویارک، ماسکو اور نہ جانے کن کن شہروں سے خط لکھتے ہیں تو ان بڑے شہروں کے بیچ اپنے امروہہ کو پھیلا دیتے ہیں۔ان 33 برسوں میں امروہہ جتنا ان کے اندر آباد رہ کر پھلتا پھولتا رہا ہے اتنا شاید وہ ہندوستان میں بھی نہیں پھولا پھلا۔کلکتہ کے ذکر سے غالبؔ کے سینہ کا جو حال ہوتا تھا وہی حال امروہہ کے ذکر سے صادقینؔ کے سینے کا ہوتا تھا۔امروہہ میں اپنی نوجوانی کے دنوں کو یاد کرکے کہنے لگے:''طالب علمی کے زمانے سے ہی مجھے

مصوری اور خطاطی سے دلچسپی رہی ہے۔ میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ ان دنوں اسکول سے چھٹی لینے کے لیے درخواست پر طالب علم کے سرپرست کے دستخط تصدیق کے طور پر ضروری سمجھے جاتے تھے۔ ایک دن میں یونہی اسکول سے غائب ہو گیا۔ گھر میں کسی کو نہیں بتایا۔ دوسرے دن میں نے چھٹی کی درخواست پر اپنے والد صاحب کے جعلی دستخط کیے اور درخواست اسکول ماسٹر کے حوالے کی تو اُستاد نے میری پٹائی شروع کر دی۔''

اُستاد نے کہا ''تم نے اپنے والد کے جو دستخط کیے ہیں وہ اتنے خوش خط ہیں کہ یہ تمھارے والد کے دستخط نہیں ہو سکتے۔ خوش خطی میں یہ جعل سازی تمھارے سوائے کوئی اور نہیں کر سکتا۔''

صادقین اس واقعے کو سنا کر ہنسنے لگے۔ پھر بولے: ''میری خوش خطی کی پہلی سزا مجھے امروہہ میں ہی ملی تھی۔ بعد میں تو کئی جگہ ملتی رہی۔ البتہ زندگی میں پہلی اور آخری جعل سازی یہیں کی تھی۔ (صادقین جب 1948ء میں امروہہ سے گئے تھے تو وہ امروہہ کے اسکول میں آرٹ ٹیچر تھے:)

صادقین سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ میں جانے لگا تو بولے ''بھائی! آپ سے روز ملاقات ہونی چاہیے۔ غالب کے مزار یا غالب اکیڈمی میں، میں کچھ دن اور دہلی میں رہوں گا۔''

مجھے پتہ نہیں تھا کہ صادقین اور کتنے دنوں تک دہلی میں رہیں گے۔ مگر میں نے ان کے بارے میں سن رکھا تھا کہ حضرت داغؔ کی طرح یہ جہاں بیٹھ جاتے ہیں وہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ پاکستان وہ گئے تو تھے اپنے بڑے بھائی سے ملنے مگر جب گئے تو وہیں کے ہو رہے۔ فرانس کی وزارت ثقافت نے انھیں پانچ مہینوں کی دعوت پر پیرس بلایا تو سات برسوں تک پیرس کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا۔ یورپ کے سارے ملکوں کی سیر کی اور اپنی تصویروں کی نمائشیں کیں۔ پیرس جیسے آرٹ کے بین الاقوامی مرکز میں اپنے آپ کو منوانے اور خوشحالی اور مادی آسائشوں کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد ایک دن اچانک اپنے والد کے ساتھ مختصر سے عرصے کے لیے پاکستان میں قیام کے ارادہ سے کراچی واپس آئے تو پھر پاکستان ہی کے ہو رہے۔ ایک بار کراچی سے لاہور اس ارادہ کے ساتھ گئے کہ پندرہ دن لاہور میں قیام کریں گے۔ مگر لاہور میں دس برس کے لیے ٹک گئے۔ ان کی خانہ بدوشی کے بیسیوں قصے سن رکھے تھے اور یہ بھی سنا تھا کہ وہ ہر ملک کو اپنا ملک سمجھتے ہیں۔ ملکوں اور شہروں کے تعلق سے ایک رباعی میں انھوں نے اپنے رویہ کا اظہار یوں کیا تھا:

البرز نہ الوند کا باشندہ ہوں
دلّی نہ سمرقند کا باشندہ ہوں
ساری دنیا مرا وطن ہے یعنی!
میں ارضِ خداوند کا باشندہ ہوں

صادقین سے پہلی ملاقات کے بعد میں نے ذہین نقوی سے کہہ دیا تھا کہ صادقین اتنی آسانی سے ہندوستان سے واپس نہیں جائیں گے۔ چنانچہ میری پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی اور ایک دن پتہ چلا کہ صادقین نے ایک مکان جنگ پورہ میں کرایہ پر لے لیا ہے۔ جب صادقین دو چٹائیاں، ایک عدد چارپائی، دو عدد بالٹیاں (ایک بالٹی نہانے کے لیے اور ایک بالٹی کوڑا ڈالنے کے لیے) اور کچھ برتن خرید کر جنگ پورہ میں ''ٹھاٹ باٹ'' کی زندگی گزارنے لگے تو یوں لگا، جیسے وہ دہلی کے معمولات کا حصہ بن گئے ہیں۔ معاف کیجیے میں بھول گیا صادقین نے ایک لوٹا بھی خریدا تھا۔ ساز و سامان جب اتنا کم ہو تو اس میں سے کسی شے کو بھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مجھے یہ اعتراف بھی کر لینے دیجیے کہ اگر صادقین دہلی نہ آتے تو میں جنگ پورہ سے اور جنگ پورہ مجھ سے اتنا واقف نہ ہوتا۔ یہ ان ہی کی ذات بابر کت کا فیض تھا کہ اس محلّہ میں میری آمد و رفت اتنی بڑھ گئی تھی کہ جنگ پورہ کے دو چار پنواڑی پورے اعتماد کے ساتھ وقت ضرورت مجھے سگریٹ بھی اُدھار دے دیتے تھے اور مجھ پر شک نہیں کرتے تھے۔ یہ بھی صادقین کا ہی فیض تھا کہ برسوں بعد مجھے چٹائی پر متواتر بیٹھنے کا موقع ملا ورنہ چٹائی پر بیٹھنے کی پریکٹس کب کی چھوٹ چکی تھی۔ میں تو خیر کس شمار میں ہوں۔ میں نے بڑی بڑی نامور ہستیوں کو جو بڑی بڑی کُرسیوں پر براجمان ہیں اور جو شاید نیند میں بھی کُرسیوں سے نہیں اُترتیں، صادقین کے آگے چٹائی پر زانوئے ادب تہہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ یوں بھی کُرسی پر زانوئے ادب آسانی سے تہہ نہیں ہوتا۔ چٹائی کے استعمال کو دہلی میں دوبارہ رائج کرنے میں صادقین کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اگر وہ کچھ دن اور رہ جاتے تو فرنیچر بنانے والوں کا کاروبار ٹھپ ہو جاتا۔ صادقین کے جنگ پورہ والے گھر ''جی۔19'' کو میں صادقین کا گھر نہیں صادقین کا تکیہ کہا کرتا تھا۔ اس گھر میں صادقین کے سوائے کوئی اور قیمتی چیز نہیں تھی۔ بھلا چٹائیاں اور بالٹیاں بھی کہیں قیمتی ہوتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ صادقین کے بیٹھنے کی وجہ سے چٹائیوں کی قدر و قیمت بڑھ گئی تھی۔

اس گھر کا نقشہ یاد کرتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ صادقین نے اتنے کم ساز و سامان کے ساتھ آخر ایک سال سے زیادہ کی مدت اس گھر میں کیسے گزار لی — صادقین کے قیام دہلی کا زیادہ حصہ اسی گھر میں گزرا۔ وہ گھر سے باہر کم ہی نکلتے تھے۔ بہت نکلے تو مُلّا کی دوڑ کی طرح غالب اکیڈمی یا مزار غالب تک گئے۔ وہ گھنٹوں گھر کی چہار دیواری میں بند اپنے کام میں منہمک رہتے تھے۔ اس گھر کے در و دیوار کا بھی کچھ حال بیان ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ جب یہ پہلے پہل اس گھر میں آئے تھے تو در و دیوار سچ مچ در و دیوار لگتے تھے۔ بعد میں یہ در و دیوار صفحۂ قرطاس میں تبدیل ہوتے چلے گئے۔ اس کی دیواروں پر ابتداء میں کچھ ضروری دوستوں کے غیر ضروری پتے لکھے گئے۔ پھر ٹیلی فون نمبروں کی خطاطی کی باری آئی۔ یہ بھی بتاتا چلوں کہ بعض ایسے ناپسندیدہ عناصر، جن سے میں اپنا ٹیلی فون نمبر پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا، انھیں میرا نمبر صادقین کے گھر

کی دیوار ہی سے ملا یہ اور بات ہے کہ بعض پسندیدہ عناصر کے پتے، جن کی مجھے عرصہ سے تلاش تھی، صادقین کے گھر کی دیوار ہی سے ملے۔ غیر ضروری پتوں اور ضروری ٹیلی فون نمبروں کی خطاطی سے فرصت ملی تو کبھی کبھی یوں بھی ہوا کہ صادقین کام میں مصروف ہیں اور کسی دوست نے کسی خاص تاریخ کو اپنے یہاں بلایا تو صادقین نے وہیں برش لے کر دیوار پر بطور یاد داشت لکھ لیا کہ فلاں صاحب کے پاس جانا ہے۔ پھر یادداشتوں سے متعلق تحریروں کے بعد کتابوں کے سراوراق کی باری آئی۔ اکثر ادیب وشاعر اپنی کتابوں کے نام اپنے ناموں یا تخلّصوں سمیت اور کتابوں کے نفسِ مضمون کا خلاصہ لکھ جاتے تھے تاکہ بعد میں صادقین اس نوشتۂ دیوار کی مدد سے ان کا سرورق بنا سکیں۔ ایک صاحب نے تو اپنی کتاب کا قدآدم سرورق بقلم خود سالم دیوار پر بنا دیا تھا۔

سرورق پر یاد آیا کہ صادقین نے ہندوستان میں اتنی کتابوں کے سرورق بنائے کہ اگلے دس پندرہ برس تک یہ سرورق وقفہ وقفہ سے چھپتے رہیں گے۔ دس پندرہ برس کی بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ایک دن ایک صاحب بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ اپنے مجموعۂ کلام کا سرورق صادقین سے بنوار ہے تھے۔ صادقین کسی کام سے اندر گئے تو میں نے ان شاعر صاحب سے پوچھا۔ "آپ بڑی عجلت میں صادقین سے اپنے مجموعہ کلام کا سرورق بنوا رہے ہیں۔ مجموعہ کلام کب تک چھپوائیں گے؟"

بولے "صاحب! فی الحال تو میرے پاس ایک تخلّص ہے اور اس مجموعۂ کلام کا نام ہے۔ شاعری تو سرورق بننے کے بعد شروع کروں گا۔ صاؔدقین اب ہندوستان سے جائیں گے تو نہ جانے کب آئیں گے۔ اس لیے حفظ ماتقدم کے طور پر اپنے مجموعۂ کلام کا جس میں اس وقت تک نہ کلام ہے نہ مجموعہ، سرورق بنوا رہا ہوں۔ کل کلاں کو واقعی شعر کہنے لگ جاؤں تو صاؔدقین صاحب کو کہاں ڈھونڈتا پھروں گا۔ یوں بھی اچھا شعر اور بُرا وقت پوچھ کر نہیں آتے۔

ہاں تو میں صادقین کے گھر کے در و دیوار کا ذکر کر رہا تھا اور بات سرورق تک پہنچ گئی۔

جو کُوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

صاؔدقین کے اسسٹنٹ میاں انوؔر نے جب دیکھا کہ گھر کے ہر کمرے کی دیوار پر صاؔدقین کے بنائے ہوئے نقش ابھرتے جا رہے ہیں تو انھوں نے بھی حسب استطاعت باورچی خانہ کی دیواروں پر طبع آزمائی شروع کر دی۔ سارے گھر میں یہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں صادقین کا گزر نہیں ہوتا تھا۔ مگر آفریں ہے میاں انور پر کہ انھوں نے باورچی خانہ کی مناسبت سے اس کی دیواروں پر ایسی "لذیذ" اور "چٹپٹی" دوشیزاؤں کی تصویریں بنا دی تھیں اور ان ہی کی مناسبت سے ایسی رباعیاں لکھ دی تھیں کہ انھیں دیکھ کر ہر قسم کی بھوک میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ غرض صادقین کے گھر کے در و دیوار ان کے لیے ٹیلی فون ڈائرکٹری بھی تھے اور کلنڈر بھی۔ میں جب بھی ان کے یہاں جاتا تو ان دیواروں کا مطالعہ ضرور کرتا تھا۔ خاصی دلچسپ دیواریں تھیں۔

ہندوستان میں چودہ مہینوں کے قیام میں صادقین کو میں نے جب بھی دیکھا کام میں جُٹا ہوا دیکھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے انھیں ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کے لیے آیات قرآنی کی خطاطی کرتے دیکھا ہے۔ جنگ پورہ میں انھوں نے آرٹ کی گنگا بہادی تھی۔ ہر کوئی آتا اور اس میں ڈُبکی لگا کر چلا جاتا تھا۔ صادقین کو میں نے اتنی بار اور اتنے لمبے عرصے تک خطاطی کرتے دیکھا ہے کہ اب خود میرا ہینڈ رائٹنگ بھی بدل گیا ہے۔ صادقین کی خطاطی کا میرے ہینڈ رائٹنگ پر اثر انداز ہونا ضروری بھی تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ صاؔدقین سے ملنے سے پہلے لوگ میرا ہینڈ رائٹنگ پڑھ پاتے تھے اور اب بالکل نہیں پڑھ سکتے۔ آرٹ اسی کو تو کہتے ہیں۔

آرٹ کی دنیا میں گُم ہونے کی فرضی باتیں تو میں نے بہت سن رکھی تھیں، مگر کسی کو سچ مچ آرٹ کی دنیا میں گم ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ صادقین کو دیکھ کر یہ حسرت بھی پوری ہوگئی۔ دہلی میں وہ دو مہینوں تک نمائشوں میں مصروف رہے۔ وہاں سے فارغ ہوئے تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ جغرافیہ میں ایک میورل بنانے میں مصروف ہوگئے۔ وہاں سے فرصت ملی تو جناب عابد علی خاں ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" کی دعوت پر حیدرآباد چلے گئے۔ ان کے قیام حیدرآباد کے دنوں میں، میں بھی حیدرآباد میں تھا۔ حیدرآباد میں اُنھوں نے وہ مچایا جسے تہلکہ کہتے ہیں۔ وہاں کے "اُردو گھر" کے لیے جب یہ میورل بنا رہے تھے تو سینکڑوں افراد انھیں کام کرتے ہوئے دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ بعد میں اُردو گھر میں جب ان کی خطاطی کی نمائش ہوئی تو اس کا حال بیان کرنے کی نہ مجھ میں تاب ہے نہ مجال۔ بلا مبالغہ روزانہ دس ہزار سے زائد افراد اس نمائش کو دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ میلے کا سا سماں تھا۔ چائے کی عارضی دکانیں کھل گئی تھیں۔ عارضی سائیکل اسٹینڈ چالو ہو گئے تھے۔ آئس کریم والوں اور میوہ فروشوں کے ٹھیلے آ گئے تھے۔ جیب کترے بھلا اس موقع پر کیوں چُپ رہتے۔ انھوں نے بھی اپنا کاروبار چمکایا۔

صاؔدقین سے آٹوگراف مانگنے والوں کا اتنا ہجوم رہتا تھا کہ صاؔدقین کو ایک بند کمرے میں بٹھایا جاتا تھا اور لوگ قطار باندھ کر کھڑکی میں سے صادقین سے فرمائش کر کے اپنی پسندیدہ آیات لکھوایا کرتے تھے۔ خوب یاد آیا کہ نمائش کے پہلے دن ایک عورت صاؔدقین سے کوئی آیت لکھوا کر لے گئی۔ دوسرے دن وہ سویرے ہی پھر نمائش میں آئی اور لوگوں کے سامنے اعلان کیا کہ اس کا بھائی عرصہ سے بیمار تھا، مگر کل جب اس نے صاؔدقین کے ہاتھ سے لکھی ہوئی آیت بیمار کے تکیے کے نیچے رکھی تو شام تک صحت یاب ہو گیا۔ اس اعلان کے بعد جو ہونا تھا، اس کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں۔ اب صاؔدقین کہیں کے نہ رہ گئے تھے بلکہ پیرو مرشد بن گئے تھے۔ عورتیں اپنے بچوں کے سروں پر ان کا ہاتھ رکھواتیں اور لوگ عقیدت سے ان کے ہاتھ نہ صرف چومتے تھے بلکہ آنکھوں سے بھی لگاتے تھے۔

غرض حیدرآباد میں ایک مہینہ کے قیام کے دوران صادقین نے حیدرآبادیوں کے دل جیت لیے۔ حیدرآباد میں اتنے لمبے قیام کے باوجود انھوں نے حیدرآباد کے ایسے کئی تاریخی مقامات نہیں دیکھے جنھیں دیکھنے کے لیے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ لوگ خود صادقین کو دیکھنے کے لیے دور دور سے آنے لگے تھے۔ وہ سارا دن نظام کلب کے کمرے میں بند ہو کر لوگوں کی فرمائشیں پوری کیا کرتے تھے۔ حیدرآباد میں ہی انھوں نے نیشنل جیوفزیکل ریسرچ لیبارٹری کے لیے ایک عالی شان میورل تیار کیا۔

حیدرآباد سے واپس آئے تو بنارس ہندو یونیورسٹی میں میورل بنانے چلے گئے۔ بنارس سے واپس آ کر اطمینان کی دو چار سانسیں بھی نہیں لی تھی کہ دہلی کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے لیے ''اسمائے حسنیٰ'' کی خطاطی میں مصروف ہو گئے — صادقین کا یہ ایک عظیم الشان کارنامہ ہے جس میں انھوں نے دو مہینوں کی شبانہ روز محنت کے بعد ایک سو سات کینوس تیار کیے۔ اس کام کو دیکھ کر انسان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ میں نے مذاق مذاق میں یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ ہمدرد والوں کو اب ایسی دوا بھی تیار کرنا پڑے گی کہ اس کام کو دیکھ کر جب انسان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں تو انھیں دوا کی مدد سے بند کیا جا سکے۔ جب یہ کام چل رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ صادقین کئی کئی دن گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ انھیں داڑھی بنانے کا بھی ہوش نہیں رہتا تھا۔ لوگوں کی آمد و رفت سے بے نیاز وہ اپنے کام میں کھوئے رہتے تھے۔ جب تک دن میں دو کینوس نہیں بنا لیتے تھے کھانا نہیں کھاتے تھے۔ چاہے رات کا پچھلا پہر ہی کیوں نہ ہو جائے۔ یوں بھی میں نے صادقین کو کھانا کھاتے ہوئے بہت کم دیکھا۔

چودہ مہینوں میں بہ مشکل تمام دس بارہ ایسے مبارک و مسعود موقعے آئے جب میں نے انھیں کھانا کھاتے ہوئے دیکھا۔

صادقین نے ہندوستان میں جہاں کہیں اور جو کچھ بھی کام کیا وہ فی سبیل اللہ کیا۔ کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ صادقین نے کسی کام کا کوئی معاوضہ لیا ہو۔ صادقین نے ہمیں جو کچھ دیا وہ ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ مگر انھوں نے ہمیں یہ سب کچھ کیوں دیا اس کا جواب نہ صادقین کے پاس تھا اور نہ ہمارے پاس ہے۔ دین آرٹسٹ کی عادت ہوتی ہے اور لین مداحوں کی مجبوری۔ صادقین کے گھر سے میں نے کسی کو خالی ہاتھ جاتے نہیں دیکھا۔ جب بھی وہ صادقین سے مل کر واپس جاتا تو اس کے ہاتھ میں یا تو صادقین کے مصافحے کی گرمی ہوتی یا صادقین کے آرٹ کا کوئی نمونہ، دل میں صادقین کی دی ہوئی محبت کا گداز ہوتا، آنکھوں میں صادقین کے فن پاروں کی چمک ہوتی یا کانوں میں صادقین کی رباعیوں کی گونج ہوتی۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ سکندر اگر صادقین کے گھر سے جاتا تو دنیا سے یوں خالی ہاتھ نہ جاتا جس کے ذکر سے تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ صادقین اگرچہ دہلی میں اتنے طویل عرصہ تک رہے لیکن تب بھی یوں رہے جیسے

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں

اگرچہ وہ دہلی کے معمولات کا حصہ بن گئے تھے، لیکن دہلی ان کے معمولات کا حصہ نہیں بن سکی۔ جو شخص اپنے گھر میں بند اور اپنے آرٹ میں گم رہتا ہو اسے شہر سے کیا مطلب۔

صادقین ان چند گنے چُنے فن کاروں میں تھے جنھیں نہایت کم عمر میں آرٹ کے میدان میں بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ پاکستان میں انھیں تمغۂ امتیاز اور نہ جانے کیا کیا مل چکا تھا۔ آج سے 25 برس پہلے پیرس کی بی نائیل نمائش کا بین الاقوامی اعزاز انھیں حاصل ہو چکا تھا۔ دنیا کی بڑی بڑی آرٹ گیلریوں میں ان کے آرٹ کے شاہکار موجود ہیں۔ لیکن ایک بات میں نے محسوس کی کہ زندگی جوں جوں ان کے سر پر عظمتوں کے تاج رکھتی جاتی تھی، ان کا سرِ فخر سے اونچا ہونے کے بجائے جھکتا چلا جاتا تھا۔ صادقین کے لیے عظمتیں ایک بوجھ کا درجہ رکھتی تھیں۔ جوں جوں یہ بوجھ بڑھتا جاتا تھا، وہ کچھ اور بھی منکسر المزاج دکھائی دیتے تھے۔ وہ اپنے نام کے ساتھ حقیر، فقیر، پُرتقصیر، خاطی اور عاصی نہ جانے کیا کیا لکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے لیے کچھ مخصوص القاب بھی تجویز کر رکھے تھے جیسے المجہول، الجاہل، المہمل، الخبیث، المریض، المحتاج، المحکوم، الخاطی، المردود، المکروہ، المقروض، المحدود، المطعون، المجبور، المفلس وغیرہ وغیرہ۔

لیکن عجز و انکسار کے اس پُتلے میں جب فنکار کی انا جاگتی تھی، تو یہ فنکار نہ تو مولویوں کا لحاظ کرتا تھا، اور نہ ہی سرمایہ داروں اور صاحب اقتدار لوگوں کو خاطر میں لاتا تھا۔ جب ملاؤں نے اُن کی تصویروں کے خلاف فتوے جاری کیے اور جلوس نکالے تو انھوں نے اپنی نمائش کی مدت کچھ اور بڑھا دی اور منافقت کے خلاف سینہ تان کر کھڑے ہو گئے۔ صادقین غالباً برصغیر کے واحد مصوّر تھے جن کی تصویروں کی نمائش پر بم پھینکے گئے۔ شاید ہی کسی مصوّر کو یہ اعزاز حاصل ہوا ہو۔ اپنی ایک رباعی میں ملاؤں کے خلاف کہتے ہیں۔

جو آج منڈاسے ہیں، لنگوٹے ہوں گے
ہم ہوں گے کھرے اور یہ کھوٹے ہونگے
ہم مینا بکف رند اُٹھیں گے سر حشر!
واعظ جو ہیں، تھامے ہوئے لوٹے ہونگے

صادقین کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ دوسروں کا حد درجہ احترام کرتے تھے۔ ایک دن مجھ سے کہا ''میں خوشونت سنگھ سے ملنا چاہتا ہوں۔''

میں نے خوشونت سنگھ سے صادقین کی خواہش کا ذکر کیا تو بولے:

''میں خود اُن سے ملنے کے لیے بے چین ہوں۔ کل شام انھیں گھر لے آؤ۔''

دوسرے دن، ہم خوشونت سنگھ کے گھر پہنچے تو صادقین بار بار خوشونت سنگھ سے کہتے جاتے تھے۔ ''میں تو مجتبیٰ حسین کا شکر گزار ہوں کہ آپ سے ملاقات کرائی۔'' خوشونت سنگھ بولے: ''نہیں! شکریہ تو مجھے مجتبیٰ کا ادا کرنا چاہیے

کہ آپ کو میرے گھر لے آئے ۔ میں تو کئی دن اپنے احباب میں فخر سے کہتا پھروں گا کہ صادقین میرے گھر آئے تھے۔''

اِدھر صادقین مصر تھے کہ وہ میرا شکریہ ادا کریں گے اور اُدھر خوشونت سنگھ بضد کہ وہ میرا شکریہ ادا کریں گے...... وہ تو اچھا ہوا کہ سیتندر سنگھ مجھے وہاں سے اٹھا کر ایک گوشے میں لے گئے اور بولے ''اب تم میرا شکریہ ادا کرو کہ میں نے دونوں کو تمھارا شکرگزار ہونے نہیں دیا ورنہ آج تم بچ نہیں سکتے تھے۔''

صادقین کی حس مزاح بہت تیز تھی۔ مزے دار فقروں اور دلچسپ لطیفوں پر اُن کی بیساختہ ہنسی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ بار بار فقرے یا لطیفے کا اعادہ کرتے چلے جاتے تھے اور ہنستے جاتے تھے۔ لطیفہ کی جگالی کرتے میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ مذاق خود ان کے بارے میں ہوتا تو اور بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔ ایک رات اُن کے مکان پر خوش باشوں کی محفل گرم تھی۔ امیر قزلباش نہ بھی موجود تھے۔ میں نے باتوں باتوں میں پوچھا۔ ''صادقین صاحب! آپ کا نام جمع کے صیغہ میں کیوں رکھا گیا ہے۔ صرف صادق کافی تھا۔ صادقین کی کیا ضرورت تھی۔''

بولے ''صادقین میرے والدین کی دین ہے ۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔'' اسی اثنا میں اچانک بجلی فیل ہوگئی تو میں نے امیر آغا سے کہا۔ ''میاں امیرین! جلاؤ اسی بات پر ماچسین اور کرو روشن لالٹینین، اٹھاؤ اپنے نعلین اور دباؤ انھیں دربغلین ـــ اور آؤ میاں انورین، چلیں ہم سب ہوٹلین اور کھانا کھائیں ساتھ میں صادقین۔''

ایک ہی سانس میں جب میں نے یہ جملہ مکمل کیا تو صادقین کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہوگیا۔ بار بار کہتے تھے۔ ''بھائی! پھر سے کہو۔ خوب کہا۔ ماچسین، نعلین، دربغلین، انورین، صادقین، بھئی واہ والدین! کیا نام رکھا تم نے۔''

ہندوستان میں چودہ مہینوں کے قیام کے دوران میں صادقین سے میری سینکڑوں ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ ایک دن بھی ان سے ملاقات نہ ہوتی تو انور سے فون کرواتے تھے۔ میں نے انھیں عالم سرخوشی میں بھی دیکھا اور عالم ہوش میں بھی اور ہر دم انھیں ایک دُرویش اور قلندر کے روپ میں پایا۔ مال ومتاع اور جاہ وحشمت سے بے نیاز اپنے فن کی دنیا میں گُم، اپنے بل بوتے میں مگن ـــ دونوں ہاتھوں سے اپنے فن کی دولت لٹاتے ہوئے رنگ ونور کا جادو جگاتے ہوئے صادقین کبھی کبھی عجیب سے لگتے تھے۔ وہ گھنٹوں زماں ومکاں سے بے نیاز ہوکر رنگوں اور خطوں میں کھوئے رہتے تھے۔ صادقین کے سیدھے ہاتھ کی انگلیاں لگاتار کام کرنے کی وجہ سے ٹیڑھی ہوگئی تھیں۔

ایک دن میں نے کہا: ''آپ کچھ دن اپنی انگلیوں کو آرام کیوں نہیں دیتے؟''

بولے: ''مائیکل اینجیلو کی گردن محض اس لیے ٹیڑھی ہوگئی تھی کہ وہ شبانہ روز یورپ کے گرجا گھروں کو پینٹ کرتا تھا۔ میری تو صرف انگلیاں متاثر ہوئی ہیں۔ گردن تو ٹیڑھی نہیں ہوئی۔''

ان کی انگلیاں ہر وقت کام میں لگی رہتی تھیں۔ احباب کی محفل جمی ہو اور کسی کے منہ سے کوئی نام نکلے یا جملہ ادا ہو تو صادقین کی انگلیاں فوراً خلا میں اس نام یا جملے کی خطاطی کرنا شروع کردیتی تھیں۔ یہ ان کی عجیب وغریب عادت تھی۔

انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کا کام ختم کر لینے کے بعد وہ کافی مطمئن نظر آنے لگے تھے۔ ایک شام میں حسب معمول ان کے یہاں پہنچا تو دیکھا کہ بالکل فرصت اور فراغت میں بیٹھے ہیں۔ صادقین کو اس طرح بے کاری کی حالت میں دیکھنے کی عادت نہیں تھی۔ میں نے سوچا ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔ مجھے دیکھ کر بولے: ''بھائی! بہت اچھے وقت آئے۔ میں آپ ہی کا انتظار کررہا تھا۔'' پھر میاں انور کو بلا کر کہا: ''بھئی ایک ٹیکسی لے آنا۔''

ٹیکسی آگئی تو میں نے پوچھا: ''کہاں کا قصد ہے؟'' بولے ''میں نے کہیں جانے کے لیے ٹیکسی نہیں منگوائی۔ یوں سمجھئے کہ ٹیکسی میں بیٹھنے کے لیے ٹیکسی منگوائی ہے۔ کیا ضروری ہے کہ ہم منزل کا تعین کرکے ہی ٹیکسی میں بیٹھیں۔ بس چلیے، یوں ہی ذرا ہوا کھاتے ہیں۔ دہلی میں رہتے ہوئے اتنے دن ہوگئے مگر دہلی کو اُس طرح نہیں دیکھا جس طرح اور لوگ دیکھتے ہیں۔ کناٹ پلیس کو بھی اس وقت دیکھا ہے جب مجھے حیدرآباد، علی گڑھ، امروہہ یا بنارس جانے کے لیے نئی دہلی ریلوے اسٹیشن جانا پڑا ہے۔'' ٹیکسی والے سے کہا۔ ''میاں تم ہمیں جہاں لے جانا چاہو لے چلو ہماری نکیل تمہارے ہاتھ میں ہے۔ ہماری کوئی منزل نہیں ہے۔'' ہم بڑی دیر تک 'ادب برائے ادب' یا 'فن برائے فن' کے انداز میں سیر کرتے رہے۔ جب ٹیکسی گھوم گھام کر صفدر جنگ کے مقبرے کے پاس پہنچی تو میں نے کہا۔ ''صادقین صاحب! ہم نے ''سفر برائے سفر'' بہت کرلیا ہے۔ اب بتائیے کہاں چلیں گے؟''

کچھ دیر سوچ کر بولے: ''میرا خیال ہے اب مجھے پاکستان جانا چاہیے۔'' دوسرے دن میں ان کے ہاں گیا تو دیکھا کہ بنجارے نے اپنا ساز وسامان سمیٹنا شروع کردیا ہے اور آٹھ دن بعد وہ پاکستان کے لیے روانہ ہوگئے۔

دہلی میں ان کی آخری شام مجھے اب تک یاد ہے۔ بولے: ''بھئی یہ 14 مہینے آپ کی رفاقت میں خوب گزرے ۔ یہ شب وروز ہمیشہ یاد رہیں گے۔ اب آپ پاکستان آئیے۔ آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ ساری دنیا گھوم لی لیکن پاکستان نہیں آئے۔ حیرت ہے کہ اپنے بڑے بھائی ابراہیم جلیس کے انتقال پر بھی نہیں آئے۔ اس بار کم از کم میری خاطر ہی پاکستان آیئے۔''

میں نے کہا: ''پاکستان اتنا قریب ہے کہ سفر کی خواہش ہی نہیں ہوتی۔ مجھے تو لمبی اڑانیں بھرنے کا شوق ہے۔ اگر آپ کا پاکستان یورپ میں ہوتا تو نہ جانے کتنی بار آتا۔''

بولے ''اب مذاق نہ کیجیے۔ آنے کا وعدہ کیجیے ورنہ مجھے پھر ہندوستان آنا پڑے گا۔''

میں نے کہا ''یہی تو میں چاہتا ہوں۔''

آخری شام وہ کچھ جذباتی سے ہوگئے تھے۔ہمیں ایک دوست کے ہاں رات کے کھانے پر جانا تھا۔ ہندوستان میں اتنے طویل قیام کے دوران میں نے صادقین کو کبھی بہکتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔مگر اُس شام وہ بہکے تو بہکتے ہی چلے گئے۔

رات کے پچھلے پہر میں انھیں گھر چھوڑ آیا۔ دوسرے دن دوپہر میں ان کی روانگی تھی۔حسب وعدہ میں انھیں وداع کرنے کے لیے ہوائی اڈہ پر پہنچ گیا تھا۔ان کا ساز وسامان طیارے میں جا چکا تھا۔میاں انور اور دیگر احباب بھی پہنچ چکے تھے۔مگر صادقین کا دور دور تک کوئی پتہ نہ تھا۔ مائیکروفون پر بار بار اعلان ہو رہا تھا کہ کراچی جانے والا طیارہ پرواز کے لیے تیار ہے۔مسافرین سے آخری بار درخواست کی جاتی ہے کہ وہ طیارے میں سوار ہو جائیں۔اچانک صادقین ایک موٹر سے برآمد ہوئے۔ یوں لگا جیسے وہ ہندوستان سے جانے کے لیے آخری اعلان کا انتظار کر رہے تھے۔ بڑی عجلت میں بغل گیر ہوئے۔

بولے: ''آپ کو پاکستان ضرور آنا ہے۔''

میں نے کہا ''آؤں گا۔''

بولے ''میرے جیتے جی آنا ہے۔''

میں نے کہا ''بے شک!''

بولے ''مگر مجھے بہت زیادہ دن کی آزمائش میں نہ ڈالنا۔''

اور یوں 14 مہینوں کے مراسم ایک موڑ پر اچانک رک گئے۔میں نے سوچا تھا کہ کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں ان رشتوں میں پھر سے جان پڑ جائے گی اور یہ پھر سے سانس لینے لگیں گے۔

پچھلے تین برسوں میں انھوں نے کئی احباب کے ذریعے مجھے خود اپنا وعدہ یاد دلایا مگر میں نہ جا سکا۔ڈیڑھ مہینے پہلے انھوں نے ایک دوست کے ذریعہ کہلا بھیجا۔ ''آپ نہیں آتے تو پھر میں ہی دو تین مہینوں میں ہندوستان آنے کی کوشش کروں گا۔''

میں نے کئی احباب کو صادقین کی متوقع آمد کی خوش خبری سنائی کہ ''یارو آرہے ہیں صادقین۔جلاؤ پھر سے ماچسین اور بیٹھو پھر چٹائی پر۔''

مگر صادقین نے اس بار ''سفر برائے سفر'' کرتے ہوئے اچانک ایک ایسے راستے پر روانہ ہونے کا فیصلہ کرلیا، جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔وہ سچ مچ رنگ و نور کا آدمی تھا۔اپنے سارے رنگ اس دنیا میں چھوڑ گیا اور اپنے جینے کا ڈھنگ اپنے ساتھ لے گیا۔

مت سہل انھیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

مجتبیٰ حسین اور روزنامہ ''سیاست''

جناب مجتبیٰ حسین کا روزنامہ ''سیاست'' ''حیدرآباد سے نہایت گہرا تعلق رہا ہے۔میرے والد جناب میر عابد علی خان مرحوم نے اپنے جگری دوست جناب محبوب حسین جگر کے ساتھ مل کر سابق ریاست حیدرآباد کے کٹھن اور بدلتے ہوئے سیاسی وسماجی حالات میں جب ۱۵/اگست ۹۴۹۱ء کو روزنامہ ''سیاست'' کا اجرا کیا تو اس وقت مجتبیٰ حسین ضلع گلبرگہ میں ہائی اسکول کے طالب علم تھے۔۲۵۹۱ء میں جب وہ عثمانیہ یونیورسٹی سے گریجویشن کی تکمیل کے لئے حیدرآباد آئے تو تبھی سے ان کا روزنامہ ''سیاست'' سے ایک غیر رسمی سا تعلق بن گیا۔طالب علمی کے زمانہ ہی سے وہ روزنامہ ''سیاست'' کے لئے فلمی تبصرے اور سماجی و ادبی موضوعات پر ہلکے پھلکے مضامین لکھنے لگے۔۶۵۹۱ء میں وہ باضابطہ طور پر روزنامہ ''سیاست'' سے وابستہ ہوگئے اور انہوں نے اس کے سب ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔میرے والد جناب میر عابد علی خان مرحوم انہیں بہت عزیز رکھتے تھے اور مجتبیٰ حسین کی ذہنی تربیت میں ان کا بڑا حصہ رہا ہے۔بہت کم لوگوں کو پتہ ہوگا کہ مجتبیٰ حسین نے ۲۶۹۱ء تک صرف ایک صحافی کی حیثیت سے کام کیا اور ان کا شمار اردو کے بہترین مترجمین میں بھی ہونے لگا۔۲۶۹۱ء میں جب روزنامہ ''سیاست'' کے طنزیہ کالم ''شیشہ و تیشہ'' کے مشہور کالم نگار شاہد صدیقی کا انتقال ہوا تو اس طنزیہ کالم کو لکھنے کی ذمہ داری مجتبیٰ حسین کو سونپی گئی۔یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس نے اردو زبان کو ایک منفرد اور صاحب طرز مزاح نگار سے روشناس کرایا۔وہ ''کوہ پیما'' کے فرضی نام سے یہ کالم لکھنے لگے۔دیکھتے ہی دیکھتے ان کا یہ کالم عوام میں مقبول ہوتا چلا گیا اور ہندوستان اور پاکستان کے کئی اخباروں میں بڑے اشتیاق کے ساتھ نقل بھی کیا جانے لگا۔رفتہ رفتہ مجتبیٰ حسین ایک صحافی کی بجائے ایک طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے اور اب تو مزاح نگاری ہی ان کی واحد شناخت رہ گئی ہے۔۲۷۹۱ء میں جب وہ دہلی چلے گئے تو تب بھی لگ بھگ چھ سات برسوں تک اپنا کالم وہاں سے لکھ کر بھیجتے رہے۔گویا سولہ سترہ برسوں تک مجتبیٰ حسین نے روزنامہ ''سیاست'' کا طنزیہ کالم لکھا۔دہلی میں اپنی سرکاری مصروفیات کے باوجود وہ روزنامہ ''سیاست'' کے لئے اپنی تخلیقات پابندی سے بھیجتے رہے۔روزنامہ ''سیاست'' سے انہیں جو قلبی اور ذہنی لگاؤ رہا ہے اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مجتبیٰ حسین کی بیشتر تخلیقات سب سے پہلے روزنامہ ''سیاست'' میں ہی شائع ہوئیں۔ان کے مضامین ہوں یا سفرنامے، خاکے ہوں یا ادبی تبصرے وہ سب سے پہلے ''سیاست'' کے صفحات کی زینت بنے۔اگر کوئی مجتبیٰ حسین پر تحقیق کرنا چاہے اور وہ صرف روزنامہ ''سیاست'' کے پچھلے پچاس برسوں کے شماروں کا جائزہ لے لے تو اسے نہ صرف مجتبیٰ حسین کے ادبی سفر کا اندازہ ہوگا بلکہ ان کی ساری ادبی اور نجی سرگرمیوں کی تفصیلات کا بھی علم ہو جائے گا۔

زاہد علی خاں–ایڈیٹر روزنامہ سیاست، (حیدرآباد)

نائب وزیر اعظم کا شاعر بن جانا

مجتبیٰ حسین

پنجابی کی مشہور ادیبہ اور ہماری دوست اجیت کور، نہ جانے کیا کیا کرتی رہتی ہیں۔ ایک دن صبح صبح آٹھ بجے (جو ہماری گہری نیند کا وقت ہے) ہمیں فون کیا اور پوچھا ''یہ بتاؤ، آنے والے کل کی رات تمہیں بھوک لگے گی یا نہیں؟'' ہم نے کہا ''اجیت کور جی! یہ آج آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ سویرے سویرے بڑا عجیب وغریب سوال پوچھ رہی ہیں۔ اب ہم نہار منہ آپ کے اس سوال کا کیا جواب دیں۔ مانا کہ اردو کے ادیب ہیں اور بھوک سے ہمارا رشتہ بہت پرانا ہے۔ یہ بھی مانا کہ یہ چاند اور سورج ہمیں روٹیاں دکھائی دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود آنے والے کل کی شب ہمیں بھوک لگے گی یا نہیں، اس کی پیش قیاسی ابھی سے کیوں کر کر سکتے ہیں۔ یہ تو بتایئے کہ آپ ہماری پیشگی بھوک کے حوالے سے کیا کہنا چاہتی ہیں؟''

دُرشت لہجے میں بولیں ''ہم سکھوں کے پاس ایک شئے ہوتی ہے، جسے عقلِ سلیم کہتے ہیں۔ وہ تمہارے پاس بالکل نہیں ہے۔ میرے اس آسان سے سوال کا آسان مطلب یہ ہے کہ کل رات کا کھانا تم میرے گھر کھاؤ گے اور تم لگے چاند سورج کی روٹیاں توڑنے۔''

ہم نے کہا ''کیا کریں۔ مفت کی روٹیاں توڑنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ ویسے ہم آپ کے گھر کھانا ضرور کھائیں گے۔ کیونکہ اکثر کھاتے ہی رہتے ہیں، لیکن یہ تو بتایئے کہ اس کھانے کا عنوان کیا ہے؟''

بولیں ''مسٹر! یہ کھانا ہے، میرا افسانہ نہیں کہ تم اس کا عنوان تلاش کرنا شروع کر دو۔'' ہم نے کہا ''عنوان کا مطلب یہ ہے کہ یہ تقریب سعید یعنی آپ کی پنجابی میں یہ ''کھانا شانا'' کس سلسلہ میں ہو رہا ہے؟''

بولیں ''کل رات خود آ کر دیکھ لو۔'' ہم نے کہا ''مگر اس سے پہلے ذرا اشارہ ہو جائے تو کیا قباحت ہے تا کہ ہمیں اندازہ ہو جائے کہ اپنی بھوک کو کتنا چمکانا ہے اور مانجھنا ہے''۔ اجیت کور نہایت درشت لہجہ کے ساتھ پنجابی میں بولیں ''ہون تو بک بک بند کر۔ تو کل شام ساڈے گھر روٹی شوٹی کھانی اے۔ ہور میں کچھ نہیں سننا چاہوندی۔''

اجیت کور جب تم سے تو پر اُتر آتی ہیں تو ہم خاموش ہو جاتے ہیں کیونکہ اس کے بعد وہ پنجابی میں بے نقط سنانے لگتی ہیں۔ لہٰذا ہم نے بھی زبان دانی میں ان کا ساتھ دیتے ہوئے کہا ''ہون تسی چنتا نہ کرو جی۔ میں ضرور آوانگا۔'' پھر شرافت کے ساتھ اردو میں بولیں ''کل ٹھیک چھ بجے آ جانا۔ یاد رہے گا یا بولوں پنجابی میں؟'' m

دوسرے دن ہم ان کے گھر پہنچے تو وہ ہمیں برآمدہ ہی میں مل گئیں۔ ہم نے کہا ''لیجیے ہم کھانا کھانے کے لئے آ گئے۔ کہاں ہے کھانا؟ کدھر ہے کھانا؟''

بولیں ''اے ہے کتنے دن کے بھوکے ہو؟ ذرا صبر کرو۔ پہلے کچھ لوگوں سے مل تو لو۔'' ہم نے کہا ''ہمیں کیا معلوم کہ آج رات کن کن سے ملنا ہے۔ آپ فون پر کچھ بتاتی تو ہیں نہیں۔'' بولیں ''اسکینڈی نیویا کا ایک ملک ہے، سویڈن نام تو سنا ہوگا۔ آج اسی ملک کے ایک شاعر سے تم کو ملنا ہے۔''

ہم نے ماتھے کو پیٹ کر کہا ''اجیت کور جی! ہم تو اردو زبان کے شاعر تک سے ملنے سے کتراتے ہیں اور آپ ہمیں بیرونی زبانوں کے شاعروں سے ملوا رہی ہیں، گویا آج بھی ہم مارے گئے۔ کچھ دن پہلے ایک روسی شاعر کے سامنے بٹھا دیا تھا۔ نہ وہ ہماری بات سمجھے نہ ہم اس کی۔ آج سویڈش زبان کے شاعر کے سامنے بٹھا رہی ہیں۔ ہماری تو ساری چمکی چمکائی بھوک اس خیال سے غارت ہو گئی''

بولیں ''مرے کیوں جا رہے ہو، یہ سویڈش شاعر انگریزی بھی جانتا ہے۔ تمہیں جتنی انگریزی آتی ہے اس میں اس سے بات کرو۔''

وہ ہمیں ڈرائنگ روم میں لے گئیں تو دیکھا کہ انگریزی کے مشہور ادیب اور صحافی خوشونت سنگھ ایک صوفہ پر بیٹھے ایک یوروپی شخص سے ہم کلام ہیں۔ دوسرے صوفہ پر ہندی کی مشہور ادیبہ کرشنا سوبتی، انگریزی اور پنجابی کے نامور صحافی راج گل مع اہلیہ کے موجود تھے اور فرش پر ہمارے دوست گوپی چند نارنگ آلتی پالتی مارے یوں بیٹھے ہیں جیسے ان سب کے آگے اپنا زانوئے ادب تہہ کر رکھا ہو۔

اجیت کور نے ہمیں ادھیڑ عمر کے ایک یوروپی شخص سے ملاتے ہوئے کہا ''ان سے ملو یہ ہیں پر اہلمارک (PER AHALMARK) سویڈن کے نائب وزیر اعظم رہ چکے ہیں۔ اب صرف شاعر باقی رہ گئے ہیں''۔ پھر اجیت کور نے ہم سے کہا ''تم اپنا تعارف خود کراؤ۔'' اور اس کے جواب میں ہم نے حسبِ عادت شرما کر کہا: ''میں مجتبیٰ حسین ہوں۔ اردو ایک زبان ہے جس میں مزاح لکھتا ہوں۔ اس لیے زندگی میں کبھی کسی ملک کا نائب وزیر اعظم نہیں بن سکا۔''

اجیت کور نے کہا ''ہت تیری کی۔ تجھے اپنا تعارف تو کرانا آتا ہی نہیں۔ چل ہٹ۔ میں کراتی ہوں تعارف تیرا۔ اس کے بعد اجیت کور نے ٹھیٹ پنجابی لہجہ میں انگریزی بولتے ہوئے ہمارا تعارف کچھ اس انداز سے کرایا کہ سویڈن کے موجودہ شاعر اور سابق نائب وزیر اعظم کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ہمیں یوں لگا جیسے ہمارے تعارف کا اصل مقصد ہمارا تعارف کرانا نہیں بلکہ سویڈش شاعر کی آنکھیں پھاڑنا تھا۔ تعارف کے بعد ہم گوپی چند نارنگ کی بغل میں بیٹھنے کے لیے فرش پر آلتی پالتی مارنے لگے تو کسی نے کہا ''آپ صوفہ پر کیوں نہیں بیٹھتے؟'' ہم نے کہا ''پروفیسر گوپی چند نارنگ کو فرش پر بیٹھا دیکھ کر میں نے یہ سمجھا کہ اجیت کور اردو والوں کو فرش پر اور دوسری زبانوں کے ادیبوں کو صوفہ پر

بٹھانا چاہتی ہیں۔یوں بھی وہ ہندوستانی زبانوں کے مقام کوخوب پہچانتی ہیں۔''
خوشونت سنگھ، جو اس وقت تک سوئیڈش شاعر سے محو کلام تھے۔ بولے''مجتبیٰ! اگر تم اگلے ہفتہ تک، جب تک کہ میرا کالم نہ چھپ جائے، ایک لطیفہ کوخفیہ رکھ سکو تو ایک لطیفہ سناتا ہوں۔اس کے بعد انہوں نے ایک ایسا لطیفہ سنایا جس پر سب نے زوردار قہقہہ لگایا۔مگر ہم ایسے لطیفہ کو ان کے کالم میں چھپ جانے کے بعد بھی خفیہ ہی رکھیں گے۔کیونکہ اسی میں ہماری عافیت ہے۔اس کے بعد پنجابی کے دو اور ادیب آ گئے تو خوشونت اُن سے باتوں میں لگ گئے۔
سوئیڈن کے سابق نائب وزیراعظم مسٹر اہلمارک نے غالباً سوچا کہ جس زبان کے دو ادیب فرش پر بیٹھے ہیں کیوں نہ ان سے بھی بات چیت کی جائے۔سوئیڈش شاعر نے بھی خالص اردو میں آلتی پالتی ماری اور ہم سے پوچھا''کیوں جناب! یہ آپ جس زبان میں لکھتے ہیں وہ ہے کیا؟ ذرا ناک نقشہ اس زبان کا بھی دکھاؤ''
ہم نے کہا''یہ گوپی چند نارنگ بیٹھے ہیں۔زبان کا ناک نقشہ خوب دکھاتے ہیں۔انہی سے پوچھئے۔'' اب جو پروفیسر نارنگ نے سوئیڈش شاعر کو اردو زبان کی عظمت، تمکنت اور شان و شوکت سے واقف کرانا شروع کیا تو مسٹر اہلمارک ان کے زورِ بیان سے کچھ اتنے مرعوب و مسحور ہوئے اور ان کے چہرے پر کچھ ایسے آثار نمودار ہوئے جیسے اپنی قسمت کو کوس رہے ہوں کہ ان کی مادری زبان سوئیڈش کیوں ہے، اردو کیوں نہیں۔
ہم نے کہا''مسٹر اہلمارک! شاعری واعری زبان و بیان کو ماریئے گولی۔ پہلے یہ بتایئے کہ آپ نے سوئیڈن کے نائب وزیراعظم کا عہدہ کیوں چھوڑ دیا، کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟ بخدا ہمیں کسی ملک کا نائب وزیر اعظم تو بہت دور کی بات ہے، وزیر ہی بنا دے تو ہم مزاح نگاری کو چھوڑنے کے لیے تیار ہیں۔''
مسٹر اہلمارک نے ہمارے اس ذہین سوال کا جواب دینے کے لیے پہلے تو اپنے ماتھے پر بل ڈالے''مسٹر حسین! میں بیس سال تک سوئیڈن کی عملی سیاست سے وابستہ رہا۔کئی عہدوں پر فائز رہا مگر جب نائب وزیراعظم بنا تو ایک دن میرے اندر جو شاعر بیس برس سے سویا ہوا تھا وہ اچانک جاگ گیا۔اس نے نظمیں کہنا شروع کر دیں اور یوں میں عملی سیاست سے نکل آیا۔'' ہم نے کہا ''مسٹر اہلمارک! آپ نے یہ غلطی کی۔شاعر جاگ گیا تھا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ سیاست داں سو جائے۔شعر بھی کہتے اور سیاست بھی چلاتے۔ ہمارے ہاں ایک شاعر گذرے ہیں۔ان کے ہاں تو''چکی کی مشقت'' اور''مشقِ سخن'' دونوں ساتھ ساتھ جاری رہتی تھیں۔ ہمارا تو خیال یہ ہے کہ''اقتدار کی کرسی'' پر بیٹھ کر جب ہمارے ہاں کوئی شعر کہتا ہے تو اسے زیادہ آسانی سے سمجھا جاتا ہے (سمجھنے کا اشارہ شعر اور شاعر دونوں کی طرف ہے) آپ تو اقتدار کی بڑی کرسی پر بیٹھے تھے۔ہمارے ہاں چھوٹی چھوٹی کرسیوں پر بیٹھ کر بھی کوئی شعر کہتا ہے تو اسے خوب داد ملتی ہے۔رسالے اس کا خصوصی نمبر نکالتے ہیں۔یہ اور بات ہے کہ کرسی سے اترتے ہی اس کے شعروں میں سے مفہوم بھی اُتر جاتا ہے۔ ہماری زبان پر کچھ شاعروں اور ادیبوں کے نام مثال کے طور پر آ بھی گئے تھے لیکن اہلمارک انہیں جانتے نہیں تھے، اس لیے ہم خاموش ہو گئے۔
مسٹر اہلمارک نے کہا''جب میرے اندر شاعر جاگ گیا تو میں نے سوچا کہ سیاست داں کو اب سلا دیا جائے۔ دونوں کو ایک ساتھ جاگتے رہنے کی زحمت دینے کا فائدہ کیا؟'' ہم نے کہا''آپ کی مرضی، ہم تو آپ کو فائدہ کی بات بتا رہے تھے۔یوں بھی نائب وزیراعظم کا عہدہ یوں آسانی سے چھوڑنے والا نہیں ہوتا۔کیا عجب کہ آپ وزیراعظم بن جاتے۔ ہمارے سیاستدانوں کو دیکھئے کہ قبروں میں پاؤں لٹکائے بیٹھے رہتے ہیں لیکن دل میں وزیراعظم بننے کے ارمان کو جوان اور تر و تازہ رکھتے ہیں۔خیر یہ بتایئے کہ آپ کے اب تک کتنے شعری مجموعے چھپ چکے ہیں؟''
بولے''اب تک چھ مجموعے چھپ چکے ہیں۔'' ہم نے پوچھا''یہ بتایئے سوئیڈش زبان میں عام طور پر شعری مجموعوں کی تعدادِ اشاعت کیا ہوتی ہے؟''
بولے''تعدادِ اشاعت میں عموماً پانچ سو نسخے ہوتے ہیں۔شاعر بہت مقبولِ عام ہو تو تعدادِ اشاعت دو ہزار بھی ہو سکتی ہے۔''
ہم نے کہا''مسٹر اہلمارک! تعدادِ اشاعت کے معاملے میں سوئیڈش زبان اردو زبان سے زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہے کیونکہ ہمارے ہاں بھی یہی معاملہ ہے۔شاعر پانچ سو نسخے چھاپتا ہے اور انہیں دوستوں میں خوشی خوشی تحفتاً بانٹ دیتا ہے۔دوستوں کی تعداد، کتابوں کی تعدادِ اشاعت سے کم ہو تو شاعر کے نسخے پڑے رہ جاتے ہیں۔اس لئے ہمارے بہت سے شاعروں کے مجموعہ ہائے کلام کی تعدادِ اشاعت ان کے دوستوں کی تعداد کے مساوی ہوتی ہے۔
اہلمارک بولے''ہمارے ہاں یہ نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں اعزازی نسخے دینے کا رواج نہیں ہے۔پبلیشر تو ہمیں رائلٹی دیتا ہی ہے۔اس کے علاوہ لائبریریوں سے بھی رائلٹی ملتی ہے۔طریقہ اس کا یہ ہے کہ ایک کتاب ایک لائبریری میں کتنی بار پڑھی جاتی ہے، اس حساب سے ادیب کو رائلٹی ملتی ہے۔کیا آپ کو لائبریریوں سے رائلٹی نہیں ملتی؟''
ہم نے کہا''رائلٹی تو بہت بڑی چیز ہے، جو پبلشر بھی ہمیں نہیں دیتا۔ لائبریریوں سے رائلٹی ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاہم لائبریریوں سے ہمیں اپنے ادب کے بارے میں صحیح رائے ضرور مل جاتی ہے۔کیونکہ ہمارے ناظرین کرام کتاب پڑھنے کے بعد عوام الناس اور ادیب دونوں کی بھلائی کے لئے اپنی رائے کتاب کے ہر صفحہ پر قلمبند کرتے چلے جاتے ہیں۔بعض اوقات تو ناظرین کی رائے ادیب کی تخلیق سے بہتر ہوتی ہے۔خیر چھوڑیئے ان باتوں کو، یہ بتایئے آپ کے ہاں مشاعرہ ہوتا ہے یا نہیں؟''
مسٹر اہلمارک نے پوچھا''یہ مشاعرہ کیا چیز ہوتا ہے؟''
ہم نے کہا''بہت بُری چیز ہوتا ہے۔ بہت سے شاعر ایک پلیٹ

فارم پر جمع ہو کر شعر سناتے ہیں اور ہم جیسے بیوقوف انہیں نہ صرف سنتے ہیں بلکہ شعر سمجھ میں نہ آئے تو داد بھی دیتے ہیں۔''

اہلمارک بولے''ہمارے ہاں سارے شاعر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر شعر نہیں سناتے۔ایک شاعر شعر سناتا ہے اور پچاس ساٹھ آدمی اسے سنتے ہیں۔''

ہم نے کہا''ہمارے ہاں بعض اوقات معاملہ الٹا ہوتا ہے یعنی پچاس ساٹھ شاعر پلیٹ فارم پر ہوتے ہیں اور ایک دو سامعین انہیں سنتے ہیں۔''

مسٹر اہلمارک نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ دیں اور پوچھا''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

ہم نے کہا''اگر آپ اردو کے شاعر ہوتے تو ہمارے بیان پر اس طرح اظہار حیرت نہ کرتے۔اچھا یہ بتایئے آپ کے یہاں شاعر ترنم سے کلام سناتے ہیں یا نہیں یعنی شعروں کو گا کر سناتے ہیں یا نہیں؟''

اہلمارک بولے''اگر شاعر بھی گانے لگ جائیں تو بے چارے موسیقاروں کا کیا ہوگا۔ہم گانے کو شاعری سے الگ فن سمجھتے ہیں۔تاہم ادھر کچھ برسوں سے ہمارے شاعر اپنا کلام سنانے کے لیے اداکاروں کی خدمات حاصل کر رہے ہیں تا کہ اداکار ان کے کلام کو مؤثر انداز میں پڑھ سکیں۔کیا آپ کے ہاں بھی شاعر اداکاروں کی خدمات سے استفادہ کرتے ہیں؟''

ہم نے کہا''جی نہیں،ہمارا ہر شاعر اداکار بھی ہوتا ہے۔''

اہلمارک نے پریشان ہو کر کہا''تب تو اردو شاعری کرنا بہت دشوار ہے کیونکہ آدمی کو بیک وقت شاعر، گویا اور اداکار تینوں کے رول ادا کرنے پڑتے ہیں۔''

ہم نے کہا''یہی تو اردو شاعری کی خوبی ہے۔''

پھر اہلمارک نے ہم سے مختلف ہندوستانی زبانوں کے بارے میں پوچھا۔مختلف شہروں کے بارے میں پوچھا۔ہم نے اپنے وطن مالوف حیدرآباد کا ذکر کیا تو بولے''بنگلور جاتے ہوئے آپ کے وطن مالوف کو ہوائی جہاز میں سے دیکھا ہے۔اگلی بار آؤں گا تو ہوائی جہاز سے اتر کر بھی دیکھوں گا۔'' اس رات اہلمارک اردو مشاعرہ کی روایت کا حال سن کر حیرت میں مبتلا ہو گئے تھے۔انہیں یقین ہی نہیں آتا تھا کہ بیک وقت اتنے شاعر اتنے سارے سامعین کو کلام سنا سکتے ہیں۔وہ ہمارے انکشاف کو ہماری مزاح نگاری پر محمول کر رہے تھے۔ہم نے کہا بھی کہ کل ایک مشاعرہ ہونے والا ہے۔آپ خود چل کر دیکھ لیجئے اور سن بھی لیجئے اور ہو سکے تو داد بھی دیجئے۔ہاتھ کنگن کو آرسی کیا،مگر مسٹر اہلمارک کو اسی رات اپنے وطن واپس ہونا تھا۔یوں بھی بمبئی،بنگلور اور مدراس وغیرہ کا دورہ کر کے وہ دہلی آئے تھے۔

مسٹر اہلمارک نے ہمیں اپنا وزیٹنگ کارڈ دیا اور بولے''کبھی سوئیڈن آیئے۔''

ہم نے کہا''سوئیڈن آنے کی بظاہر تو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔تاہم اگر آپ ہمارا ایک کام کردیں تو شاید ہمارے سوئیڈن آنے کی صورت نکل آئے۔''

اہلمارک بولے''بتایئے! میں کیا خدمت کرسکتا ہوں۔''

ہم نے معصومیت سے کہا''ہمیں ہماری مزاح نگاری پر نوبل انعام دلوایئے۔اس انعام کو حاصل کرنے کی غرض سے ہم سوئیڈن ضرور آسکتے ہیں۔آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔تو رہا وعدہ پھر۔''

اس پر اہلمارک نے زوردار قہقہہ لگایا اور ہم نے بڑی اداسی کے ساتھ کہا''مسٹر اہلمارک ہماری بدبختی یہ ہے کہ جب بھی ہم سنجیدگی کے ساتھ کوئی بات کرتے ہیں تو لوگ اس پر ہنسنا شروع کردیتے ہیں۔آپ ہمیں نوبل انعام نہیں دینا چاہتے نہ دیجئے،خوش تو رہیے۔''

اہلمارک پھر ہنسنے لگے۔پھر وہ ہنستے ہنستے سوئیڈن چلے گئے اور ہم نوبل انعام پانے کے ارمان کو اپنے دل میں چھپائے اپنے گھر واپس آگئے۔

آدمی نامہ:ایک جائزہ

مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں مزاح اور سنجیدگی کے روایتی فرق سے لاتعلقی کا بہت خاموش اظہار، سب سے زیادہ اُن کے شخصی خاکوں میں ہوا ہے۔وہ مزاح اور سنجیدگی کے فرق سے نہ تو باضابطہ انکار کرتے ہیں نہ ہی اس سلسلے میں کسی طرح کی فلسفیانہ موشگافی سے کام لیتے ہیں، مگر اُن کا کوئی بھی خاکہ اُٹھایئے اُسے پڑھتے پڑھتے آپ کہاں، کس نقطے پر مزاح سے نکل کر سنجیدگی کے حدود میں داخل ہوگئے، اس کا احساس آپ کو اُس وقت ہوتا ہے جب اچانک آپ کا اپنے ردِّعمل میں تبدیلی کی طرف دھیان چلا جائے۔

مجتبیٰ حسین کے کئی خاکوں کو پڑھتے یا سنتے وقت مجھے اپنے احساسات میں ایک حرارت آمیز ابتری کا اور دھڑکنوں کی رفتار میں تیزی کا تجربہ ہوا ہے۔اس کی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ مجتبیٰ حسین بے تکلف اور بے ساختہ انداز میں کسی شخصیت کا خاکہ باندھتے باندھتے اچانک سنجیدہ ہوجاتے ہیں اور تجزیے کی اُن حدوں میں جا پہنچتے ہیں جو ہمارے مزاح نگاروں کی اکثریت کے لیے ممنوعہ علاقے کی حیثیت رکھتی ہے۔کبھی کبھی تو مجتبیٰ حسین کے خاکوں میں قہقہوں اور آنسوؤں کی تمیز بھی مشکل ہوجاتی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ تبسم کے پردے میں ایک گہرے افسوس کو چھپانے کی وہ مستقل کوشش کر رہے ہیں اور اپنے قاری کو ماورائے بیان جانے کی دعوت دے رہے ہیں۔

پروفیسر شمیم حنفی (دہلی، بھارت)

براہِ راست

بہ قول سعید ''شیر کو مارا تو کیا مارا، نفس کو مارا تو سب کچھ مارا'' آپ کے مطالعے اور مشاہدے میں یقیناً آیا ہوگا۔ لاکھ کوشش کے باوجود نفس پر قابو پانا ہمارے لیے ہمیشہ دیوانے کا خواب ہی ثابت ہوا البتہ! شیر نہیں بیّر شیر کو زیرِ دام لانے میں ہم ضرور کامگار ٹھہرے ہیں۔ یہاں یہ بتلانا ضروری بلکہ اہم بھی ہے کہ فکاہیہ اردو ادب کے شیرِ بیّر جنہیں دنیا **مجتبیٰ حسین** کے نام سے جانتی، مانتی اور سر آنکھوں پر بٹھاتی ہے، چہارسو کی کھُونٹ اُنہیں بٹھانا ہمارے اکیلے کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس کارِ پُرشوق میں نامور ادیب اور عالمی اردو ادب کے مدیر بھائی نند کشور وکرم قدم قدم پر ہماری مدد و رہنمائی کے لیے دستیاب تھے۔

اس بے مثل و بے نظیر کامیابی کی خوشی میں ہر دو فاضل بزرگان کا اپنی اور آپ کی جانب سے شکریہ ادا کرنا واجب بھی ہے اور لازم بھی۔ اس سے سوا کچھ بھی کہنا اپنی حد سے تجاوز کے زمرے میں شمار ہوگا۔ تو قارئینِ کرام فوراً سے پیشتر، جلدی سے پہلے اُردو دنیا کے ممتاز ترین اور محبوب ترین طنز و مزاح نگار جناب **مجتبیٰ حسین** سے روبرو ہو جائیے اور اپنے احساسات و جذبات پر ہرگز ہرگز ضبط نہ کیجیے!!!

گلزار جاوید

☆ پہلا سوال ہمارا بڑا روایتی ہوتا ہے جس میں مخاطب سے زیادہ آباء کی نسبت اشتیاق پایا جاتا ہے؟

☆☆ میرے آباء و اجداد عثمان آباد کے رہنے والے تھے جو سابق ریاست حیدرآباد کا ضلعی مستقر تھا۔ اب یہ ضلع ریاست مہاراشٹرا میں شامل ہے۔ میرے دادا محمد حسین محکمۂ مال گذاری میں اہلکار تھے۔ اُن کے بیٹوں مولوی محمد اسحٰق، مولوی محمد احمد حسین (میرے والد)، مولوی محمد غوث اور مولوی مظفر حسین نے بڑی جستجو، لگن اور محنت کے ساتھ تعلیم حاصل کی۔ چنانچہ میرے تایا مولوی محمد اسحٰق نے وکالت کا امتحان کامیاب کیا اور اُن کا شمار عثمان آباد کے نامی گرامی وکلاء میں ہوتا تھا۔ میرے والد مولوی محمد احمد حسین نے محکمۂ مال گذاری میں ملازمت اختیار کی اور ترقی کر کے تحصیلدار کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ میرے چچا مولوی محمد غوث بھی تحصیلدار بنے۔ چھوٹے چچا مولوی مظفر حسین بھی محکمۂ مال میں پیشکار رہے۔ یوں ہمارا شمار عثمان آباد کے کھاتے پیتے گھرانوں میں ہوتا تھا۔ میرے والد مولوی احمد حسین نے سابق ریاست حیدرآباد کے کئی اضلاع میں خدمات انجام دیں۔ بعد میں وہ ضلع گلبرگہ کے تحصیلدار بنے تو خاصے لمبے عرصہ تک گلبرگہ میں اس عہدہ پر فائز رہے۔ ریاست حیدرآباد کے فرمانروا نواب میر عثمان علی خان میرے والد کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ جب بھی حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودرازؒ کے سالانہ عرس میں شرکت کے لئے گلبرگہ آتے تو گلبرگہ کے صوبیدار کو بطور خاص ہدایت دیتے تھے کہ اُن کے دورے کے جملہ انتظامات کی نگرانی میرے والد کے سپرد کی جائے۔ اردو ریاست حیدرآباد کی سرکاری زبان تھی اور میرے والد بہترین اردو داں تھے۔ دفتری زبان لکھنے پر انھیں گہرا عبور تو تھا ہی، اردو شعر و ادب کے بھی دلدادہ تھے۔ چنانچہ اُن کے ہاں ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں سے لے کر کئی مشاہیر ادب کی کتابیں اور کلاسیکی شعراء کے دواوین موجود تھے۔ غالب کے پرستار اور سرسید احمد خان کی فلاحی خدمات کے معترف تھے۔ انگریزی میں باضابطہ تعلیم تو حاصل نہیں کی تھی تاہم اس کی شد بد ضرور رکھتے تھے۔ چنانچہ ریاست حیدرآباد کے بعض انگریز عہدیدار انھیں بہت چاہتے تھے۔ اسی حوالے سے انھوں نے انگریزی آداب اور طور طریقے بھی اپنا لئے تھے۔ اگرچہ انگریزی لباس کبھی نہیں پہنا لیکن رہن سہن کے انداز انگریزوں کے اختیار کر لئے۔ زندگی بھر چھری کانٹے کی مدد سے کھانا کھاتے رہے۔ گھر کی زیبائش میں بھی انگریزی طرز کو اختیار کیا۔ وہ بیحد مقبول اور مشہور عہدیدار تھے اور سرکاری و سماجی حلقوں میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ بات چیت میں وہ اساتذہ کے اشعار نہایت برمحل انداز میں سنایا کرتے تھے۔ وہ ڈسپلن کے معاملے میں بھی خاصے سخت گیر تھے، جس کے زیر اثر ہماری تربیت ہوئی۔ ہم نو (9) بھائی تھے اور ایک بہن تھی جن کا کم عمری میں انتقال ہوا۔ میرے سب سے بڑے بھائی محبوب حسین جگرؔ جنھوں نے بعد میں حیدرآباد کے نامور صحافی کی حیثیت سے شہرت پائی، مجھ سے عمر میں 18 برس بڑے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے بعد گلبرگہ میں انٹرمیڈیٹ کالج کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ محبوب حسین جگرؔ نے اسی انٹرمیڈیٹ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ (بعد میں ابراہیم جلیس اور میں نے بھی اسی کالج میں تعلیم حاصل کی)۔ اُن دنوں گلبرگہ میں ادبی سرگرمیاں شروع ہو چکی تھی۔ اردو کے منفرد مزاح نگار اور انشاء پرداز مرزا فرحت اللہ بیگ گلبرگہ میں سیشن جج بن کر آ گئے تھے اور اُن کی زیر سرپرستی گلبرگہ میں نہ صرف علمی و ادبی سرگرمیاں شروع ہوئیں بلکہ انھوں نے کئی نوجوان طلبہ کی ہمت افزائی بھی کی۔ کالج کے کسی تقریری مقابلے میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے محبوب حسین جگرؔ کو سنا اور بیحد پسند کیا۔ بعد میں ابراہیم جلیس نے بھی فرحت اللہ بیگ کی ہمت افزائی کے نتیجہ میں گلبرگہ میں ''پیام برادری'' قائم کی اور علمی و ادبی سرگرمیاں شروع کیں۔ بھائیوں میں میرا نمبر چھٹا ہے۔ اس طرح ہمارے خاندان میں اردو شعر و ادب سے عملی دلچسپی کا آغاز محبوب حسین جگرؔ سے ہوا۔

☆ سوال نمبر دو بھی پہلے سوال یعنی آپ کے بچپن اور لڑکپن کی یادوں سے جڑا ہوا ہے؟

☆☆ بیسیویں صدی کی تیسری دہائی میں جب میرے شعور نے آنکھیں کھولیں تو وہ دور کئی لحاظ سے نہایت ہنگامہ پرور مگر پرآشوب بھی تھا۔ دوسری جنگ عظیم عروج پر تھی اور دوسری طرف ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد بھی نہایت پرجوش انداز میں جاری تھی۔ جنگ عظیم کے پس منظر میں جہاں کئی عملی دشواریوں کا سامنا تھا وہیں یہ افواہیں بھی پھیلتی رہتی تھیں کہ جاپان کسی بھی وقت ہندوستان پر حملہ کرسکتا ہے۔ سابق ریاست حیدرآباد میں اگرچہ سیاسی اور سماجی تبدیلیاں زیادہ نمایاں نہیں تھیں لیکن پھر بھی ملک کی جدوجہد آزادی کا اثر دکھائی دیتا تھا۔ چنانچہ ملک آزاد ہوا اور بعد میں اس کے نتیجہ کے طور پر پولیس ایکشن کے ذریعہ حیدرآباد کا انضمام انڈین یونین میں عمل میں لایا گیا۔ اس افراتفری کے پس منظر میں مجھے اکثر یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں بچپن اور لڑکپن کے دور سے گذرے بغیر ہی نوجوانی کی سرحد میں داخل ہوگیا۔ اُس ذہنی سکون اور فراغت سے میں محروم رہا جس میں ایک لڑکا اپنی زندگی گذارتا ہے۔ کھیل کود اور لڑکپن کی روایتی شرارتوں سے بھی دور ہی رہا۔ میرے والد اپنے زیرِ تعلیم بچوں کو عموماً ہاسٹل میں رکھنے کے قائل تھے۔ چنانچہ محبوب حسین جگر جب حیدرآباد آئے تو اُن کا قیام عثمانیہ یونیورسٹی کے ہاسٹل میں رہا۔ اسی طرح ابراہیم جلیس انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد اپنی اگلی تعلیم کیلئے علی گڑھ چلے گئے اور اُن کا قیام بھی ہاسٹل میں ہی رہا۔ میرے والد ریٹائرمنٹ کے باوجود گلبرگہ میں لمبے عرصہ تک مقیم رہے اور 1946ء میں اچانک اپنے آبائی وطن عثمان آباد منتقل ہونے کا فیصلہ کیا۔ جب حیدرآباد پر پولیس ایکشن ہوا تو میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا اور میرے والد نے مجھے گلبرگہ کے مڈل اسکول کے ایک ہاسٹل میں شریک کرادیا تھا۔ یہیں سے ہاسٹلوں میں میرے لمبے قیام کا سلسلہ شروع ہوا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب انڈین یونین کی فوج عثمان آباد سے ہوکر گلبرگہ کی طرف بڑھنے لگی تو میں اپنے بڑے بھائیوں کے پاس حیدرآباد جانے کے لئے ایک ٹرین میں سوار ہوگیا۔ مگر یہ ٹرین بھی حیدرآباد نہ جاسکی اور اسے درمیان میں ہی روک دیا گیا۔ چاروناچار کسی نہ کسی طرح میں تعلقہ چنچولی پہنچ گیا جہاں میرے ماموں ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ کچھ عرصہ گذارنے کے بعد اس مقام پر اچانک فساد پھوٹ پڑا، اور اس سانحہ میں، میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ماموں کو قتل ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس دور کو یاد کرتا ہوں تو نہ اپنا بچپن یاد آتا ہے اور نہ ہی لڑکپن کا خیال آتا ہے۔ اس سانحہ نے مجھے بیحد غمگین کردیا تھا اور میں آج بھی بنیادی طور پر ایک غمگین آدمی ہوں۔ اسی زمانے میں میری ذہنی کیفیت کچھ ایسی ہوگئی تھی کہ میں راتوں کو قبرستانوں میں جاکر بیٹھنے لگا تھا۔ اس کیفیت سے میں چار پانچ سال بعد ہی نجات پاسکا۔ لہذا میں اپنے بچپن اور لڑکپن کا ذکر کرنے سے قاصر ہوں۔

☆ کچھ روشنی تعلیمی ایّام، اساتذہ اور ہم جماعتوں کی نسبت ڈالئے؟

☆☆ جیسا کہ میں نے اوپر بتایا ہے، میں نے نہایت مشکل حالات میں اپنے تعلیمی سفر کو جاری رکھا۔ جیسے تیسے میں نے تعلقہ تانڈور کے ایک ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا اور گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج میں مجھے داخلہ مل گیا۔ میری زندگی میں ہاسٹلوں میں قیام کو بڑا اہم دخل رہا ہے۔ اور یہیں سے میں نے سماج میں زندہ رہنے کے آداب سیکھے۔ دوستوں کو ہی اپنا رشتہ دار سمجھا اور زندگی بھر دوستوں کے حوالے سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج کے ماحول نے مجھ میں بڑی زبردست تبدیلی پیدا کی اور میں کالج کی سماجی، تہذیبی اور ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگا۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ ہاسٹل میں قیام کے دوران مجھے بہت اچھے دوستوں کی رفاقت نصیب ہوئی۔ اُس زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی کے جو اساتذہ گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج میں تعینات تھے وہ بھی بیحد مخلص، مشفق اور فرض شناس تھے۔ پروفیسر سراج الدین انگریزی پڑھاتے تھے۔ پروفیسر شیام لال سماجیات کے استاد اور بائیں بازو کے خیالات کے حامل تھے۔ اپنے خاندانی پس منظر اور پروفیسر شیام لال کی تربیت کے نتیجے میں، میں بھی بائیں بازو کے نظریات کا حامی بن گیا۔ مجھے اس وقت اپنے اردو کے استاد ڈاکٹر عبدالمنان کی یاد آرہی ہے جو بیحد مشفق اور میرے کرم فرما تھے۔ اپنے بڑے بھائیوں کی تحریریں میں پڑھتا رہتا تھا، لیکن کبھی مجھے یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ میں بھی لکھنے کا اہل بن سکتا ہوں۔ انٹرمیڈیٹ کے پہلے سال میں اردو کے پرچہ میں ایک موضوع ''اپنی دنیا آپ پیدا کر، اگر زندوں میں ہے'' کے عنوان سے طلبہ سے خواہش کی گئی تھی کہ وہ اس پر مضمون لکھیں۔ میں نے بھی اس موضوع پر جو بھی سمجھ میں آیا وہ لکھ دیا۔ کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر عبدالمنان اردو کی کلاس میں آئے تو انھوں نے پوچھا مجتبیٰ حسین کون ہے؟۔ جواباً میں کھڑا ہوگیا تو انھوں نے کہا کہ جناب! آپ کا مضمون مجھے بیحد پسند آیا۔ آپ میں ایک بڑا ادیب بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ آپ کے یہاں طنز کی گہرائی اور مزاح کی شگفتگی بھی پائی جاتی ہے۔ یہ پہلا موقع تھا جب ڈاکٹر عبدالمنان کے حوالے سے مجھے یہ احساس ہوا کہ میں اپنے بڑے بھائیوں کے راستے پر چل سکتا ہوں۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ میرے ادبی سفر کا آغاز ڈاکٹر عبدالمنان کی ہمت افزائی کے نتیجے میں ہوا۔ وہ بیحد کم گو، کم آمیز اور مرنجان مرنج شخصیت کے حامل تھے۔ صرف چند دوستوں سے ملتے تھے اور گوشہ نشین واقع ہوئے تھے۔ انھوں نے دوسرے دن مجھے اپنے گھر پر بلایا اور اپنے ہاں سے کنھیا لال کپور، کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس کی کچھ کتابیں دیں اور تاکید کی کہ میں پہلے زیادہ سے زیادہ مطالعہ کروں۔ قدم قدم پر انھوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔ اگرچہ میں نے لکھنا تو شروع نہیں کیا تاہم کالج کی تہذیبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگا۔ انھیں دنوں میں کالج کی بزم اردو کا معتمد منتخب ہوا اور میں نے اس بزم کے تحت کالج میں خواجہ احمد عباس کا مشہور ڈرامہ ''یہ امرت ہے'' پیش کیا۔ اس ڈرامہ میں میں نے مزدور کا کلیدی کردار ادا کیا اور بے پناہ تعریف سے نوازا گیا۔ (اس ڈرامہ کی تیاریوں میں پروفیسر حسن محی الدین غیرت اور سلیمان خطیب نے اہم رول ادا کیا)۔ اسی بزم اردو کے تحت میں نے بعد میں گلبرگہ میں ایک کل ہند مشاعرہ بھی منعقد کیا جس میں جگن ناتھ آزاد، کیفی اعظمی، مجروح سلطانپوری، سلیمان اریب، عزیز قیسی، شاہد صدیقی وغیرہ نے

شرکت کی۔گلبرگہ کے کلکٹر اقبال چند ادب نواز اور اردو دوست تھے۔انھوں نے اس مشاعرے کے انعقاد کے لئے بزم اردو کی بھرپور سرپرستی کی اور شاعروں کو ''ایوان شاہی'' (جہاں نظام آف حیدرآباد کا قیام ہوا کرتا تھا) میں ٹھہرانے کا بندوبست کیا۔گلبرگہ ان دنوں ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا اور آئے دن ادبی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔

☆ اُس حادثہ یا واقعہ کی بابت بتلایئے جس کے بطن سے آپ کے اندر کا تخلیق کار باقاعدہ طور پر برآمد ہوا؟

☆☆ میں کسی ایسے حادثہ یا واقعہ کی طرف اشارہ کرنے سے قاصر ہوں جس کے باعث میرے اندر کا تخلیق کار برآمد ہوا۔سچ تو یہ ہے کہ مجھے آج تک پتہ نہیں کہ میں تخلیق کار ہوں بھی یا نہیں!۔یہ ضرور ہے اپنی اُن دنوں کی ذہنی کیفیت کے زیر اثر میں نے موت کے موضوع پر چھ (6) افسانے لکھے تھے اور انھیں دوستوں کی محفل میں سنایا بھی تھا۔مگر کبھی انھیں چھپوانے کی کوشش نہیں کی۔سچ تو یہ ہے کہ آج میرے پاس ان کے مسودے بھی موجود نہیں ہیں۔میں بنیادی طور پر اپنی ذات کے تعلق سے لااُبالی آدمی بھی رہا ہوں۔تاہم مزاح نگاری کے تعلق سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ میری مزاح نگاری کا آغاز 12 اگست 1962ء کو دن میں ٹھیک 10:30 بجے ہوا۔اور اس آغاز کا سبب بھی ایک سانحہ ہے۔اُن دنوں ''روزنامہ سیاست'' کا مزاحیہ کالم ''شیشہ و تیشہ'' مشہور شاعر اور انشاء پرداز شاہد صدیقی لکھا کرتے تھے اور یہ ایک مقبول کالم تھا۔اُن کا انتقال جولائی کے آخری ہفتہ میں ہوا۔اور یہ ایک اتفاق ہے کہ اُس رات میں سیاست کے نائیٹ ایڈیٹر کے طور پر اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔اُن کے انتقال کی خبر میں نے ہی سیاست میں چھاپی تھی۔مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ شاہد صدیقی کے انتقال کی خبر چھاپ کر میں اپنے اندر ایک مزاح نگار کے پیدا ہونے کی خبر بھی ساتھ میں چھاپ رہا ہوں۔شاہد صدیقی کے انتقال کے بعد سیاست کے انتظامیہ نے حیدرآباد کے بہت سے ادیبوں اور صحافیوں سے شاہد صدیقی کا چھوڑا ہوا کالم ''شیشہ و تیشہ'' لکھوانے کی کوشش کی لیکن بات نہیں بنی۔اسی اثناء میں میرے بڑے بھائی کے بعض دوستوں نے انھیں بتایا کہ میں حیدرآباد کی اورینٹ ہوٹل کی محفلوں میں اپنے احباب کے ساتھ پرلطف گفتگو کرتا ہوں۔کیوں نا یہ کالم مجتبیٰ حسین سے لکھوایا جائے۔یہ سچ ہے کہ کالج کے زمانے میں، میں اپنے احباب میں ایک زندہ دل نوجوان کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔اور میری باتوں کو احباب مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔میرے بڑے بھائی محبوب حسین جگر بہت سخت گیر اور ڈسپلن کے پابند آدمی تھے۔اسی لئے میں اُن سے کبھی بے تکلف نہیں ہوا اور ہمیشہ اپنی حد میں رہنے کی کوشش کی۔بہرحال انھیں میری زندہ دلی کا علم ہوا اور 12 اگست 1962ء کو میں سیاست کے دفتر پہونچا تو انھوں نے حکم دیا کہ میں اُس دن کا ''شیشہ و تیشہ'' لکھوں۔اُن سے انکار کرنے کی ہمت تو نہیں تھی، اسی لئے جیسے تیسے یہ کالم لکھ دیا۔پھر یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔میں یہاں روزنامہ سیاست کے بارے میں بھی کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔میرے بڑے بھائی محبوب حسین جگر نے جب بی اے کی تعلیم کے لئے عثمانیہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو اُن کی دوستی عابد علی خان صاحب سے ہوئی جو اُن کے ہم جماعت بھی تھے۔یہ دوستی اتنی اٹوٹ اور توانا ثابت ہوئی کہ دونوں یک جان دو قالب بن گئے اور حیدرآباد میں ان کی دوستی آج بھی ایک مثالی دوستی کی حیثیت سے جانی جاتی ہے۔تعلیم کے حصول کے بعد دونوں ہی ریاست حیدرآباد کے محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ میں ملازمت سے وابستہ ہوگئے تھے۔حیدرآباد پر پولیس ایکشن کے بعد ان دونوں نے مل کر فیصلہ کیا کہ سرکاری ملازمت سے مستعفی ہو کر ایک ایسا روزنامہ نکالنا شروع کریں جو دکن کے مسلمانوں میں ایک نیا حوصلہ پیدا کرسکے۔چنانچہ 15 اگست 1949ء کو ''روزنامہ سیاست'' کا آغاز عمل میں آیا اور عابد علی خان اس کے پہلے بانی ایڈیٹر اور محبوب حسین جگر اس کے بانی جوائنٹ ایڈیٹر بن گئے۔اس اخبار کو ابتداء میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور 66 برس گذرنے کے بعد آج روزنامہ سیاست ہندوستان کا نہایت ممتاز اور منفرد روزنامہ بن گیا ہے۔یہاں یہ ذکر بھی بیجا نہ ہوگا کہ میری ساری تحریریں سب سے پہلے سیاست ہی میں شائع ہوئیں۔میں شروع میں فرضی نام ''کوہ پیما'' کے حوالے سے شیشہ و تیشہ کا کالم لکھتا تھا، کچھ عرصہ بعد لوگوں نے یہ دریافت کرنا شروع کردیا کہ یہ کالم کون لکھتا ہے؟۔غالباً انھیں اس میں شگفتگی اور برجستگی نظر آنے لگی اور یوں میرا کالم اخبار میں مقبول ہوتا چلا گیا۔جیسا کہ میں نے بتایا ہے میرے اُستاد ڈاکٹر عبدالمنان کی تحریک پر میں نے اردو کے سارے مزاح نگاروں کو پڑھ رکھا تھا۔جب مزاح لکھنے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی تو میں نے سیاست کے دفتر میں پاکستان سے آنے والے اردو اخبارات کے سارے مزاحیہ کالموں کو نئے انداز سے پڑھنا شروع کیا۔انگریزی کے مزاح نگاروں کے علاوہ عبدالمجید سالک، احمد ندیم قاسمی، شوکت تھانوی، ابن انشاء، ابراہیم جلیس، نصر اللہ خان وغیرہ کے کالم بڑے اشتیاق سے پڑھے اور یوں میں نے مزاحیہ کالم نگاری کی خاطر ریاض کی منزلیں طے کیں۔بہرحال یہ میری ادبی زندگی کے آغاز کی کہانی ہے۔

☆ ابتدائی ایام میں شیشہ و تیشہ کے علاوہ کیا کچھ تحریر کیا اور اشاعت کی سبیل کس طرح بنی؟

☆☆ جیسا کہ میں نے اوپر بتایا ہے کہ یاسیت کے دور میں، میں نے موت کے موضوع پر کچھ افسانے لکھے تھے جو کبھی شائع نہیں ہوئے کیونکہ اشاعت کیلئے بھیجے ہی نہیں گئے۔یوں سمجھئے کہ میں نے یہ افسانے اپنی تسکین ذات کے لئے ہی لکھے تھے۔بعد میں 1956ء میں جب میں نے روزنامہ سیاست میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا تو مختلف موضوعات پر وقفہ وقفہ سے کئی سماجی، تہذیبی، ادبی اور سیاسی مضامین لکھے جو صحافت کی ذیل میں آتے ہیں۔

☆ اوپر کی سطور میں آپ نے فرضی نام سے لکھنے کی بابت بتلایا ہے،

اس کا کوئی خاص سبب رہا ہوگا؟

☆☆ اُس زمانے میں فرضی نام سے مزاحیہ کالم نگاری کرنے کا رواج صحافت میں عام تھا۔ جیسے احمد ندیم قاسمی روزنامہ امروز میں ''عنقا'' کے نام سے کالم لکھا کرتے تھے۔ میرا فرضی نام ''کوہ پیما'' تھا اور میرے پیشرو شاہد صدیقی یہی کالم ''کوہ کن'' کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ میں نے جو پہلا مزاحیہ مضمون اپنے اصلی نام کے ساتھ لکھا اُس کا عنوان تھا ''ہم طرفدار ہیں غالبؔ کے سخن فہم نہیں''۔ یہ مضمون غالبؔ کے یوم پیدائش کے موقع پر منعقد کی گئی ایک خاص تقریب کے لئے لکھا گیا تھا۔ یہ 1964ء کی بات ہے۔ اس کے بعد سے میں نے فرضی نام سے کالم نگاری کے ساتھ ساتھ اپنے اصلی نام کے ساتھ مزاحیہ مضامین لکھنے کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ اسی عرصہ میں حیدرآباد سے نکلنے والے مشہور رسالے ''صبا'' کے ایڈیٹر سلیمان اریب نے میرے بارے میں ایک خصوصی گوشہ شائع کیا اور میرے چند مضامین بھی شائع کئے۔ یہ سلسلہ آگے بڑھتا چلا گیا اور میں نے بعد میں انشائیہ نگاری کے ساتھ ساتھ خاکہ نگاری، سفر نامہ نگاری اور رپورتاژ نگاری وغیرہ کی منزلیں طے کیں۔

☆ دن رات کہیں بھی گزارو، صبح اپنے بستر سے اُٹھنے والی فلاسفی بقول مشتاق احمد یوسفی بدمعاشی پر محمول نہیں؟

☆☆ مشتاق احمد یوسفی جیسے بے مثال انشاء پرداز کی بات سے بھلا کون ہے جو اختلاف کرے گا۔ تاہم اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میں دوستوں کا رسیا ہوں اور اپنا زیادہ سے زیادہ وقت دوستوں کے درمیان گذارتا ہوں۔ ایک زمانے میں میری عادت رہی کہ میں علی الصبح گھر سے نکل جاتا تھا، اپنے دفتری فرائض سے فارغ ہونے کے بعد دوستوں کی صحبت میں وقت گذارتا تھا اور میرے دوست بھی ایسے تھے جن کے ساتھ وقت گذار کر میں کچھ کھوتا نہیں تھا بلکہ پاتا بھی تھا۔ اسی لئے وقت کے ضائع ہونے کا کبھی احساس بھی نہیں ہوا۔ آج جب میں گوشہ نشینی کی زندگی گذارنے پر مجبور ہو گیا ہوں تو مجھے اپنے ان سارے دوستوں کی ہر دم یاد آتی رہتی ہے۔ ان میں سے اکثر اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین

☆ ادارہ عوامی بہبود یعنی آپ کی خدمت خلق کی بڑی دھوم ہے۔ کچھ اس حوالے سے فرمایئے؟

☆☆ فطرتاً میں کچھ اس قماش کا آدمی ہوں کہ کسی کو تکلیف میں دیکھوں تو خاموش نہیں رہ سکتا۔ اپنے بس میں جو کچھ ہو سکتا ہے وہ کر گذرتا ہوں۔ مجھے ہمیشہ لوگوں کی محبتیں ملیں اور ان محبتوں کو ہی اپنی زندگی کا سب سے اہم سرمایہ سمجھتا ہوں۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ زندگی کے سفر میں میری شناسائی بہت سے صاحبانِ اقتدار سے رہی۔ خاص طور پر دہلی میں قیام کے زمانے میں نہ صرف میرا حلقۂ احباب وسیع ہوا، وہیں بہت سی اہم شخصیتوں سے مجھے قریب ہونے کا موقع ملا۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ جب بھی میں نے کسی ضرورت مند یا کسی دوست کے بارے میں کسی اہم شخصیت سے سفارش کی تو اُس کا کام ہو گیا۔ اسے آپ خدمت خلق سمجھتے ہیں تو سمجھیں، میں نے تو اسے اپنا ایک فرض سمجھا۔ لوگ ہر طرح کے کاموں کیلئے میرے پاس آتے تھے اور میں کسی نہ کسی طرح اُن کے کام کیلئے کوئی نہ کوئی سبیل نکال لیا کرتا تھا۔ اکثر احباب مجھے بجلی کا ملٹی پلگ Multi Plug بھی کہتے تھے جو ایک کا رابطہ دوسرے سے جوڑ دیتا ہے۔

☆ آپ کے ہاں خاص دوست اور عام دوست میں تفریق کا سبب کیا ہے؟

☆☆ میں نے کبھی خاص دوست اور عام دوست میں تفریق نہیں رکھی۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ بعض دوستوں سے میں بار بار اور زیادہ سے زیادہ ملنا چاہتا ہوں، اور ملتا بھی رہتا ہوں۔ آپ چاہیں تو انھیں خاص دوست کہہ لیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے دوستوں کی تعداد بھی کم ہی ہوتی ہے۔

☆ وہ کونسی گیڈر سنگھی ہے جسے سونگھتے ہی لوگ آپ کے گرویدہ ہو جاتے ہیں؟

☆☆ میرے پاس ایسا کوئی چمتکار نہیں ہے کہ جس کی بناء پر لوگ میرے گرویدہ ہو جائیں۔ میں جب بھی لوگوں سے ملتا ہوں تو پورے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ ملتا ہوں۔ کبھی کسی غرض یا لالچ کو درمیان میں آنے نہیں دیتا۔ شاید میرا یہ رویہ لوگوں کو پسند آتا ہو۔ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میں اُن چند خوش قسمت لوگوں میں سے ہوں جنھیں لوگوں نے اپنی بے پناہ محبتوں سے نوازا۔ اس بے لوث محبت کیلئے میں اپنے مداحوں کا ممنون ہوں۔

☆ ادیبوں شاعروں کی رگ رگ سے واقفیت کس علم اور ہنر کے سبب حاصل کی اور اس سے فوائد کیا حاصل ہوئے؟

☆☆ میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ میں ادیبوں اور شاعروں کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ تاہم میں نے ادیبوں اور شاعروں کی صحبت میں بھرپور زندگی جی اور اُن سے اکتساب بھی کیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی بساط کے مطابق اپنے ملنے والے ادیبوں اور شاعروں کے خاکے لکھے اور ظاہر ہے کہ انھیں مزاحیہ رنگ میں ہی لکھا۔ میں نے پہلا مزاحیہ خاکہ حیدرآباد کے مشہور حکیم یوسف حسین خان کا لکھا تھا جو عمر میں مجھ سے خاصے بڑے تھے۔ مگر میں نے وہ خاکہ نہایت بے تکلف انداز میں لکھا تھا۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں حکیم یوسف حسین خان کو یہ بات بری نہ لگے۔ مگر خلاف توقع یہ خاکہ اُنھیں بیحد پسند آیا۔ اس کے بعد میں نے کئی ادیبوں کے خاکے لکھے اور کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں اُن کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ جس کو جیسا دیکھا ویسا پیش کیا۔ یہ ضرور ہے کہ مزاح کا تڑکا ضرور لگایا۔ ہو سکتا ہے میرے بعض خاکے بعض صاحبان خاکہ کو ناگوار بھی گذرے ہوں مگر قارئین نے انھیں ہمیشہ سراہا۔ اس اعتبار سے میں اپنے آپ کو فائدہ میں گردانتا ہوں۔

☆ شہر یار صاحب سے ملنے اسکوٹر پر دہلی سے علی گڑھ کا سفر کوئی اور

کشش بھی یقیناً رکھتا ہوگا۔

☆☆ 1972ء میں جب میں اپنی ملازمت کے سلسلے میں حیدرآباد سے دہلی منتقل ہوا تو شمالی ہند میں جن دوستوں سے میری ملاقات ہوئی اُن میں شہریار بھی تھے جو اُن دنوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو کے استاد تھے۔ پہلی ہی نظر میں، میں شہریار کا گرویدہ ہوگیا اور شہریار بھی میرے گرویدہ ہوگئے۔ یوں بھی دوستی ہمیشہ دوطرفہ عمل کی متقاضی ہوتی ہے۔ جب بھی مجھے فرصت ملتی تو میں اپنی اسکوٹر لے کر علی گڑھ نکل جاتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُسی عرصہ میں میرے دو حیدرآبادی دوست اور کرم فرما وحید اختر اور حسن عسکری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ ہوگئے تھے۔ شہریار کے علاوہ ان دونوں دوستوں سے ملنے کا اشتیاق بھی میرے علی گڑھ کے سفر کا موجب ہوا کرتا تھا۔

☆ پیدائشی ادیب، شاعر، تخلیق کار تو ہوا کرتے ہیں، مزاح نگار کیونکر ظہور میں آتے ہیں؟

☆☆ ادیب یا شاعر میں کوئی جوہر قابل ہو تو اُس کا اظہار ادیب یا شاعر کسی نہ کسی طرح کرہی دیتا ہے۔ اپنی حد تک میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں محض اتفاقی طور پر مزاح نگار بن گیا۔ حالات کچھ ایسے پیدا ہوئے کہ مجھے اپنے بڑے بھائی کے حکم پر مزاح نگار بننا پڑا۔ میرے احباب اور خود میں بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ مجھ میں زندہ دلی اور خوش دلی کا مادہ موجود ہے۔ مگر کبھی خود سے مزاح نگار بن جانے کے بارے میں نہیں سوچا۔ یہ ضرور ہے کہ ہمارے بیشتر سینئر مزاح نگار جیسے شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی اور احمد جمال پاشا بنیادی طور پر شروع ہی سے فقرہ بازی اور برجستہ گوئی کا ملکہ رکھتے تھے۔ بھلے ہی میں پیدائشی طور پر مزاح نگار نہ رہا ہوں مگر میں نے مزاحیہ کالم نگاری کو ایک چیلنج کے طور پر قبول کیا۔ اس کے لئے میں نے باضابطہ ریاض کیا اور محنت کی۔ اردو اور انگریزی کے کئی مزاح نگاروں کی تخلیقات بھی پڑھیں۔ یہ ضرور ہے کہ میری مزاح نگاری کے معاملے میں میرے بڑے بھائی کی ذہنی تربیت کا بہت بڑا دخل رہا ہے۔

☆ کہا جاتا ہے کہ آپ طنز نگار نہیں مزاح نگار ہیں، دونوں کے بیچ کا فرق بتلائیے؟

☆☆ میں سمجھتا ہوں کہ مزاح اور طنز دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ طنز میں جب تک مزاح کی شوخی نہ ہو وہ موثر نہیں ہوسکتا۔ اردو میں تو طنز و مزاح کو ہمیشہ ایک ساتھ ہی لکھا اور برتا جاتا ہے۔ طنز اور مزاح کے فرق کو پیش کرنے کے لئے میں ایک واقعہ سنانا چاہوں گا۔ 1985ء میں جب حیدرآباد میں طنز و مزاح نگاروں کی عالمی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا تو اس میں شرکت کے لئے میں، فکر تونسوی اور پنجابی کے مشہور ادیب تارا سنگھ کامل بذریعہ ٹرین دہلی سے حیدرآباد آرہے تھے۔ قاضی پیٹ کے اسٹیشن پر جب گاڑی رُکی تو ہمارے کمپارٹمنٹ میں ایک بھکاری بھی آیا اور ہم لوگوں سے بھیک کا مطالبہ کرنے لگا۔ اس پر تارا سنگھ کامل نے بھکاری سے کہا: ''آگے جاؤ، آگے جاؤ''۔

بھکاری پھر بھی وہاں سے نہیں ٹلا اور بدستور بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد تارا سنگھ کامل نے بڑے غصہ سے بھکاری سے کہا: ''بڑے میاں! میں پہلے ہی تمہیں کہہ چکا ہوں کہ آگے جاؤ، لیکن اس کے باوجود تم یہاں ڈٹے ہوئے ہو''۔

اس پر بھکاری نے بڑی ویران اور اُداس نظروں کے ساتھ تارا سنگھ کامل کو دیکھتے ہوئے کہا: ''حضور! آگے جاکر کیا کروں۔ آگے بھی تو آپ ہی کی طرح کے ننگے بھوکے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں''۔

بھکاری کے اس برجستہ تبصرہ پر میں نے تو زوردار قہقہہ لگایا مگر خلاف توقع اس تبصرہ کو سن کر فکر تونسوی، جو خود بھی بہت بڑے طنز نگار تھے اچانک رونے لگ گئے۔ اس واقعہ سے آپ کو یہ سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی کہ کوئی بات کسی کے لئے مزاحیہ ہوتی ہے اور کسی کے لئے اُس میں طنز پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس مثال کے ذریعہ آپ طنز اور مزاح کے فرق کو سمجھ سکتے ہیں۔

☆ مزاح اور مبالغہ لازم و ملزوم ہیں کیا؟

☆☆ میں مزاح میں مبالغہ کو ضروری سمجھتا ہوں لیکن اتنا بھی نہیں کہ داڑھی سے مونچھیں بڑی ہوجائیں۔ ایک مزاح نگار جب کسی موضوع پر قلم اُٹھاتا ہے تو وہ نہ صرف اِس موضوع کے خوشگوار پہلوؤں کی نشاندہی کرتا ہے بلکہ اس میں رنگ آمیزی بھی کرتا چلا جاتا ہے۔ تاہم میں اس بات کا قائل ہوں کہ مبالغہ کو اپنی حد میں رہنا چاہئے۔ مبالغہ آمیزی کے حوالے سے اس وقت مجھے اردو کی مشہور استاد پروفیسر زینت ساجدہ کا ایک تبصرہ یاد آرہا ہے جس کا تعلق خود میرے ایک مزاحیہ مضمون سے تھا۔ انھوں نے اس مضمون کے بارے میں مجھ سے کہا تھا ''میاں! تم زیب داستان کے لئے مضمون میں بعض ایسی تفصیلات بھی شامل کرلیتے ہو جن کی بناء پر داستان چھوٹی اور زیب بڑا ہوجاتا ہے۔ زیب داستاں کو زیب داستاں کی حد ہی میں رکھا کرو تو اچھا ہے''۔

☆ اگر مشتاق احمد یوسفی کا یہ بیان درست ہے کہ آپ کی کامیابی کے تین گُر ہیں یعنی تکرار سے پرہیز، تروتازگی اور قلم برداشتہ لکھنا مگر ہم آپ کے منہ سے آپ کی تین خامیاں سننا چاہیں گے؟

☆☆ جہاں تک مشتاق احمد یوسفی صاحب کے اس بیان کا تعلق ہے اس کے بارے میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خود یوسفی صاحب نے ان باتوں کا ذکر واشنگٹن کی ایک ملاقات میں مجھ سے کیا تھا۔ رہی بات اپنی تین خامیوں کے ذکر کی تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ مجھ میں اتنی خامیاں ہیں کہ کس خامی کا ذکر کروں۔ کوئی ایک ہو تو بتاؤں بھی۔ تاہم آپ کی تسلی اور تشفی کے لئے اپنی تین خامیوں کا ذکر کئے دیتا ہوں۔

1) پہلی خامی یہ کہ میں اردو کے جلسوں میں ہمیشہ مقررہ وقت پر پہنچ جاتا ہوں جب کہ وہاں کوئی بھی موجود نہیں ہوتا۔

2) دوسری خامی یہ کہ میں ہمیشہ غلط موقع پر صحیح رائے دیدیتا ہوں۔

3) تیسری خامی یہ کہ میں ہمیشہ اپنا مذاق خود اُڑاتا ہوں تاکہ غیروں کو میرا

مذاق اُڑانے کا نادر موقع نصیب نہ ہو۔

☆ اس رائے سے کہاں تک اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ آپ نے طنز کی گہرائی بردارِ بزرگ ابراہیم جلیس اور اسلوب کی چاشنی ابن انشا سے مستعار لی ہے؟

☆☆ میرے بارے میں مندرجہ بالا خیالات کا اظہار مشفق خواجہ نے بہت پہلے اپنے ایک کالم میں کیا تھا۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ میں نے طنز کی گہرائی کس سے لی اور اسلوب کی چاشنی کس سے لی ہے۔ تاہم میں ابراہیم جلیس اور ابن انشاء دونوں کا بیحد احترام کرتا ہوں۔ ابراہیم جلیس تو خیر میرے بڑے بھائی ہی تھے اور میں بچپن ہی سے اُن کی تحریریں پڑھتا اور لطف اندوز ہوتا رہا ہوں۔ تاہم ابن انشاء میرے بے حد پسندیدہ مزاح نگار ہیں۔ یوسفی نے اُن کے بارے میں لکھا تھا کہ ابن انشاء کا اسلوب نا قابلِ تقلید ہے۔ میں اپنے آپ کو اردو کا ایک ادنیٰ مزاح نگار سمجھتا ہوں، اور کیسے یہ دعویٰ کرسکتا ہوں کہ میں نے اسلوب کی چاشنی ابن انشاء سے مستعار لی ہے۔ ابن انشاء بہرحال ابن انشاء ہیں۔ آج بھی میں کبھی اپنے آپ کو مضمحل اور پژمردہ سمجھنے لگتا ہوں تو فوراً ابن انشاء کی کوئی کتاب اُٹھالیتا ہوں اور پڑھنا شروع کردیتا ہوں اور نتیجۃً خوشگوار اور خاطر خواہ برآمد ہوتا ہے۔

☆ مرزا فرحت اللہ بیگ سے استفادہ کی صورت کیا تھی؟

☆☆ مرزا فرحت اللہ بیگ کی تحریروں کا میں گرویدہ ہوں مگر کبھی ان سے راست استفادہ کی نوبت نہیں آئی۔ تاہم یہ اعتراف ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ مرزا فرحت اللہ بیگ اور اُن کے رشتہ کے بھائی مرزا حسین احمد بیگ نے میرے دو بڑے بھائیوں محبوب حسین جگر اور ابراہیم جلیس کی ہمیشہ ہمت افزائی کی۔ یوں سمجھئے کہ میں نے بالواسطہ طور پر فرحت اللہ بیگ سے استفادہ کیا ہے۔ وہ بہت بڑے انشاء پرداز اور خاکہ نگار تھے۔ مجھے یہ سعادت نصیب نہ ہوسکی کہ میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا کیوں کہ اُس وقت میں خود طفلِ مکتب تھا۔

☆ تقسیم ہند کے وقت بہت سے اداروں اور خاندانوں نے دونوں میدان مارنے کی خواہش میں اِدھر ہم اُدھر تم کی ترکیب استعمال کی۔ مزاح کے میدان کے دو شہہ سواروں ابراہیم جلیس اور مجتبیٰ حسین نے بھی یہ ہی ترکیب تو نہیں اپنائی؟

☆☆ دو بھائیوں کی تقسیم میں کبھی کسی منصوبہ بند سوچ کا دخل نہیں رہا۔ ابراہیم جلیس مجھ سے عمر میں 13 برس بڑے تھے اور 1948ء میں جن ہنگامی حالات میں ابراہیم جلیس پاکستان گئے اُس وقت میں مڈل اسکول کا طالب علم تھا۔ ابراہیم جلیس کو حیدرآباد پر پولیس ایکشن کے پس منظر میں اچانک پاکستان جانا پڑ گیا۔ جن حالات میں وہ پاکستان گئے اُن کا ذکر انھوں نے اپنی مشہور کتاب ''دو ملک ایک کہانی'' میں کیا ہے۔ یہ کتاب 1950ء میں لاہور سے شائع ہوئی تھی اور اسے ایک دستاویزی حیثیت حاصل ہے۔ میں نے ابراہیم جلیس کے پاکستان چلے جانے کے تقریباً 14 برس بعد مزاح نگاری شروع کی۔

☆ اس رائے میں کس حد تک صداقت ہے کہ آپ تحریر کو دلچسپ بنانے کے لئے واقعات اور افواہ میں فرق محسوس نہیں کرتے؟

☆☆ میں واقعات کو دلچسپ تو ضرور بناتا ہوں لیکن واقعات کو واقعات ہی رہنے دیتا ہوں اور انھیں افواہ بننے کا موقع عطا نہیں کرتا۔

☆ اکثر ادباء و شعراء کا کوئی نہ کوئی اسکول آف تھاٹ بھی ہوا کرتا ہے۔ مزاح نگاری میں ایسی کوئی روایت ہے تو اپنی نسبت آگاہ کیجئے؟

☆☆ میں یہ مانتا ہوں کہ پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی ہمارے ادب کے نہ صرف اسکول آف تھاٹ بلکہ ہائی اسکول آف تھاٹ بھی ہیں۔ دونوں کا اسلوب مختلف اور منفرد ہے۔ اردو کے سب سے بڑے مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کے بارے میں میری یہ رائے ہے کہ وہ پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی دونوں کا حسین امتزاج ہیں بلکہ میں تو مشتاق احمد یوسفی کو مزاح نگاری کا اسکول آف تھاٹ نہیں بلکہ مزاح نگاری کی یونیورسٹی سمجھتا ہوں۔ میں اپنے مزاج کے مطابق اپنے آپ کو پطرس بخاری کے اسکول آف تھاٹ سے قریب پاتا ہوں۔

☆ مزاح نگاروں کو ادب میں دوسرے درجہ کا مسافر کیوں گردانا جاتا ہے؟

☆☆ یہ سوال اتنی مرتبہ پوچھا گیا ہے کہ اس کے جواب میں خاموشی کو اختیار کرنا زیادہ مناسب لگتا ہے۔ ہندوستان کے مشہور مزاح نگار یوسف ناظم نے ایک بار اس سوال کے جواب میں کہا تھا ''مزاح نگاری یقیناً دوسرے درجہ کا ادب ہے کیوں کہ ہمارے یہاں پہلے درجہ کا ادب لکھا ہی نہیں جاتا''۔ ایک ناقد نے مذاق مذاق میں میرے بارے میں یہ جملہ بھی لکھا تھا ''مجتبیٰ حسین نہ صرف پہلے درجہ کے بلکہ پرلے درجہ کے مزاح نگار بھی ہیں''۔ میرے دوست مشہور شاعر اور ناقد مظہر امام نے کہیں لکھا تھا کہ مزاحیہ ادب کو پہلے ادب ہونا چاہئے اور بعد میں مزاحیہ وغیرہ ہونا چاہئے۔

☆ کوئی ایسا واقعہ بتلایئے جب آپ کو مزاح نگار ہونے پر شرمندگی کا سامنا رہا ہو؟

☆☆ ایسا تو کبھی نہیں ہوا لیکن کبھی کبھار اس بات کا افسوس ہوتا ہے کہ مزاح نگار ہونے کی وجہ سے لوگ میری باتوں کو سنجیدگی سے نہیں لیتے۔

☆ مزاح کے وہ کون سے گُر ہیں جن میں آپ کو نہ صرف دسترس بلکہ کمال حاصل ہے؟

☆☆ ان گُروں کے بارے میں کچھ اظہار خیال کرنے سے قاصر ہوں۔ کبھی کوئی اچھا جملہ ذہن میں آجائے تو اس کو لیکر میں ایک پورا مضمون لکھ دیتا ہوں۔ دلچسپ واقعات بھی میرے مزاح کے عنوانات بنتے ہیں۔ مزاحیہ تحریر کو رواں دواں اور شگفتہ ہونا چاہئے۔ شگفتگی نہ ہو تو قارئین مزاحیہ مضمون پر نہیں بلکہ مزاح نگار پر ہنسنے لگ جاتے ہیں۔

☆ یہ تاثر بھی بہت پختہ ہے کہ دوسروں کو ہنسانے والا اندر سے دکھی ہوتا ہے۔آپ کے ہاں صورت حال کیا ہے؟

☆☆ میں نے بہت تفصیل سے اپنے جوابات میں واضح کیا ہے کہ میں بنیادی طور پر ایک دُکھی انسان ہوں۔ یہی بات میں انگریزی اور اردو کے بہت سے مزاح نگاروں کے بارے میں بھی کہہ سکتا ہوں۔ میں نام نہیں لینا چاہتا مگر جو لوگ مزاح نگاروں کی شخصی زندگی سے واقف ہیں وہ اس حقیقت سے یقیناً آشنا ہوں گے۔ مزاح نگاری کے اتنے لمبے سفر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ سچا مزاح وہی ہے جو زندگی کی تلخیوں اور غموں کو اپنے اندر چھپا لینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

☆ عزیز از جان صاحبزادی کے انتقال کے فوری بعد مزاحیہ کالم کس دل گردے کے تحت تحریر کیا؟

☆☆ یہ سانحہ نصف صدی پہلے پیش آیا تھا۔ مجھے اپنی کالم نگاری کو شروع کئے ہوئے دو برس بھی نہیں بیتے تھے کہ میری 6 سالہ بیٹی کا انتقال ہوگیا۔ صبح میں اپنی بیٹی کی تدفین کے فرائض انجام دینے کے بعد گھر پہونچا تو احساس ہوا کہ مجھے تو روزانہ کالم نگاری کرنی ہے۔ میں نے سوچا کہ میری شخصی زندگی کا دکھ میرے قارئین کیوں برداشت کریں۔ اپنے فرض کو پورا کرنے کی خاطر میں کالم لکھنے کیلئے بیٹھ گیا اور مجھ میں اپنے آپ ہی کوئی ایسی کیفیت پیدا ہوئی جس کے زیر اثر میں نے مزاحیہ کالم لکھ دیا۔ اُس دن مجھے پھر احساس ہوا کہ اپنے شخصی غم کو چھپانا ہی اچھی مزاح نگاری کا بنیادی وصف ہے۔

☆ ''یہ قصہ ہے جب کا'' لکھنے کے دوران گھڑ سواری کی نوبت کیوں آن پڑی اور اُس شوق کی کیا قیمت چکائی؟

☆☆ اس بات کا ذکر مشفق محترم خواجہ حسن ثانی نظامی نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ گھڑ سواری کا مجھے بچپن ہی سے شوق رہا ہے۔ والد صاحب خود گھڑ سواری کے شوقین تھے اور گھر پر ہمیشہ دو تین گھوڑے ضرور رکھے جاتے تھے۔ خواجہ حسن ثانی صاحب کو اس بات کا علم تھا کہ گھوڑوں کی ریس کے دوران میں ایک بار اپنے گھوڑے سے گر گیا تھا اور دوسرے گھوڑے میرے پاؤں کو روندتے ہوئے چلے گئے تھے۔ اس کا اثر نوجوانی میں تو محسوس نہیں ہوا البتہ 60 برس کی عمر کے بعد میرے گھٹنے میں شدید درد رہنے لگا اور جس کے نتیجہ میں 2000ء میں مجھے اپنے گھٹنوں کی تبدیلی کا آپریشن کرانا پڑا جو فیل ہوگیا۔ اسے ٹھیک کرانے کی کوشش کی تو یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ چنانچہ 2000ء سے میری نقل و حرکت بہت محدود ہوگئی ہے۔ خواجہ حسن ثانی صاحب غالباً اس ٹریجیڈی کی طرف اشارہ کرنا چاہتے تھے۔

☆ سنجیدہ ادب جب تک تنقید سے نہ گذرے سند نہیں پاتا مزاح کے بارے میں صورت حال کیا ہے؟

☆☆ مجھے ہمیشہ سے یہ شکایت رہی کہ ہمارے یہاں افسانے کے ناقد ہیں، ناول کے ناقد ہیں اور شاعری کے بھی ناقد ہیں مگر مزاح کے ناقد قال قال ہی نظر آتے ہیں۔ بیشک وزیر آغا نے طنز و مزاح کے موضوع پر بھرپور کتاب لکھی اور اس کے بعد رؤف پاریکھ، ڈاکٹر مشتاق احمد ورک اور نامی انصاری نے بھی مزاح نگاری کا تنقیدی جائزہ لیا۔ میرا ایسا خیال ہے کہ طنز و مزاح کے زیادہ سے زیادہ ناقد پیدا ہوں تو طنز و مزاح کی گتھیوں کو سلجھانے اور انھیں پرکھنے کا مزید موقع مل جائے گا۔

☆ شاعر، ادیب (بالخصوص اردو والے) ہتھیلی پر دل لیے پھرتے ہیں، مزاح نگاروں کی واردات کیا ہوا کرتی ہے؟

☆☆ مزاح نگار بنیادی طور پر نہایت ہوشیار، چالاک اور چوکس انسان ہوتا ہے۔ اسی لئے ایسی وارداتوں سے اپنے آپ کو دور بھی رکھتا ہے

☆ اوروں کو چھوڑیئے اپنے طریقہ کار کی نسبت کچھ بتلایئے؟

☆☆ میں نے ہمیشہ اپنے دل کو اپنے سینہ میں رکھا اور اُسے کبھی ہتھیلی پر رکھنے کی بچکانہ کوشش نہیں کی۔

☆ ایک زمانے میں اردو شاعری میں ہجو کا رواج عام تھا۔ نثر بالخصوص مزاحیہ نثر میں اس طرح کی کوئی بدعت پائی جاتی ہے کیا؟

☆☆ مزاحیہ نثر میں ہجو کی کوئی روایت مجھے نظر نہیں آتی۔

☆ آپ کو بنیادی طور پر افسانہ نویس کہنے والے اصل میں کیا کہنا چاہتے ہیں؟

☆☆ میں یہ مانتا ہوں کہ میرے مضامین میں واقعات کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور میں ایک قصہ گو کے انداز میں اپنا مضمون جاری رکھتا ہوں۔ مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ میرے بعض مضامین جیسے ''ریل منتری مسافر بن گئے''، ''سند باد جہازی کا سفر نامہ'' اور ''ہماری بے مکانی دیکھتے جاؤ'' وغیرہ افسانوی انداز کے حامل ہیں کیونکہ اُن میں باضابطہ پلاٹ بھی ہوتا ہے اور کلائمکس بھی پایا جاتا ہے۔ یہی بات آپ کو شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی، شفیق الرحمٰن کے یہاں بھی ملے گی۔ اگر کوئی مجھے افسانہ نگار سمجھتا ہے تو یہ اُس کی عنایت ہے۔

☆ اس رائے میں کس قدر حقیقت ہے کہ دہلی کی زندہ ادبی روایت آپ کے دم قدم سے قائم ہوئی؟

☆☆ مجھے یہ اعتراف ہے کہ میں جب تک حیدرآباد میں رہا طنز و مزاح کے مختلف جلسوں کو آراستہ کرتا رہا۔ زندہ دلان حیدرآباد جیسی تنظیم سے میرا تعلق رہا اور میں نے ہندوستان میں پہلی بار 1966ء میں اردو کے طنز و مزاح نگاروں کی پہلی کل ہند کانفرنس حیدرآباد میں منعقد کی تھی۔ اس کے علاوہ زندہ دلان حیدرآباد کے سالانہ اجتماعات بھی حیدرآباد میں منعقد ہونے لگے۔ یہاں تک کہ حیدرآباد کو اردو طنز و مزاح کی راجدھانی کہا جانے لگا۔ 1972ء میں جب میں دہلی گیا تو میں نے وہاں بھی طنز و مزاح کی کئی محفلیں منعقد کیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ دہلی کی ادبی روایت میرے دم سے قائم ہوئی۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ دہلی کے

ادبی ماحول میں ایک ہلچل سی ضرور پیدا ہوگئی۔

☆ جو لوگ آپ کو پطرس بخاری کی کرسی کی طرف بڑھتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے اُن کی خواہش کی تکمیل کس مرحلے میں ہے؟

☆☆ میرے دوست اور اردو کے مشہور ناقد، ناول نگار، دانشور اور شاعر شمس الرحمٰن فاروقی نے یہ خواہش کی تھی کہ میں پطرس بخاری کی کرسی کی طرف بڑھوں۔ مجھ میں یہ تاب ہے نہ مجال کہ پطرس بخاری کی اقتدار کی کرسی کی طرف آنکھ بھی اُٹھا کر دیکھ سکوں۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق اردو طنز و مزاح نگاری کی تھوڑی بہت خدمت کی، بس یہ بات میرے لئے کافی ہے۔

☆ ان گنت فرمائشی مضامین اور پیش لفظ کی نسبت آپ کے احساسات کیا ہیں؟

☆☆ میں شخصی طور پر فرمائشی مضامین اور کتابوں کے پیش لفظ لکھنے کو اچھی بات نہیں سمجھتا۔ لیکن حالات کے ہاتھوں کبھی کبھی مجھے مجبور بھی ہو جانا پڑتا ہے۔

☆ سنجیدہ ادب تو اکثر اہل قلم خود ہی لکھتے، چھاپتے اور بانٹتے ہیں، مزاح کی صورت حال کیا ہے؟

☆☆ میں سمجھتا ہوں کہ مزاحیہ تحریریں اچھی ہوں تو اُن کے قارئین بھی بڑی آسانی سے دستیاب ہو جاتے ہیں۔ اپنی حد تک یہ میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ابتدائی ایک کتاب کو چھوڑ کر اپنی ساری کتابیں خود سے نہیں چھاپیں۔ ہمیشہ کسی نہ کسی پبلشر نے میری کتابیں بڑے شوق و اہتمام سے شائع کیں اور بیشتر کتابوں کے کئی ایڈیشن بھی شائع ہوئے۔

☆ آپ کے عصر کے ایسے مزاح نگار جن کے سپرد مزاح کا مستقبل کیا جا سکے؟

☆☆ مجھے شخصی طور پر طنز و مزاح کا مستقبل تابناک نظر نہیں آ رہا ہے۔ آج کی بھاگتی دوڑتی زندگی میں نہ وہ فراغتیں ہیں اور نہ وہ فرصتیں ہیں اور نہ وہ مجلسیں ہیں جن کے زیر اثر طنز و مزاح کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ آج انسان ایک کاروباری زندگی گذار رہا ہے۔ اور اس کوشش میں وہ خود غرض اور لالچی بنتا چلا جا رہا ہے۔ میں نے ایک بار اپنے دوست کو ایک لطیفہ سنایا تو اُس نے بیچارگی کے عالم میں کہا ''یار! اس وقت میں بہت مصروف ہوں، گھر جا کر تمہارے لطیفے پر ضرور ہنسوں گا''۔ ہمارے نئے لکھنے والے کلاسیکی ادب سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ طنز و مزاح نگاری کا سارا کھیل زبان و بیان کی برجستگی اور پختگی میں ہوتا ہے۔ جب تک ہم اپنے ماضی کی روایات سے اپنا رشتہ نہیں جوڑیں گے تب تک طنز و مزاح کا مستقبل بھی خطرہ میں رہے گا۔

☆ خود کو دہرانے کا خوف جب ستاتا ہے تو اُس سے نجات کے لئے کیا طریقہ استعمال کرتے ہیں؟

☆☆ میں ایسی صورت میں مشتاق احمد یوسفی یا ابن انشاء کی تحریریں پڑھ لیتا ہوں تا کہ مجھ میں نیا پن اور شگفتگی پیدا ہو۔

☆ اردو ادب نے آپ کو اور آپ نے اردو ادب کو وہ سب کچھ دیا جو بس میں تھا یا نہیں اس کے باوجود کوئی خواہش، ارادے یا منصوبے ہیں جو آپ کی دسترس میں نہ آ سکے ہوں؟

☆☆ میں نے اپنی بساط کے مطابق حتی الامکان بے لوث انداز میں پوری نیک نیتی کے ساتھ طنز و مزاح نگاری کی اور مجھے کسی بات کا ملال نہیں ہے۔ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے قارئین کی جو محبتیں مجھے حاصل ہوئیں وہ میرا سب سے قیمتی اثاثہ ہے۔

مجتبیٰ حسین بحیثیت خاکہ نگار

بے شک اُردو نثر میں مزاح نگاروں کی کمی ہے لیکن خاکہ نگاران سے بھی کم ہیں۔ بوالہوسوں کو شمار میں نہ لیجئے تو مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، شاہد احمد دہلوی، منٹو اور محمد طفیل جیسے چند ناموں کے بعد خاکہ نگاروں کی تلاش میں ہمیں محققین سے معاونت طلب کرنی پڑتی ہے۔ فنکار کی ایک خاص امیج بنا کر اس کے ساتھ کچھ روایات منسوب کر دینے کے لاکھ فائدے ہوں لیکن ایک بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ لکھنے والا اپنی اسی مقبول عام امیج کو برقرار رکھنے کے لیے ان مخصوص و محدود روایات کا اسیر ہو جاتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مجتبیٰ حسین ایک اچھے مزاح نگار ہیں لیکن ان کی خاکہ نگاری بھی کچھ کم اہمیت کی حامل نہیں ہے۔

مجتبیٰ عام زندگی میں جتنے سادہ لوح ہیں خاکہ نگاری میں اتنے ہی چالاک۔ مدح بالذم اور تنقیص نما توصیف کے ایسے ایسے گر انھیں یاد ہیں کہ وہ آپ کے مُنہ پر بات کہہ جائیں اور کئی دن بعد آپ پر یہ عقدہ کھلے کہ حضرت نے آپ کی کسی خوبی نہیں خامی کو اُجاگر کیا تھا۔ دراصل فی البدیہہ مزاحیہ مضامین لکھ لکھ کر وہ اتنے چابکدست ہو گئے ہیں کہ جب اُن کا چابک ممدوح پر پڑتا ہے تو وہ اسے سمند شوق پر تازیانہ تصور کرتا ہے۔ اس باب میں وہ کسی کے ساتھ مروّت روا نہیں رکھتے۔ لطف یہ ہے کہ بحیثیت مزاح نگار کسی شخصیت کے ناہموار پہلو پہلی ہی نگاہ میں اُن پر منکشف ہو جاتے ہیں۔ اور وہ کوشش یہ کرتے ہیں کہ ان کا قاری بھی پہلی نظر میں ہی متعلقہ شخصیت کی ناہمواری سے واقف ہو جائے۔ یہ مہم وہ بڑی معصومیت کے ساتھ خاکے کے عنوان کی مدد سے سر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر مظفر حنفی (دہلی، بھارت)

تذکرہ مجتبائیہ فرحتیہ

خواجہ حسن ثانی نظامی

(دہلی، بھارت)

اب سے دور، ۱۹۴۷ء کے فسادات کی آندھی میں اللہ جانے کتنے دہلی والے اُڑ گئے اور کہاں سے کہاں جا پڑے۔ رسالہ 'ساقی' کے اڈیٹر اور ڈپٹی نذیر احمد صاحب علیہ الرحمہ جیسے نامور دادا کے پوتے شاہد احمد دہلوی بھی کراچی میں پائے گئے۔ مگر اپنے پرانے نام کے نئے اوتار کے ساتھ! یعنی ایس۔اے دہلوی کی نقاب ڈال کر۔ مدتوں بعد دہلی آئے بھی تو ایسے بے آہٹ اور چپ چپاتے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ مجھے سن گن خود کراچی والوں سے لگی۔ فوراً اپنے مرحوم چھوٹے بھائی خواجہ مہدی نظامی کو دوڑایا کہ پتا نشان نکالو۔ سب سے پہلے کتب خانہ نذیریہ میں جانا۔ شاہد صاحب کے بھائی مسلم نظامی صاحب اب وہاں کم بیٹھتے ہیں۔ مگر دکان میں کسی نہ کسی کو تو خبر ہوگی ہی کہ شاہد صاحب خیر سے کہاں اُترے ہیں۔ دکان والوں نے واقعی رہبری فرمائی مگر صرف اس قدر کہ چتلی قبر کے پاس فلاں گلی میں ٹھہرے ہیں۔ میزبان کے نام کا علم نہیں۔ مکان کا نشان یہ ہے کہ دروازے پر ایک بکرا بندھا ہوا ہے!

مہدی میاں نے بکرے والا مکان تو ڈھونڈ لیا مگر وہاں پہنچ کر کیا دیکھتے ہیں کہ ہر مکان کے سامنے بکرے موجود ہیں۔ بقرعید کا قرب تھا۔ آخر اللہ کا نام لے کر اور بکرے کے سینگوں سے بچ کر پہلے مکان ہی پر دستک دے ڈالی اور جواب میں خیر سے شاہد صاحب خود بہ نفس نفیس برآمد ہوئے۔ پتے کا لطیفہ سنا تو سنجیدگی سے بولے۔ میاں بتانے والے نے پتہ تو خیر ٹھیک ہی بتایا۔ بس یہ کہنا بھول گیا کہ مکان میں ایک نیم کا درخت بھی ہے اور اس پر ایک کوّا بیٹھا ہے!

کچھ لوگ تو کچھ کچھ جانتے ہیں۔ باقی بالکل نہیں جانتے کہ شاہد احمد دہلوی نے دادا کے جس گھر میں ہوش سنبھالا تھا وہیں برسوں پہلے اردو کے مشہور مزاح نگار مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی نے بھی ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا۔ مرزا صاحب نے جب اپنی خوشبو سے تیسری پیڑھی کے شاہد احمد دہلوی تک کو مہکائے رکھا تو حیدرآباد سدھارے اور گلبرگہ شریف، حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی نگری میں سشن جج کی کرسی سنبھالنے کے بعد وہاں کی فضا کو بھی ادب آلود کیا۔ چنانچہ گلبرگہ شریف، جس نے حضرت خواجہ کی ایک سو پانچ یادگار کتابوں کے بعد لمبی چادر تان لی تھی، ایک دفعہ، پھر انگڑائی لی۔ لکھنے والوں کا جنم ہوا۔ مرزا صاحب کی ادبی چھتر چھاؤں ماحول مہیّا کرنے کے لیے پہلے سے موجود تھی۔ وہاں کے نو بھائیوں میں سے تین نے فوراً قلم سنبھال کر ان تین بندوق برداروں کی حیثیت اختیار کر لی جنہیں لوگ Three Musketeers کے نام سے جان سکتے ہیں یعنی محبوب حسین جگر۔ ابراہیم جلیس اور میرے آج کے ممدوح یادش بخیر مجتبیٰ حسین مدظلہ۔ بڑے دونوں بھائیوں نے بس مرزا صاحب کی چھتری سے فائدہ اٹھانا کافی سمجھا۔ محبوب حسین صاحب کا تخلص ''جگر'' مرزا صاحب کا عطیہ ہے۔ مگر مجتبیٰ حسین صاحب کے بارے میں تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے مرزا صاحب کے خاص الخاص سلسلۂ عالیہ فرحتیہ میں نہ صرف باقاعدہ بیعت کی بلکہ خلافت بھی پائی اور اپنے مجاز ہونے کو فرشتوں کے رجسٹریشن آفس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے درج کرا کے کسی نہ کسی طرح پیٹنٹ بھی کرا لیا بلکہ

پدر نہ تواند پسر تمام کند

پر بھی عمل کر دکھایا۔ روحانی باپ نے تو سو پچاس مضمون، چند کتابیں لکھ کر چھٹی کی۔ بس جی کرتے رہے! مگر مجتبیٰ صاحب واقعی مرزا صاحب کے روحانی فرزند رشید بن کر ماشاء اللہ لکھے چلے جاتے ہیں۔ مضامین اور کتابوں کے ڈھیر لگا دیے۔ حد ہے کہ بالکل مشین کی طرح جی چاہا نہ چاہا معیاری مال بناتے رہتے ہیں۔ فرمایشی مزاح پارے ڈھالتے وقت آورد کو کبھی پاس نہیں پھٹکنے دیتے۔ جب دیکھو جہاں دیکھو آمد ہی آمد۔

انشاءاللہ خاں انشا نے ہار تھک کر لطیفے سنانے سے توبہ کر لی تھی۔ مجتبیٰ صاحب نے نہ کبھی کسی سے مدد مانگی نہ کبھی کسی کی فرمایش ٹالی۔ تازہ بتازہ۔ نو بہ نو۔ ہر طرح کا طنز اور مزاح سدا حاضر اور موجود! حالانکہ بعض بعض موقعے ہر مزاح اور طنز نگار کی زندگی میں ضرور ایسے آتے ہوں گے، خاص کر ان ادیبوں کی زندگی میں جن کی روزی روٹی ان کے فن سے جڑی ہوئی ہو کہ دلچسپ تحریر فراہم کرنے کی جگہ فرمایش کرنے والے کو سولی پر چڑھا دینے کو جی چاہے۔ مگر مجتبیٰ صاحب نے انسانی عظمت کی رکھوالی اس طرح بھی کی کہ رات کو لخت جگر پیاری بیٹی اللہ کو پیاری ہوئی اور صبح انہوں نے اخبار کا مزاحیہ کالم لکھنے کا زہر پیا۔ یہ روایت بڑے صوفیوں جیسی روایت ہے۔ مجتبیٰ حسین صاحب نے اچھا کیا کہ اس سب سے اونچی روایت کا حق جی جان سے ادا کیا۔

مجتبیٰ صاحب ادب کے میدان کے جیسے شہسوار ہیں، اس پر تو یقین سے آگے تک لوگ جانے کو بلا جبر و اکراہ اور بقائمی ہوش و حواس تیار ہیں مگر یہ اطلاع ملنے پر میرے تو واقعی ہوش اُڑ گئے اور یقین تو بالکل نہیں آیا کہ انہوں نے واقعی ''یہ قصہ ہے جب کا'' کے زمانے میں بالکل اصلی گھوڑے کی سواری بھی کی تھی۔ مگر یہ کمال بھی مجتبیٰ صاحب ہی کر کے دکھا سکتے تھے کہ انہوں نے ثبوت کے بطور بوقت ضرور کام آنے کے لیے اپنے گھٹنے کی اس ہڈی کو بصد احترام سنبھال کر رکھا جو گھڑسواری کے دوران واقعی ماؤف ہو چکی تھی مگر پھر انہوں نے میدان جیتنے کے لیے یہ ترپ چال چلی کہ ملک کے نامور وزیر اعظم عزت مآب اٹل بہاری باجپئی کے ساتھ ساتھ چپنی کی ہڈی کا آپریشن کرا لیا اور اس کو نا کام کرانے سے بھی نہیں چوکے۔ خوب خوب تکلیف اٹھائی۔ تا کہ کہہ سکیں کہ گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں اور پھر دوبارہ سوار ہو کر ایک اور میدان جیتنے کے لیے کمر کس لی

ہے۔اللہ نظر بد سے بچائے!

ابن انشا علیہ الرحمہ نے اردو کی مزاحیہ ڈکشنری تیار کی تھی۔اس میں لفظ ''دائرے'' کا احوال کچھ اس طرح تھا ''دائرہ''۔''دائرہ اسلام'' اسی سے نکلا ہے۔ پہلے لوگ اس میں داخل کیے جاتے تھے۔اب نکالے جاتے ہیں! طنز و مزاح کو بھی زاہدان خشک نے بڑی حد تک دائرہ اسلام سے بارہ پتھر باہر اور دور رکھا تھا۔مجتبیٰ حسین صاحب کے سر یہ سہرا بھی ہے کہ وہ اسے دوبارہ مشرف بہ اسلام کرنے میں کامیاب ہوئے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی ان کی کسی تحریر کو شوخ و شنگ ہونے کے باوجود غیر شایستہ پایا ہو۔خوش طبعی کے حوالے سے جو احادیث ہمیں نظر آتی ہیں وہ صاف بتاتی ہیں کہ شرافت و شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے تو طنز اور مزاح دونوں واقعی مہذب مسلمان بن کر بھی نظر آسکتے ہیں۔ثقہ بھی باوزن بھی۔ مزاح کا یہ رنگ مجتبیٰ صاحب کی تحریروں میں کہیں نہیں دیکھا کہ:

رات وہ بولے مجھ سے ہنس کر چاہ میاں کچھ کھیل نہیں
میں ہوں ہنسوڑ اور تو ہے مقطع میرا تیرا میل نہیں

''ہنسوڑ'' قماش کا کوئی لفظ آپ مجتبیٰ صاحب کے ہاں کہیں سے نکال کر نہیں دکھا سکیں گے کہ شعر کو مدرسے میں لے جانے کا گمان گزرے۔شاید یہ ثمرہ گلبرگہ اور حیدرآباد کی شایستگی کا ہے۔ میں نے یہ بات اس لیے کہی کہ میں نے اس حیدرآباد کو خود اپنی آنکھوں دیکھا تھا جس میں دنیا بھر کے چنندہ لوگ کھنچے چلے آتے تھے۔ اصفہان نصف جہان ہوگا جب ہوگا۔ میں نے تو حیدرآباد کو نصف جہان کی طرح نہیں پورے جہان کی طرح دیکھا تھا اور اب اس طرح بھی دیکھ رہا ہوں کہ پورا جہان نصف حیدرآباد کم از کم میرے لیے تو ہے۔خواجہ بندہ نواز۔خواجہ دکن ہیں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ

کس چیز کی کمی ہے خواجہ تری گلی میں!

دنیا کا کون سا حصہ ہے جہاں حیدرآبادیوں کی بستیاں نہیں ہیں اور کیسے حیدرآبادیوں کی بستیاں؟۔ یہ منعم خاں کہیں بھی مسافر اور غریب نہیں ہوتے۔ جہاں جاتے ہیں خیمہ لگاتے اور بارگاہ بنا ڈالتے ہیں! گلبرگہ بھی دراصل حیدرآباد ہی تھا مگر ابراہیم جلیس کو کراچی جانا پڑا۔مجتبیٰ صاحب نے دہلی میں ڈیرا ڈالا۔ان کے والد نے اگلے وقتوں میں گلبرگے کے ایوان شاہی میں نظام حیدرآباد کو مہمان کیا تھا اور اعلا حضرت کے خاص قلم سے دو صفحے کا تعریف نامہ پایا تھا۔مجتبیٰ صاحب بظاہر دہلی کے مہمان ہیں۔ یہاں لٹے پٹے دلّی والے تو کیا کسی ایوان شاہی میں ان کی پذیرائی کرتے۔لیکن ایک ایوان شاہی ایسا ہے جو خود انہوں نے اپنے قلم سے تعمیر کر رکھا ہے۔اس میں دور دور سے سرو قد کھڑے ہو کر آداب بجالانے والے نہ سہی، یہ خود اپنے ایوان کو جاپان تک وسیع کر کے ان بوٹا قامتوں کے مجرے قبول کرنے اور سفرنامے لکھنے جاپان تک پہنچ جاتے ہیں، جہاں حیدرآباد کے سات فرشی سلام بے کمری کو کمر بنائے دکھائی دیتے ہیں۔ خدا معلوم اعلیٰ حضرت نظام دکن کی طرح مجتبیٰ صاحب بھی وہاں کچھ محبت نامے تقسیم کر کے آئے یا نہیں۔ میں نے شروع میں مجتبیٰ صاحب کو میرزا فرحت اللہ بیگ کا جانشین لکھا ہے۔اب یاد آیا کہ مشہور صوفی بزرگ حضرت بابا فرید گنج شکر کی خانقاہ میں دو فرد ''نظام الدین'' نام کے تھے۔ ایک ان کے سگے بیٹے، دوسرے روحانی فرزند حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء۔ایک روز یہ دونوں سامنے تشریف رکھتے تھے کہ یکا یک حضرت نے فرمایا تم دونوں میرے فرزند ہو۔بس اتنا ہے کہ ایک ''فرزند نانی'' (بحوالہ روٹی۔نان) اور دوسرا ''فرزند جانی'' (روحانی) ہے!

اللہ تعالیٰ مجتبیٰ صاحب کے مربّی اور سرپرست فرحت اللہ بیگ صاحب کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ان کے سگے بیٹے مرزا رفعت اللہ بیگ اور مجتبیٰ صاحب کے رضاعی بھائی بھی چشم بددور اس شان کے ہیں کہ راقم الحروف لندن گیا اور ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب نے اپنا مہمان کیا تو اپنے گھر کے سامنے استادہ ان تین **Maple** کے درختوں کو پتہ بتانے کے لیے نا کافی سمجھا جو خبر نہیں کب سے کھڑے ہیں۔لہٰذا میرے لیے دن گزارنے کے لیے اپنے دوست فخر الدین برنی صاحب کے گھر میں مسجد کے سامنے بندوبست کیا۔جانتے تھے کہ لوگوں کو خدا ملے نہ ملے گھر تو مل ہی جاتا ہے۔ایک روز کیا دیکھتا ہوں کہ دو صاحبان لشتم پشتم چلے آتے ہیں۔آتے ہی بولے۔میاں کہاں ہو، میں اور عدیل ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئے۔ پھر پتہ چلا کہ کوچہ نان بائیان کے نکڑ پر ٹھہرے ہوئے ہو۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ کیا یہاں کوئی کوچہ نان بائیان بھی ہے؟۔ بھول پن سے بولے۔ میاں تم ہی بتاؤ۔ بیکرز اسٹریٹ **(Bakers Street)** کا اور کیا ترجمہ کروں؟

اللہ تعالیٰ میرزا فرحت اللہ بیگ کے فرزند نانی اور جانی دونوں کو سلامت رکھے۔ پہلے باپ کی طرح سرخ و سفید اصلی میرزا اور کھرے بیگ نظر آنے والے۔دوسرے گھڑی بھر پہلے تک ایسے باتمکین اور سنجیدہ جیسے واقعی خانقاہ سے اٹھ کر آئے ہوں۔ مگر گھڑی بھر بعد جہاں ماحول نے کسی لاحول کا موقع فراہم کیا۔ایسے شگفتہ جیسے ہونٹ کسی پھول سے مانگ لیے ہوں۔ایسی رنگا رنگی میں نے کم لوگوں میں دیکھی لیکن اس رنگا رنگی کے لیے ان کے مضراب کو بروقت ہدفِ ساز کی ضرورت رہتی ہے۔لمحہ بھر میں کھل اٹھتے ہیں۔ پاس بیٹھنے والوں کو ان کے زیر لب تبصرے ان کی درونِ پردہ طنز آزمائی اور مزاح نگاری سے اس طرح واقف کراتے ہیں جیسے بھادوں کی بارش نے یکا یک آلیا ہو یا بقول حضرت امیر خسرو مطرب نے ترانوں کی بوچھار کر دی ہو۔مجتبیٰ صاحب کے لیے ان کا ماحول بہت ہی بھری پُری شکارگاہ اور بے حد زرخیز زمین کا کام انجام دیتا رہتا ہے۔ وہ پتھر پھینکے بغیر شکار کو جھاڑی میں سے باہر نکال لاتے ہیں اور ایسی زمین میں سے بیج اُگا دیتے ہیں جو بظاہر بنجر نظر آتی ہے۔ گھٹنے کی تکلیف نے چھڑی کے سہارے کے لیے مجبور کر دیا ہے۔مگر ان کے قلم کا گھوڑا بغیر چابک ایسے دوڑتا ہے جیسے غالب کے خامے پر نوائے سروش نازل ہو رہی ہو۔تھوڑا لکھے کو بہت جانئے۔ابھی لکھنے کو اور بہت کچھ باقی ہے۔یار زندہ صحبت باقی۔

جاپان چلو

پروفیسر گوپی چند نارنگ

(دہلی، بھارت)

مجتبیٰ حسین میرے دوست ہیں۔جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں وہ آپ میں سے بہتوں کے دوست ہیں۔ یہ غلط فہمی وہ اکثر پیدا کر دیا کرتے ہیں۔بعض لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ وہ ان کے خاص دوست ہیں۔ان کے خاص دوستوں اور عام دوستوں کا حلقہ بھی خاصا وسیع ہے لیکن ایک معاملہ اور بھی ہے۔ نہ صرف یہ کہ وہ میرے خاص دوست ہیں بلکہ میرے پڑوسی بھی ہیں۔کسی بھی پڑوسی کے بارے میں آپ کچھ کہہ لیں تنقیدی رویہ نہیں اپنا سکتے۔تو جو کچھ بھی میں کہوں گا وہ اسی رشتے سے ہوگا۔مجتبیٰ صاحب کے بارے میں جب جب سوچتا ہوں، ایک بات کی طرف میرا خیال بار بار جاتا ہے۔ ان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی فکر تونسوی کے یہاں برسوں پہلے۔ غالباً ان کے دوسرے مجموعے کی رسم اجرا تھی۔ مجھے اس وقت بھی خیال آیا تھا کہ اکثر ہماری تاریخ میں یلغار شمال سے جنوب کی طرف ہوتی رہی ہے۔کئی بار شمال نے جنوب کو زیر کیا ہے لیکن ہماری ادبی تاریخ میں دو سانحے ایسے ہیں کہ جنوب نے شمال پر دھاوا بولا اور شمال کو زیر کر لیا۔ایک زمانہ تو اورنگ زیب کے فوراً بعد کا ہے آخری مغل تاجداروں کا۔ جب ولی کا دیوان دہلی پہنچا تھا اور دہلی کی گلیوں میں ولی کی غزلوں نے ایک نئی گونج پیدا کر دی۔اورنگ زیب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے زندگی کا بیشتر حصہ خاندیش میں دکن میں خیموں میں گزارا تھا۔ پھر جو شمال اور جنوب میں رابطہ پیدا ہوا اور راہیں استوار ہوئیں تو اس کے بعد سے (اگرچہ لسانی رابطے تو پہلے بھی تھے) شعری رابطہ باقاعدہ ہوا تو دکن نے دہلی کے دل کو جیت لیا۔دوسری بات ہمارے زمانے میں یہ کام مجتبیٰ حسین نے سر انجام دیا ہے۔ادھر دہلی والوں کی ادبی زندگی میں ایسی کچھ کمی تھی کہ جب مجتبیٰ حسین یہاں آئے تو انہوں نے بہت جلد دلوں کو مسخر کرنا شروع کیا اور مزاح کی محفلوں میں ایک نئی معنویت پیدا ہوگئی۔یہ نہیں کہ یہاں مزاح کا چرچا نہیں تھا۔ تھا، فکر تونسوی لکھ رہے تھے، دوسرے احباب بھی ہیں، کبھی کبھی مزاح کے شعرا بھی آجاتے ہیں، مشاعروں میں شعری نشستوں میں، لیکن یہ بات نہیں تھی۔ ہمارے یہاں ہر طرح کا ادب تخلیق ہو رہا تھا۔غزل تھی، نظم تھی، افسانہ تھا، ڈراما تھا، ناول تھا لیکن مزاح نگاری جس کو صحیح معنوں میں مزاح نگاری کہا جاتا ہے، اسے دہلی کی زندہ ادبی روایت کا حصہ مجتبیٰ حسین نے بنایا اور یہ معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ چنانچہ اس طرح جنوب اور شمال کے، دکن اور دہلی کے رشتے کو ایک بار پھر انہوں نے جوڑ دیا۔ابھی شمس الرحمٰن فاروقی نے فرمایا کہ بعض لوگ مزاح نگار کو ادب میں دوسرے درجے کا مسافر سمجھتے ہیں۔اگرچہ ادب میں درجہ بندی سے مفر نہیں لیکن یہ پوری سچائی بھی نہیں کیونکہ اول تو پھر سب کو شاعری کرنا چاہیے کیونکہ شعرا پہلے درجے کے مسافر ہیں، اس لیے دوسرے، تیسرے، یا چوتھے درجے کے شعرا کو اول درجے کے نثر نگاروں پر ترجیح دینی لازم آئے گی۔ حقیقت کا دوسرا رخ یہ ہے کہ صنف چھوٹی یا بڑی نہیں ہوتی، فنکار چھوٹا یا بڑا ہوتا ہے۔یعنی جو بھی ہو جس میں کمال اچھا ہے، پھر آپ کسی درجے میں سفر کرتے ہوں، مزاح کو کہیں رکھیں، لیکن ادب کا کوئی تصور طنز و مزاح کے بغیر مکمل نہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ہر ادب میں طنزیہ پیرائے کی جس میں لغوی معنی کی تقلیب ہوتی ہے، نیز شگفتہ تحریروں کی، ہنسنے ہنسانے کی، ظریفانہ تحریروں کی بڑی گنجائش ہوتی ہے۔کسی بھی زبان کا ادب اگر معاشرے سے ہم کلامی کا حوصلہ رکھتا ہے تو اس میں مزاحیہ عنصر ضرور ہوگا۔کسی بھی ادب کا تصور آپ اس کے مزاحیہ حصے کے بغیر نہیں کر سکتے۔ یاد رہے طنز و مزاح ادب سے جب جب غائب ہوا ہے معاشرہ بیمار ہو گیا ہے۔ایسا نہ ہوتا تو فرخ سیر، جعفر زٹلی کو قتل نہ کروا دیتا۔ان دنوں ہم اردو میں آفات ارضی و سماوی کے جس دور سے گزر رہے ہیں، ہنسنے ہنسانے کی بڑی ضرورت ہے۔ادھر یہ صلاحیت معاشرے میں کچھ کم ہو گئی ہے۔یہ نہیں کہ اردو میں روایت نہیں تھی۔شاعری میں خاصی روایت رہی ہے۔لیکن یہ ذاتی حملوں کی روایت تھی۔حریف کو نیچا دکھانے کی، ہجو نگاری اور پھکڑ پن کی۔نثر میں جو بات پطرس، کنہیا لال کپور، رشید احمد صدیقی، ابن انشا نے پیدا کی، اس روایت کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے خصوصاً پطرس کی روایت کو۔مجتبیٰ حسین کا حال یہ ہے کہ انہوں نے اس راہ میں قدم بڑھایا ہے۔وہ ترقی کر رہے ہیں۔ان کے فن کے اندر بڑی وسعت ہے اور جتنے حربے، جتنے طریقے جتنی تکنیک ہو سکتی ہیں مزاح پیدا کرنے کی، فطری طور پر یہ سب ان کے فن میں موجود ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ برابر لکھ رہے ہیں اور ان کے قلم کی روشنائی خشک نہیں ہوئی۔مزاح کس طرح پیدا ہوتا ہے یا کس طرح پیدا کیا جاتا ہے۔ میں تو کہوں گا کہ مزاح نگار اگر وہ فطری طور پر مزاح کی طرف راجع نہیں ہے اور محض کوشش و کاوش سے بات بناتا ہے تو بہت جلد بے نقاب ہو جاتا ہے اور اپنے سفر میں پیچھے رہ جاتا ہے۔بہت سی ایسی مثالیں ہیں جن کے نام لینے سے کچھ حاصل نہیں۔

جتنے بھی گر ہیں اس فن کے مجتبیٰ حسین ان سب سے واقف ہیں اور ان حربوں کو وہ نہایت سہولت سے فطری طور پر برتتے ہیں۔اس لحاظ سے دیکھیں تو وہ Born Humourist ہیں۔اگرچہ ادب میں پیدائشی کچھ نہیں ہوتا ہر چیز تربیت اور سعی و توجہ سے وجود پاتی ہے۔طنز و مزاح کی جان تعریض ہے اور یہی حربہ مجتبیٰ حسین کے فن میں مرکزیت رکھتا ہے۔ایسا نہیں ہے کہ وہ خود کو سیدھا سادا سمجھ لیتے ہیں جیسا کہ بعض احباب کا خیال ہے بلکہ یہ سادہ لوحی نظر کا دھوکا ہے مزاح کی نقاب ہے۔تعریض کے فن کو جس خوبی سے مجتبیٰ

برتتے ہیں وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر اس طرح سے پرتیں کھول کر لفظوں کے پیچھے جھانکنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے آرٹ میں اس سے کیا کیا کام لیا جاتا ہے۔ مجتبیٰ حسین مبالغے کو کس طرح سے برتتے ہیں۔ تقابل کو کس طرح برتتے ہیں، غیر متناسب اشیا یا عوامل کو کس طرح لاتے ہیں، نیز زبان سے مزاح کس طرح پیدا کرتے ہیں، یہ سب دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ہماری شاعری میں بالخصوص یہ روایت رہی ہے کہ محض زبان سے مزاح پیدا کیا گیا۔ زبان کی صوتی و معنوی مناسبتوں یا تضاد کی مدد سے مضحک پہلوؤں کو ابھارنے کی خصوصیت رشید احمد صدیقی کے یہاں خاصی نمایاں ہے۔ مجتبیٰ حسین صورت حال (Situation) سے بھی مزاح پیدا کرتے ہیں اور طنز خصوصاً سماجی طنز کی آمیزش سے بھی لطف بیان کا سماں باندھتے ہیں۔ یاد رہے کہ مزاح کے لیے ذہانت بھی ضروری ہے اور طنز کے لیے سماجی شعور۔ اپنے معاشرے کی کمیوں کا اس کی کوتاہیوں کا اس کی طاقت کا اندازہ ہونا بہت ضروری ہے۔ احساس نہ ہو تو بات نہیں بنتی۔ ایک دو مثالیں پیش کروں گا، تفصیل کا وقت نہیں۔ دیکھیے تعریض کو وہ کس طرح سے برتتے ہیں۔ کتابوں کا جو شوق جاپان میں ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جاپان کی آبادی تقریباً ساڑھے گیارہ کروڑ ہے اور سال بھر میں تقریباً 80 کروڑ کتابیں فروخت ہوتی ہیں۔ گویا ہر جاپانی سال بھر میں ساڑھے چھ کتابیں ضرور خریدتا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ پڑھنے لکھنے کے معاملے میں شہرت رکھنے کے باوجود پچھلے تین برسوں میں ہم نے کوئی کتاب نہیں خریدی۔ ہاں، ادیب دوستوں کی کتابوں کے اعزازی نسخے ضرور قبول کرتے ہیں اور انہیں پڑھے بغیر ردّی میں بیچ دیتے ہیں۔''

اس طرح جب وہ تقابل کرتے ہیں تو جہاں جہاں جاپان میں انہیں کوئی چیز ایسی معلوم ہوتی ہے جس سے تعجب ہوتا ہے تو فوراً ہندوستانی معاشرے سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں اور اس میں سماجی طنز کی ہلکی سی آمیزش سے ان کی ترقی اور اپنے یہاں کی پس ماندگی کے مضحک پہلوؤں کو بے نقاب کرتے جاتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر ان کے دل کا درد بھی جھلکتا ہے لیکن اس کے دیکھنے کے لیے نظر چاہیے۔ جہاں جاپان کی گاڑیوں کا ذکر کیا ہے اور ان کی تعریف کی ہے تو دیکھیے کہ تقابل اور طنز سے کیا لطف پیدا کیا ہے۔ خاص طور سے دیکھیے کہ ایسے موقعوں پر طنز میں الفاظ کے معنی کس طرح بالکل الٹ دیے جاتے ہیں اور تحریر میں شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے:

''جاپانیوں کو سفر کرنا بالکل نہیں آتا۔ اس معاملے میں یہ لوگ ہم سے بہت پیچھے ہیں۔ صرف آرام دہ ریل گاڑیاں بنانے سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ سفر کرنے کے کچھ آداب بھی ہوتے ہیں جس سے جاپانی بالکل واقف نہیں ہیں۔ ہمیں جاپانی ریل گاڑیوں سے یہ شکایت بھی ہے کہ یہ بہت ٹھیک وقت پر چلتی ہیں۔ انتظار میں جو لذت ہوتی ہے اس کا مزہ جاپانیوں کو کیا معلوم۔ ایسے ہی کئی معاملات ہیں جن میں جاپانی ہم سے بہت پیچھے ہیں، آپ یقین کریں کہ ہمیں ٹوکیو میں کسی بھی اسٹیشن پر ٹرین کے لیے دو منٹ سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک ٹرین جاتی ہے تو دوسری اس کے پیچھے آجاتی ہے اور پھر ان کی رفتار بھی ایسی تیز کہ آدمی کا کلیجہ منہ کو آجائے۔ پتہ نہیں انہیں کہاں جانے کی جلدی ہوتی ہے۔ ہماری ریل گاڑیاں اسٹیشن میں داخل ہونے سے پہلے بیرونی سگنل کے پاس ضرور رکتی ہیں۔ سیٹیاں بجاتی ہیں اور مسافر کھڑکیوں میں سے جھانک کر سگنل کو دیکھتے ہیں۔ کتنا مزہ آتا ہے۔ لگتا ہے جاپانی ریل گاڑیوں کا کوئی سگنل ہی نہیں ہوتا۔ بس منہ اٹھائے کسی بھی اسٹیشن میں گھس جاتی ہیں۔''

یہ سفر نامہ بھی ہے اور مزاح کی کتاب بھی۔ اردو میں اس سے پہلے اس کی نظیر صرف ابن انشا کی تحریروں میں ملتی ہے یعنی ''چلتے ہو تو چین کو چلیے'' یا ''ابن بطوطہ کے تعاقب میں'' یا دیگر اس طرح کی تحریریں۔ اگرچہ اب سفر نامہ باقاعدہ ایک صنف کے طور پر لکھا جا رہا ہے بالخصوص پاکستان میں اس طرف خاصی توجہ ہے اور بہت سے لوگوں نے سفر نامے لکھے ہیں لیکن ایسا سفر نامہ جس میں مزاح کا عنصر غالب ہو، کم از کم میری نظر سے ابن انشا کے بعد اس طرح کی کوئی تحریر نہیں گزری۔ ملاحظہ ہو محض ایک لفظ سے اور لفظ بھی نہیں محض صیغۂ تانیث سے ایک پورا باب 'یونیسکو کی چھتری' مزاح کا شاہکار بن گیا ہے۔ یہ جملے دیکھیے:

''وہ ہمیں ٹوکیو میں دوسرے دن ملی اور ہم نے اسی دن اپنی بیوی کو خط لکھا'' ''وہ ہمیں آج ملی ہے دیکھنے میں کچھ خاص نہیں مگر پھر بھی اچھی ہے۔ اب ہمیں اسی کی رفاقت میں ٹوکیو کے شب و روز گزارنے ہیں۔ اسی کے سائے میں رہنا ہے۔''

ہر ہر جملے کی تانیثیت چھتری کی طرف بھی راجع ہے اور محبوبہ کی طرف بھی۔ ابتدا میں ایک بار ذکر کر کے مزاح نگار اس کو گول کر دیتا ہے۔ بیوی کے خط میں لفظ چھتری لکھنے سے رہ گیا ہے اور اس طرح ابہام سے شبہ پیدا ہوا۔ اس کے بعد میاں بیوی میں جو نوک جھونک ہوتی ہے وہ قاری کے لیے تفنن طبع کا سامان فراہم کر دیتی ہے۔ یہ بار بار وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ بی بی میں نے تو چھتری کے بارے میں لکھا تھا۔ رو میں لفظ چھتری لکھنا بھول گیا تم کسی اور تصور میں غرق ہو لیکن وہ بالکل نہیں مانتی۔ یہ اس کے سر کی قسم کھاتے ہیں۔ وہ کہتی ہے:

''اچھا تو میرے سر کی عزت کرتے ہو تبھی تو میرے سر پر ایک نئی چھتری لا رہے ہو۔''

یہ سارا کا سارا باب شگفتگی کا شاہکار ہے۔ صورت حال (Situation) کا مزاح بھی جگہ جگہ انہوں نے پیدا کیا ہے۔ ہلکا سا اشارہ اس کی طرف کروں گا کہ مزاح کا ایک خاص حربہ مبالغہ بھی ہے۔ مبالغے کا عنصر جب تک مزاح نگار داخل نہ کرے، مزاح، مزاح نہیں بنتا۔ جس طرح آپ ہر روز کارٹون میں دیکھتے ہیں۔ شکل کو کچھ بگاڑا جاتا ہے اور فیچرز کو تھوڑا بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ مصافحہ کا ذکر چل رہا ہے، جاپانی آداب کا ذکر کرتے

ہوئے مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

''ہماری تربیت کچھ ایسی ہوئی ہے کہ نہ صرف مصافحہ کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں بلکہ موقع ملے تو ملاقاتی سے گلے مل کر اس کی پسلیوں کی مضبوطی کا امتحان بھی لیتے ہیں۔ ہم سے دو چار دنوں تک یہ بدتہذیبی سرزد ہوتی رہی کہ دھڑا دھڑ جاپانیوں سے مصافحہ کرتے رہے۔ یہ اور بات ہے کہ جس کسی سے مصافحہ کرتے وہ فوراً اپنے ہاتھ دھونے کے لیے بھاگتا تھا۔ آخر کو سمجھدار آدمی ہیں تاڑ گئے کہ ہمارے مصافحے اور بغل گیریاں ضائع جارہی ہیں۔ ہم نے بھی ملاقات کے جاپانی آداب اختیار کر لیے۔ جاپانی جب بھی کسی شناسا کو دیکھتا ہے تو وہ تین گز دور کھڑا ہو جاتا ہے اور ساٹھ درجہ کا زاویہ بنا کر تعظیماً جھک جاتا ہے گویا کہنا چاہتا ہے کہ بھیا تمہیں دور ہی سے سلام۔''

پھر لکھتے ہیں کہ:

''تعظیماً جھکنے کے اور بھی کئی ذیلی آداب ہیں۔ پتہ چلا کہ ملاقاتی کی عمر اور رتبہ کے لحاظ سے آپ کو جھکنے کے زاویہ کا تعین کرنا پڑتا ہے۔ کتنی مرتبہ آپ کو جھکنا ہے اس کا انحصار بھی کئی باتوں پر ہوتا ہے۔ جو شخص جھکنے میں پہل کرتا ہے وہ جتنی مرتبہ جھکے اتنی ہی مرتبہ آپ کو بھی جھکنا پڑتا ہے۔ ایک بار ہم نے اپنے جاپانی دوست کے آگے جھکنے میں پہل کی تھی۔ وہ جھکا تو ہمیں احساس ہوا کہ ہمیں اور بھی جھکنا چاہیے! اب جو ہم دونوں کے بیچ جھکنے کا سلسلہ شروع ہوا تو رکنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔''

کیونکہ انہیں معلوم ہی نہ تھا کہ رکنا بھی ان ہی کو ہے۔ آخر میں اشارہ کرنا چاہوں گا مزاح کی ایک اور قوت کی طرف جو مجتبیٰ حسین کی تحریروں سے جھلکتی ہے اور وہ ہے کردار نگاری۔ کوئی مزاح نگار اگر ایسے کرداروں کو خلق نہیں کر سکتا جن کی پوری شخصیت مزاح سے بھرپور ہو اور جن کی ہر بات میں شگفتگی ہو، اس وقت تک وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ مجتبیٰ حسین کے خاکوں اور مضامین کے مجموعوں میں بہت سے ایسے کردار ملتے ہیں اور اس سفرنامے میں بھی کئی دلچسپ کردار ایسے ہیں۔ آخری باب میں لنکا کے جس مندوب سے انہوں نے ملاقات کرائی ہے جیا کوڈی سے، وہ تو ایسا زبردست کردار ہے کہ الگ سے اس کو خاکوں کے مجموعے میں بھی شامل کر لینا چاہیے۔ کہتے ہیں کہ وہ مندوب ہمیشہ کہا کرتا تھا:

''مجھے سری لنکا کے وزیر اعظم نے بطور خاص اس سمینار میں شرکت کے لیے نامزد کیا ہے۔ ہردم وزیر اعظم سری لنکا سے اپنے گہرے روابط و مراسم کا ذکر کرتے اور ہم سے پوچھتے رہتے کہ ہندوستان کی وزیر اعظم سے ہمارے مراسم کیسے ہیں۔ ہمیں بھی جواباً کہنا پڑتا تھا کہ ہمیں بھی ہندوتان کی وزیر اعظم نے بطور خاص اس سمینار میں شرکت کے لیے بھیجا ہے اور یہ کہ ہم بھی وزیر اعظم ہندوستان کے خاص آدمی ہیں اور ہمارے مشورے کے بغیر حکومت ہند کوئی فیصلہ نہیں کرتی۔ ہم جاپان میں ہیں تو حکومت کے سارے کاروبار ٹھپ ہو گئے ہیں۔ ہم اپنی دانست میں یہ سمجھتے تھے کہ جیا کوڈی چونکہ صرف ڈینگ ہانکتے ہیں اس لیے ہمیں بھی ڈینگ ہانکنے کا حق حاصل ہے۔ مگر ان ہی دنوں جب وزیر اعظم سری لنکا، جاپان کے سرکاری دورے پر آئے تو یہ ہمیں اپنے وزیر اعظم سے ملانے کے لیے گئے۔ ملاقات سے پہلے ہمیں پابند بھی کیا کہ ہم ان کے وزیر اعظم کی دو چار کتابیں پڑھ کر چلیں اور ان کے بارے میں رائے بھی دیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ وزیر اعظم سری لنکا سے جیا کوڈی کے سچ مچ نہایت گہرے اور بے تکلفانہ مراسم ہیں۔ جیا کوڈی یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان اور سری لنکا کے بیچ چند نزاعی امور ہیں تو ان کو سلجھانے کے لیے ہم اپنے اثرات اور رسوخ کو کام میں لے آئیں۔ کہتے تھے میں اپنے وزیر اعظم کو سمجھاتا ہوں تم اپنی وزیر اعظم کو سمجھاؤ۔ جیا کوڈی نے ہمیں سری لنکا آنے کی دعوت بھی دی تھی۔ کہتے تھے کہ تمہارا سرخ قالین والا خیر مقدم کراؤں گا مگر وہ تو خدا کا شکر ہے کہ ان کے سری لنکا اور ہمارے ہندوستان واپس آنے کے چند ہی دنوں بعد مسٹر پریم داسا کی حکومت ٹوٹ گئی۔ جس حکومت کے مشیر جیا کوڈی ہوں اس کا یہ حشر تو ہونا ہی تھا۔''

مجتبیٰ حسین نے جیا کوڈی کے بہت سے مزاحیہ پہلو ابھارے ہیں، سب کے ذکر کی گنجائش نہیں اور بہت سے واقعات ہیں۔ صرف ایک اور پہلو کی طرف اشارہ کروں گا:

''جیا کوڈی بہت دلچسپ آدمی ہیں۔ کبھی ہم لوگ کسی مقام سے دو ٹیکسیاں لے کر اپنے ہوٹل پر پہنچتے تھے تو وہ بڑے غور سے دونوں ٹیکسیوں کے میٹر کا مطالعہ ضرور کرتے تھے اور اس بات پر گھنٹوں اظہار حیرت کرتے رہتے تھے کہ دونوں ٹیکسیوں کا میٹر ایک ریڈنگ کیونکر دے رہا ہے۔ کم از کم میرے ملک میں تو ایسا نہیں ہوتا۔''

آخر میں ایک مزے کی بات لکھی ہے اور اس کے بغیر یہ حوالہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ ایک دن جیا کوڈی نے پوچھا کہ ہندوستان میں شائستہ سلام کے لیے آپ کے یہاں کون سا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ مجتبیٰ حسین نے کہا کہ 'نمستے' کہا کیجیے۔ بولے ''نمستے تو میں جانتا ہوں کوئی اور مہذب سلام سکھاؤ'' مجتبیٰ حسین نے 'آداب عرض' کا نسخہ تجویز کیا۔ بولے ''یہ بھی نہیں چلے گا کوئی ایسا سلام سکھاؤ جو بہت ہی مہذب ہو'' مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

''ہمیں مذاق سوجھا اور ہم نے انہیں ایک ناقابل اشاعت گالی سکھادی۔ بہت خوش ہوئے اور ہر صبح کو اسی گالی سے ہمارا استقبال کرنے لگے۔ ہم بھی جی ہی جی میں خوش ہوتے رہے کہ چلو دیارِ غیر میں کوئی ہمیں گالی دینے والا بھی ہے۔ ایک دن ہم لوگ گنزہ کے ایک ہندوستانی ریستوران میں کھانا کھانے گئے۔ جیا کوڈی نے اتنی محبت سے ہم سے یہ سلام سیکھا تھا۔ اس نادر موقع کو بھلا کس طرح ہاتھ سے جانے دیتے۔ سو انہوں نے ہندوستانی بیرے کو بلا کر نہایت ادب کے ساتھ اپنی دانست میں ہمارا سکھایا ہوا سلام عرض کر دیا۔

ہم چپ چاپ بیٹھے تماشہ دیکھتے رہے۔ بیرے نے منیجر سے شکایت کی اور جب منیجر ان سے باز پرس کرنے کے لیے آیا تو جیا کوڈی نے جھک کر پھر وہی سلام ان کی خدمت میں بھی پیش کر دیا۔ منیجر سمجھدار آدمی تھا۔ اس نے جان لیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ اس نے الگ لے جا کر جیا کوڈی کو سلام کے معنی و مفہوم سے آگاہ کیا۔ جیا کوڈی ٹیبل پر واپس آئے تو نہایت غیر مہذب لہجے میں یہی سلام ہماری خدمت میں پیش کرتے ہوئے بولے۔ ''تم بہت سنگین مذاق کرتے ہو۔ وہ تو اچھا ہوا کہ منیجر شریف آدمی تھا۔ اگر کوئی دوسرا ہندوستانی ہوتا تو نہ جانے اس سلام کا جواب مجھے کس طرح ملتا۔ بعد میں جیا کوڈی نے بہت چاہا کہ ہم بھی سنہالی زبان میں ان سے سلام کرنے کے مہذب اور شائستہ کلمات سیکھ لیں مگر ہم نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔''

تو مجتبیٰ حسین کے فن کے بہت سے پہلو ہیں اور باتیں کرنے کو بہت ہیں لیکن وقت کم ہے اور میں نے مختصراً تعریض، تقابل، مبالغہ، صورت حال کے مزاح یا کردار نگاری کے مزاح کی طرف یا سماجی طنز کی طرف کچھ اشارے کیے۔ آخر میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ کوئی بھی شخص جو مزاح لکھتا ہو یا شگفتہ تحریریں لکھتا ہو یا دوسروں کو ہنستا ہنساتا ہو، کہیں کہیں اس کے دل میں کوئی نہ کوئی چھپا ہوا درد ضرور ہوتا ہے۔ مجھے بھی یقین ہے کہ مجتبیٰ حسین کی آنکھوں سے تنہائی میں کبھی کوئی آنسو ضرور ٹپکتا ہوگا اور کوئی نہ کوئی چوٹ دبی ہوئی ان کے دل میں ایسی ضرور ہوگی۔ جو انہیں خود بھی ہنسنے اور دوسروں کو بھی ہنسانے پر مجبور کرتی ہے۔ اس دعا کے ساتھ اور نیک تمناؤں کے ساتھ کہ ان کا سفر جس طرح سے خوب سے خوب تر کی تلاش میں جاری ہے، جس طرح اپنی تحریروں پر انہوں نے ضبط رکھا ہے۔ اگر چہ وہ بہت لکھ رہے ہیں کچھ زیادہ لکھ رہے ہیں اور زیادہ لکھنے والے کو ہمیشہ خطرہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے معیار سے گر نہ جائے لیکن مجتبیٰ حسین نے جس طرح معیار کے معاملے میں اب تک نگہداشت کی ہے تو مجھے یقین ہے کہ وہ مزاحیہ ادب میں اونچا مقام حاصل کریں گے۔

اَنڈر اکلیس حُسین

مجتبیٰ کا خاکہ اُڑانے کا خیال اکثر میرے دل میں آیا۔ لیکن اس مضمون کی ناقابل برداشت تحریک اس وقت ملی جب زندہ دلانِ حیدر آباد کا خط آیا کہ اس سال پھر اپریل میں مجھے ان کے ادبی اجلاس میں شریک ہونا ہے۔ دعوت نامہ دیکھا۔ وہی پرانے گھسے پٹے نام۔ کوئی نیا لکھنے والا نہیں۔ یہ اُردو طنز و مزاح کو کیا ہو گیا؟ نئے لکھنے والے کیوں نہیں اُبھرتے؟ اگر ایک بار اُبھرتے بھی ہیں تو پھر ایسا غوطہ لگاتے ہیں کہ ڈھونڈے سے نہیں ملتے۔ خیر، فہرست میں بقولِ شاعر

''میرا نام تیرے نام کے ساتھ''

ایسے موقعوں پر مجتبیٰ اکثر مجھے فون کرتا ہے۔ اس بار جو فون کیا تو کہنے لگا۔ میرا جانا تو شائد مشکل ہو۔ ابھی ابھی حیدر آباد سے لوٹا ہوں۔ اتنی جلدی دوبارہ جا نہیں پاؤں گا۔ حکومت، اُردو پر کتنی ہی مہربان کیوں نہ ہو۔ کب تک دفتر سے میری غیر حاضری کو معاف کرے گی؟'' دلیل معقول تھی۔ اس سے مجھے احساس ہوا کہ مجتبیٰ لکھنے کے علاوہ بھی کوئی کام کرتا ہے۔ ویسے یہ بات بھول بھی کیسے سکتا تھا؟ ایسا شخص صرف سرکاری دفتر میں ہی کام کر سکتا ہے۔ سرکار اُردو ادیبوں کے تعلق سے بڑی وسیع القلب واقع ہوئی ہے۔ دیکھئے نا۔ یوسف ناظم، رشید قریشی، خواجہ عبدالغفور، بھارت چند کھنہ، نریندر لوتھر اور مجتبیٰ حسین کو اگر سرکاری نوکری نہ ملتی تو وہ اُردو ادب کی کیا خاک خدمت کر سکتے! ان کو خاک میں ڈھونڈنا پڑتا کہ کیسی کیسی صورتیں روزی نہ ملنے کی وجہ سے اس میں پنہاں ہو جاتی ہیں۔ پرائیوٹ سیکٹر میں وہ بات کہاں!

اب پچھلے چند سالوں سے فکر تونسوی، مجتبیٰ حسین اور مجھے تینوں کو محفلوں میں اکٹھے جانے اور مضامین پڑھنے کی عادت اتنی ہو گئی ہے کہ کسی محفل میں کسی ایک کا اکیلے جانا ممکن ہی نہیں لگتا۔ تینوں میں سے کم از کم دو کا ''کورم'' ہوتا ہے اور اس ''کورم'' کے بغیر قومی سطح پر طنز و مزاح کی کوئی محفل منعقد نہیں ہو سکتی۔ ادبی جلسوں میں اکٹھے جاتے جاتے اور پڑھتے پڑھتے اب یہ عالم ہو گیا ہے کہ ہم کو ایک دوسرے کے بیشتر مضامین زبانی یاد ہو گئے ہیں۔ چند ہفتوں کی ہی بات ہے کہ ہماری مزاحیہ تکون امروہہ میں مجموعی طور پر مدعو تھی۔ میں پہلے فکر صاحب کے گھر پہنچا اور اُن کو لے کر ہم مجتبیٰ کے گھر کی طرف چلے۔ راستے میں اچانک فکر صاحب گویا ہوئے۔ ''او ہو! ذرا واپس چلئے، میں مضمون لانا تو بھول ہی گیا۔''

میں نے کہا ''پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔ اب واپس نہیں جا سکتے۔ آپ یا تو جیسا عموماً کرتے ہیں، میرا ہی کوئی مضمون پڑھ ڈالئے یا مجھے بتا دیجئے کون سا مضمون سنانا چاہتے ہیں، میں زبانی سنا دوں گا۔'' نتیجتاً فکر صاحب نے اپنے نام سے میرا ہی لکھا ہوا مضمون وہاں سُنایا۔ بہت داد ملی۔ ہم تینوں بہت خوش ہوئے۔ فکر صاحب ایکٹر کی حیثیت سے، میں پلے بیک کی حیثیت سے اور مجتبیٰ ڈائریکٹر کی حیثیت سے۔

نریندر لوتھر (●)

''مجتبیٰ حسین کی شوخیاں''

کنورمہندرسنگھ بیدی سحرؔ

(●)

سانولا سلونا رنگ، متبسم چہرہ۔مناسب قد۔لب و لہجہ میں کبھی کبھی حیدرآبادی جھلک، یہ ہیں مجتبیٰ حسین جنہیں میں پچھلے کئی برس سے جانتا ہوں لیکن کسی کو طویل عرصہ تک جان لینا ہی اس پر کچھ لکھنے کے لئے کافی نہیں ہوتا۔یہ میں اپنی بات کر رہا ہوں۔مجتبیٰ حسین اس شرط کے پابند نہیں۔وہ جن کو جانتے ہیں ان کے خاکے تو لکھتے ہی ہیں، جن کو نہیں جانتے ان کے خاکے بھی لکھ مارتے ہیں اور اس طرح لکھتے ہیں جیسے مدت سے ان کے ہم پیالہ وہم نوالہ ہیں۔

پہلے تو میرے جی میں آئی کہ جب یہ خاکہ نویس اور مزاح کار کسی کو نہیں بخشتے تو پھر میں یہ موقع ہاتھ سے کیوں جانے دوں۔کیوں نہ ان کے راز ہائے مخفی کو آشکار کروں۔چنانچہ کئی دن تک سوچتا رہا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان کے راز میرے لئے راز ہی رہیں گے تو میں آشکار کیا کروں۔مزید غور کرنے پر ایسا بھی محسوس ہوا کہ مجتبیٰ حسین تو میرے فطرتاً ہمراز بھی ہیں۔

ان سے میری پہلی ملاقات حیدرآباد میں جشنِ ظرافت کے موقع پر ہوئی۔بیس پچیس برس کی بات ہے۔زندہ دلانِ حیدرآباد نے سہ روزہ جشنِ ظرافت کا انعقاد کیا اور مجھے بھی دعوت دی کہ میں ان کے سہ روزہ جشن میں ایک جشن کی صدارت کروں۔میں نے بخوشی یہ دعوت قبول کرلی۔اس جشن کی ایک نشست کے صدر آنجہانی راجندر سنگھ بیدی تھے اور دوسری نشست کے صدر آنجہانی وی۔شنکر تھے (خدا کے فضل سے میں ابھی ایں جہانی ہوں)۔جشن بہت ہی کامیاب رہا اور اس کے بعد غالباً اسی جشن کی بناء پر میرے حیدرآباد آنے جانے کا آغاز ہوا۔درجنوں مشاعروں میں بھی حصہ لیا اور کئی کانفرنسوں میں بھی شرکت کی۔مجتبیٰ حسین کو میں نے ہر موقع پر پیش پیش پایا۔حیدرآباد کی ادبی زندگی ان کے اردگرد گھومتی ہوئی دکھائی دی حالانکہ یہ خود حیدرآباد سے باہر گھومتے رہتے ہیں۔

خاکے لکھنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔خدا جانے انہوں نے کتنے خاکے لکھ ڈالے ہوں گے۔اور کچھ لوگ اگر بچ بھی نکلے ہیں تو برس دو برس میں ان کے بھی خاکے لکھ ماریں گے۔اور ایک دن ایسا بھی جلد ہی آئے گا جب گلی گلی، کوچے کوچے میں ان کے فرستادہ آوازیں لگاتے پھریں گے: ''ہے کوئی خاکہ لکھوانے والا۔''

خاکہ لکھنے اور خاک اُڑانے میں بہت ہی لطیف سا فرق ہوتا ہے۔اگر احتیاط نہ برتی جائے تو نتائج برعکس برآمد ہوتے ہیں۔مگر یہی ان کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ جہاں کسی کو کچھ بھی نظر نہیں آتا، یہ وہاں کیا کیا نہیں دیکھ لیتے۔اب میری ہی بات دیکھ لیجئے۔ایک روز میں کہیں ان کے ساتھ چلا گیا۔ہمیں ایک عمارت میں ساتویں منزل پر جانا تھا۔لیکن اتفاق سے اس روز بجلی بند تھی۔مجتبیٰ حسین کہنے لگے کہ بیدی صاحب آپ کے لئے ساتویں منزل تک پیدل جانا تکلیف دہ تو نہیں ہوگا۔میں نے کہا کہ ایسی کیا بات ہے۔چنانچہ ہم دونوں سیڑھیوں پر چڑھنے لگتے ہیں۔کہیں میں ان سے دو چار قدم بڑھ گیا ہوں گا اور غلطی سے ساتویں کے بجائے آٹھویں منزل پر پہنچ گیا ہوں گا۔بس اس بات کا انہوں نے بتنگڑ بنالیا اور میرے خاکے میں لکھ مارا کہ میں ابھی جوان ہی نہیں نوجوان ہوں۔اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ لکھ مارا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے پاس ہندوستان کے مختلف شہروں سے اَن گنت خطوط آنے لگے کہ میں کیا کھاتا ہوں۔کیا پیتا ہوں اور صحت کو قائم رکھنے کے لئے اور کیا کیا حربے استعمال کرتا ہوں۔بلکہ ایک دواخانے نے تو اپنے تازہ ترین معجونِ شباب آور کی بوتل کے لیبل پر مجھ سے میری تصویر چھاپنے کی اجازت چاہی۔اس سے ہمارے کچھ مشتہری تو ہوئی لیکن ایسا بھی ہوا کہ چند خوش جمال جو پہلے ہم کو بے ضرر سمجھتے تھے ہم سے کترا کے نکلنے لگے۔کچھ پردہ نشیں مائل بہ کرم بھی نظر آئے لیکن اس میں، میں بے خطا تھا، قصوروار دراصل مجتبیٰ حسین تھے۔

آپ نے اکثر دلی کے طبیبوں کو دیکھا ہوگا جو سوائے نبض دیکھنے کے مریض کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔لیکن ان کے پہلو میں ایک نسخہ نویس بیٹھا رہتا ہے جو ہمہ وقت خاموش رہتا ہے۔لیکن حکیم صاحب کی تشخیص سے پہلے ہی خود نسخہ لکھ کر مریض کے خالی ہاتھ میں تھما دیتا ہے۔میں جب مجتبیٰ حسین کو اپنے پاس بیٹھا دیکھتا ہوں تو مجھے دہلی کے نسخہ نویس یاد آتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین کی ایک خاص بات جو مجھے بے حد بھلی لگی وہ یہ ہے کہ میں نے ان کے منہ سے کسی کی بُرائی نہیں سُنی۔انہوں نے کبھی دشمن کو بھی بُرا نہیں کہا۔ہر ایک کا بھلا مانگتے ہیں۔اہلِ قلم حضرات میں یہ صفت بہت کم پائی جاتی ہے۔مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ان کو غالبؔ ایوارڈ برائے مزاح ملا تو یہ میرے پاس رونی سی صورت لے کر آئے اور کہنے لگے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ نے اچھا نہیں کیا۔اس ایوارڈ کے حق دار فکر تونسوی تھے۔

دوستوں اور دشمنوں کی مدد کرنا ان کی فطرت سی بن گئی ہے۔خدا کرے کہ ان کی یہ فطرت دوسرے ادیب اور شاعر بھی اپنائیں۔

مجتبیٰ حسین کی درجنوں کتابیں شائع ہوکر شرفِ قبولیت حاصل کر چکی ہیں۔لیکن ابھی ان کے قلم کا سفر جاری ہے اور انشاءاللہ جاری رہے گا۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

☆

مجتبٰی بھائی فِکر بھائی مزاح والے

فکرتونسوی

(●)

ایک دن جب میں خدا کی اس پالیسی پر غور کر رہا تھا کہ اُس نے بدصورت انسان کیوں پیدا کئے اور میرے علاوہ کس کس کو بدصورت پیدا کیا ہے کہ میری اکلوتی بیوی نے جو میری بدصورتی کو بھی پتی برت دھرم کا ایک حصّہ مانتی ہے، مجھے ڈاک سے آیا ہوا ایک لفافہ لا کر دیا۔ وہ میری ڈاک میں آئے ہوئے ہر لفافے کو اپنے بھائی کا لفافہ سمجھتی ہے۔ اور کوئی لفافہ اگر واقعی اس کے بھائی کا نکل آئے تو مجھے بوسہ دینے پر بھی آمادہ ہو جاتی ہے۔

میں نے لفافہ کھولا اور کہا۔ ''سوری میڈم! یہ تو کسی مجتبٰی حسین نامی شخص کا خط ہے۔''

وہ بولی۔ ''جبھی اتنا بدصورت خط ہے۔'' اور وہ منہ بنا کر بغیر بوسہ عطا کئے چلی گئی۔ میرے کئی بوسے اسی طرح ملتوی ہو چکے ہیں۔ خدا ہر بوسے کو ہر مجتبٰی حسین سے بچائے۔

خط پڑھ کر فوری تاثر یہ ہوا کہ ان صاحب کا ہینڈ رائٹنگ تو میری صورت سے بھی بھدّا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ مجھ سے بھی زیادہ بد صورت اس دنیا میں موجود ہیں۔ خط اتنا بدشکل تھا کہ مشکل سے پڑھا اور اس سے بھی مشکل سے سمجھا جاتا تھا۔ میں نے سوچا، اگر ایسا بدشکل خط لکھنے والا خود بھی بدصورت نکلا تو اللہ کے فضل و کرم کا اعتراف کرنا ہی پڑے گا۔ اور میں اتنا خوش ہوا کہ فرطِ مسرت میں اپنی بیوی کو پھر بلا لیا اور کہا ''محترمہ! یہ تو میرا بھائی نکلا۔ تمہارا نہیں۔ اور وہ اس گھر میں آرہا ہے۔''

وہ چڑ کر بولی۔ ''ہاں ہاں، زندگی بھر آپ اس گھر میں کوئی کام کی چیز بھی لائے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''کیوں نہیں، مثلاً تمہیں لایا تھا۔''

اس پر وہ انکار کی ہمّت نہ کر سکی۔ مگر کنفیوز ضرور ہو گئی، اتنی زیادہ کہ اب جب بھی مجتبٰی میرے گھر آتا ہے۔ وہ سمجھتی ہے، رقیب روسیاہ آیا ہے۔ اور دو برس بعد جب دہلی میں مجتبٰی سے پہلی ملاقات ہوئی تو اس کے منہ سے واقعی جو پہلا لفظ نکلا وہ تھا ''فکر بھائی''۔

فکر بھائی کی حد تک کہنے میں تو کوئی برائی نہیں تھی۔ لیکن اس کے خدوخال دیکھ کر مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ کیوں کہ وہ کم بخت اتنا بدصورت نہیں تھا جتنا میرا بھائی بننے کے لئے اسے ہونا چاہئے تھا اور پھر وہ اس دوران میں مجھے اتنے پیارے پیارے خط لکھ چکا تھا کہ میرے ذہن میں اُس کے ہینڈ رائٹنگ کی بدصورتی غائب ہو چکی تھی اور وہ حُسن اُبھر آیا تھا جو ہینڈ رائٹنگ کے اندر چھپا ہوا تھا۔ عرفِ عام میں اُسے روح کا حُسن کہتے ہیں۔ لہٰذا میں نے روح کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہا ''مجتبٰی بھائی''

اور یوں۔ مجتبٰی بھائی فکر بھائی ——— وجود میں آ گئے۔ اور ہم دونوں کی بدصورتیوں پر پانی پھر گیا۔ ہر بدصورتی کی یہی ٹریجڈی ہے کہ جب عشق درمیان میں آ جائے تو بدصورتی کا انجام اس خدا کی طرح ہو جاتا ہے کہ ع

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

ویسے دل ہی دل میں، میں نے یہ شکایت ضرور کی۔ ''مجتبٰی مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی۔''

مگر عشق کی ایک ٹریجڈی بھی ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ میں نے مجتبٰی حسین سے کہیں کہہ دیا۔

''مجتبٰی بھائی! تم بہت نفیس لکھتے ہو۔''

مجتبٰی کا منہ فق ہو گیا۔ اُسے بھی مجھ سے یہ توقع نہیں تھی۔ کیوں کہ ادیبوں میں یہ رواج ہی نہیں ہے کہ وہ ہمدموں کی تحسین کریں۔ چنانچہ مجتبٰی نے مجھے لاکھ سمجھایا کہ فکر بھائی! آپ کے منہ سے یہ سہواً نکل گیا ہے۔ لیکن میں نے کہا ''اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں نسلاً راجپوت ہوں، جو منہ سے نکل گیا۔ اسی پر ستی ہو جاؤں گا۔''

مجتبٰی بولے۔ ''مگر اب تو آپ ادیب ہو گئے ہیں۔ راجپوت نہیں رہے۔''

میں نے کہا ''نہیں! میرے دادا جان نے فرمایا تھا کہ ہم راجپوت نسل سے ہیں۔ ہو سکتا ہے انہوں نے یہ بات بھی سہواً ہی کہی ہو۔ مگر سہواً کے باوجود ہم تین نسلوں سے اپنے آپ کو راجپوت ہی کہے جا رہے ہیں۔ حالانکہ میرے والد صاحب نے تلوار کی شکل تک نہیں دیکھی، عمر بھر اُن کے ہاتھ میں ترازو رہا۔ اور میں؟ میں نے ترازو چھوڑ کر قلم پکڑ لیا ہے۔''

چنانچہ اس کے بعد مجتبٰی اپنے مزاحیہ مضامین کے بارے میں مجھ سے کچھ نہیں پوچھتا۔ اور مَیں اس کے مزاحیہ ادب کے بارے میں اس ڈر سے خاموش رہتا ہوں کہ کہیں ستی نہ ہونا پڑے لیکن جب بھی اُس کی کوئی تخلیق پڑھتا یا سنتا ہوں تو سب کی نظر بچا کر کہہ اٹھتا ہوں ''میری وہ بات سہواً تو نہیں تھی۔ راجپوت کبھی سہو نہیں کرتے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ مجتبٰی ہی سہواً نفیس لکھ دیتا ہو۔''

اور ویسے بھی کسی کے ادبی مرتبے کے بارے میں فیصلہ دینے سے گریز ہی کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس میں منہ پر تعریف اور پیٹھ پیچھے گالیاں دینا پڑتی ہیں اور میرا پروگرام یہ ہے کہ اس جنم میں صرف سچ بولوں گا اور جھوٹ بولنے کے لئے کسی اور موزوں جنم کا انتظار کروں گا۔ سچ بولنے سے خاموشی کئی درجہ بہتر رہتی ہے۔

ایک صاحب جو انسان کم اور انٹلکچول اس سے بھی کم تھے اور مجتبیٰ کو انسان کم، مزاح نگار اس سے بھی کم مانتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھ سے کہنے لگے۔ ''ایمان سے بتایئے، مجتبیٰ کے مزاح کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ادب پر لعنت بھیجئے، یہ بتایئے آپ کے داڑھ درد کی کیا حالت ہے۔'' انہیں کئی دنوں سے داڑھ درد کی شکایت تھی۔ ایک دم اپنے بائیں گال کو زور سے دبایا اور داڑھ کے بجائے ہاتھ سے چیخ کر بولے ''ہائے میں مرا جا رہا ہوں۔''

''کوئی علاج کیا۔''؟

بولے ''ہاں''۔ ایک خدا رسیدہ درویش نے مشورہ دیا تھا کہ کسی کنواری بھنگن کو سینے سے لگا لو، درد کافور ہو جائے گا، لیکن بھنگن کو بھی آزما کے دیکھ لیا۔''

میں نے کہا ''یعنی نتیجہ۔ ڈھاک کی ایک بھنگن ہی نکلی۔''

میں نے فوراً مجتبیٰ کو ٹیلی فون کیا۔ ''مجتبیٰ بھائی! اس وقت کون سا ادبی کام کر رہے ہو؟''

جواب آیا۔ ''پڑوسی شام سنگھ کا ریڈیو سیٹ ٹھیک کروا رہا ہوں۔''

''گویا یہ ادبی کام تھا۔ سنا تھا، ادب کا ریڈیو سے تعلق ہے۔ مگر صرف سنا تھا، پرکھا کبھی نہیں تھا۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ ادب کا ریڈیو کی مرمت سے بھی تعلق ہے۔''

پوچھا۔ ''سمیسا کیا ہے؟''

بولا۔ ''بمبئی اسٹیشن پر سوئی گھماؤ تو پیکنگ ریڈیو بج اٹھتا ہے۔ سوچ رہا ہوں اس سیٹ کو رحیم بخش میکانک کے ہاں لے جاؤں۔ مگر فکر بھائی! آج آپ نے مجھے کیسے یاد کیا؟''

میں نے کہا۔ ''بس، جی چاہا۔ آپ سے ملوں، ویسے کام تو کوئی نہیں تھا۔ آپ نہ ملیں تو بھی زندگی اچھی خاصی گذر رہی ہے، لیکن ہمارے فلاں انٹلکچول دوست کی داڑھ میں سخت درد ہو رہا ہے آسکو تو آجاؤ۔''

مجتبیٰ نے جواب دیا۔ ''میں میکانک کے ہاں ریڈیو سیٹ چھوڑ کر ابھی دس منٹ میں حاضر ہوتا ہوں۔ کیونکہ پیکنگ ریڈیو سننا بھی تو داڑھ درد سے کم نہیں ہے۔ وہ چینی زبان میں ہندی بولتے ہیں تو بیچارہ شام سنگھ اپنی ہندی بھی چینی زبان میں بولنے لگتا ہے۔ مگر میں ابھی آتا ہوں۔ آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔ بھلا داڑھ درد بھی کوئی بات ہے انہیں کہئے داڑھ درد کو صرف دس منٹ پینڈنگ رکھیں۔''

اور گیارہویں منٹ پر مجتبیٰ اس انٹلکچول کو اپنی آٹو سیکل پر بٹھا کر ڈاکٹر دھرم بیر ڈینٹل سرجن کے پاس بیٹھا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ''ڈاکٹر صاحب! دس منٹ میں یہ داڑھ درد دور کر دیجئے۔ آپ نہیں جانتے کہ داڑھ درد کے باعث اُردو کی کئی غزلیں بے وزن ہو گئی ہیں۔''

اس مجتبیٰ کم بخت کے لہجے میں بھی جادو ہے، کردار میں بھی۔ ڈاکٹر جانتا تھا کہ کس طرح مجھے ٹیلیفون کنکشن دلانے کے لئے مجتبیٰ بھاگتا پھرتا رہا۔ ٹیلی فون فارم تک خود بھرا اور اُسے ٹیلی فون آفس میں یوں دے آیا جیسے کبوتر بام یار پر خط لے جاتا ہے اور حیرت یہ ہے کہ لوگ بھی اس کا کام یوں کر دیتے ہیں جیسے اس کام کو پتی برتا دھرم سمجھتے ہوں۔ جس محاذ پر بھنگن کا سینہ نا کام ہو جاتا ہے۔ مجتبیٰ کا سینہ کام آجاتا ہے۔ لگتا ہے اس کے سینے میں مجرّب قسم کی بھنگن موجود ہے اور خدا رسیدہ درویش کا لمس بھی، جس سے وہ بڑے بڑوں کے زہر کو شیو جی کی طرح چوس لیتا ہے۔

اور پھر میں نے دیکھا، ایک دن وہی انٹلکچول مجتبیٰ حسین کا ایک مزاحیہ مضمون ''داڑھ کا درد'' پڑھ کر کھلکھلا رہا ہے اور کہہ رہا ہے۔ ''سالا خوب لکھتا ہے''۔

مجتبیٰ کی عادت ہے کہ وہ داڑھ درد کا کنکشن ٹیلی فون سے کر دیتا ہے۔ ''فکر بھائی! دنیا کی ہر شئے ایک دوسرے سے جُڑی ہوئی ہے۔ صرف جوڑنے والی نگاہ چاہئے۔''

میں نے کہا۔ ''عرفِ عام میں اِسے نگاہِ مردِ مومن کہتے ہیں۔''

وہ بولا۔ ''آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔''

میں نے کہا ''شرمندہ تو وہ ہوں گے جو داڑھ درد سے اپنی تقدیریں بدل رہے ہیں، تم کیوں شرمندہ ہوتے ہو۔''

مگر وہ شرمندہ ہو جاتا ہے، ایسے جیسے، کنواری لڑکیوں کے چہرے پر حیا کی سُرخی دوڑ جائے۔ یہ سُرخی اِسے پُرکشش بنا دیتی ہے ورنہ بظاہر تو اس میں اتنی کشش بھی نہیں ہے جو کنجڑے کی دکان پر رکھے ہوئے کالے لمبوترے بینگن میں ہوتی ہے۔ اور گاہک اُس کا ریٹ تک پوچھنا پسند نہیں کرتا اور آگے بڑھ جاتا ہے۔

ایک مرتبہ گیس کے چولہے کی بے حد قلت ہو گئی۔ میرے ایک دوست کو وہ ضرور چاہئے تھا۔ میں نے مجتبیٰ سے ذکر کیا تو حسبِ معمول بولا۔ ''چولہا؟——— چولہا بھی کوئی بات ہے، آج کیا تاریخ ہے، ۵/اکتوبر۔ دس اکتوبر کو چولہا آپ کے دوست کے گھر پہنچ جائے گا۔ آپ صرف اس فارم پر دوست کے دستخط کروا دیجئے۔''

''مگر کیسے پہنچے گا چولہا؟''

''یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ اور میں اس وزیر پر چھوڑ دوں گا جس کے اشارے پر پورا انڈین آئیل چل رہا ہے۔ فکر بھائی! آپ نہیں جانتے۔ ہر شئے کا ایک دوسرے سے کنکشن ہے۔ مجتبیٰ کا فکر سے اور چولہے کا وزیر سے۔''

اور پھر میں نہیں جانتا اس خدا رسیدہ درویش نے کس طرح گیس کے چولہے کو بنی نوع انسان کا سب سے اہم مسئلہ سمجھ لیا۔ مسئلہ کا تعاقب اسکوٹر پر کیا۔ اسکوٹر کا تعاقب مسئلے نے کیا۔ اور مسٹر بشیر احمد اکسائز انسپکٹر سے کہا۔ ''قبلہ!

میں نے ایک بار آپ کی ناک کی تعریف کی۔''

وہ بولا۔''ہاں! کی تھی۔''

''تو اَب میری اپنی ناک، دردناک ہوگئی ہے۔آپ کے سالے کریم خاں کا سُسر انڈین آئیل میں سپرنٹنڈنٹ ہے۔ان سے اسپیشل کوٹہ میں ایک چولہا الاٹ کرادیجئے۔''

اور میں نے دیکھا دس اکتوبر کو میرے دوست کے گھر چولہا جل رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔''مگر مجتبیٰ اس میں وزیر کا چولہے سے تعلق تو پیدا ہوا ہی نہیں۔''

بولا۔''فکر بھائی! اس سپرنٹنڈنٹ کا چچا زاد بھائی ہفتے بھر تک ڈپٹی وزیر بننے والا ہے۔'' مجتبیٰ نے اعلان کر رکھا ہے کہ وہ وزیر نہیں بنے گا، کیونکہ وزیر دفتر میں ملتا ہے، میں سڑکوں پر ملتا ہوں بلکہ وزیر بھی نہیں ملتا۔اس کا پی اے ہی ملتا ہے جو اکثر کہتا ہے کہ صاحب باتھ روم میں ہیں مگر میں ....''

میں نے کہا۔''مگر مجتبیٰ بھائی اگر تم اسی طرح خدمتِ خلق کرتے رہے تو خطرہ ہے، وزیر بن جاؤ گے۔''

بولا۔''میں اپنی عاقبت خراب کرنا نہیں چاہتا۔''

میں نے کہا۔''عاقبت کی خبر خدا جانے۔تم نہیں جان سکتے۔''

ایک مرتبہ میرے رشتے کی محترمہ میرے گھر تشریف لائیں۔اس کا شیرخوار بچہ اکڑ گیا کہ بوتل سے دودھ نہیں پیوں گا۔اس نے اتنا اُودھم مچایا کہ میں اس محترمہ سے کہنے ہی والا تھا کہ آپ نے خواہ مخواہ یہ بچہ پیدا کر ڈالا کہ اچانک میرے ذہن میں مجتبیٰ اُبھرا۔فوراً ٹیلی فون کیا۔''مجتبیٰ بھائی۔بوتل''

وہ بولا۔''وہسکی کی؟''

''نہیں، دودھ کی۔یہاں ایک بچہ بوتل سے دودھ نہیں پی رہا۔فوراً آؤ''۔

اب پوزیشن یہ تھی کہ بمبئی سے ایک رائٹر صاحب تشریف لائے ہوئے تھے۔ان کی واپسی کے لئے ٹکٹ ریزرو کرانا تھی۔یہ ٹکٹ ایک طرح کی بوتل تھی جو اس رائٹر کے اندر چیختے ہوئے شیرخوار بچے کو چُپ کراسکتی تھی۔چنانچہ مجتبیٰ اس کی ٹکٹ ریزرو کرواکر چند ہی منٹ میں اپنی اسکوٹر پر نمودار ہوگیا۔وہ جب اسکوٹر پر بیٹھتا ہے تو اسکوٹر سے پہلے پہنچ جاتا ہے۔آتے ہی بولا۔''کہاں ہے وہ ننھا فکر بھائی؟۔مجھے فوراً واپس بھاگنا ہے۔پریس میں ایک ادبی سیمینار کے دعوتی کارڈ چھپوانا ہیں۔''

اور اس نے وہی بوتل اٹھائی، ننھے کو گود میں لیا۔کم بخت ننھا اس کی گود میں جاتے ہی خاموش ہوگیا۔اور یوں مزے مزے سے دودھ پینے لگا جیسے جنت سے منگوایا ہوا دودھ ہو۔اور میں نے دیکھا بچے کی ماں مجتبیٰ کو نکھیوں سے دیکھ کر یوں رال ٹپکا رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو''یہ جنم تو اکارت گیا۔اگلے جنم میں تمہیں ہی اپنا عاشق بناؤں گی۔''

مگر مجتبیٰ حسین کو جلدی تھی۔اسے ایک اُبھرتے ہوئے شاعر کی کتاب کا جشنِ اجراء کرانا تھا۔اس لئے وہ محترمہ کی رال کو پینڈنگ رکھ کر چلا گیا۔لیکن اس کے بعد محترمہ کا بیان ہے کہ ننھا جب بھی دودھ نہ پینے کے لئے اڑتا ہے میں جھٹ دھمکی دے دیتی ہوں۔''بلاؤں مجتبیٰ کو۔''

غرض میں نے جب بھی مجتبیٰ بھائی کو دیکھا ہے۔دوڑتے، اُڑتے اور پھلانگتے ہی دیکھا ہے۔ایک مرتبہ میں نے اُسے دیکھا کسی کے ننھے بچے کو لئے سڑک پر کھڑا لوریاں دے رہا ہے۔کہنے لگا۔''فکر بھائی! اس کی ماں کہانی لکھنے میں مصروف ہے۔اگر کہانی نہ لکھی گئی تو اُردو ادب کا مستقبل جو پہلے ہی تاریک ہے اور بھی تاریک ہوجائے گا۔'' دوسری مرتبہ اسے ایک گورنر کے پاس بیٹھے مزاحیہ کانفرنس کا پلان بناتے دیکھا۔اور تیسری مرتبہ وہ مجھے کہہ رہا تھا۔''فکر بھائی! بھوپال چلئے۔دو دن کا مزاحیہ سیمینار ہے۔بھوپال میں طعام کے لئے باورچی عام پائے جاتے ہیں اور قیام کے لئے ایک ریٹائرڈ فوجی میجر نے وعدہ کرلیا ہے۔آپ تشریف نہ لے آئیں تو ہندوستانی مزاح کی آبرو خطرے میں پڑ جائے گی۔''

اور میں نے سوچا، مزاح کی آبرو جائے بھاڑ میں، مجھے تو مجتبیٰ کی آبرو مقصود ہے۔ورنہ جہنم میں جائے ہندوستان اور ہندوستان سے زیادہ اس کا مزاحیہ ادب — لہٰذا میں دل میں گالیاں اور کندھے پر بستر رکھے ایک دن بھوپال اسٹیشن پر اُتر رہا تھا۔

ہاں میں نے اسے ہمیشہ لپکتے جھپکتے دیکھا ہے۔نہ جانے یہ لکھتا کب ہے۔میں نے تو اُسے ہمیشہ یا تو خطوط لکھتے دیکھا ہے یا حاجت مندوں کی فہرست لکھتے یا احباب کے ٹیلی فون نمبر اور اڈریس لکھتے۔

ایک بار میں نے اس سے پوچھا۔''کیا تم نے کسی سے عشق بھی کیا؟ چلو کوئی حسین نہ سہی، آبنوسی محبوبہ ہی سہی۔اور ویسے تم اتنے مرنجان مرنج ہو کہ ٹھگنی بھی چل سکتی ہے۔''

وہ مسکراتی ہوئی آہ بھر کر بولا۔''فکر بھائی! ایک، دو تین نہیں گنتی صحیح ہونی چاہئے، چار محبوبائیں میرے تعاقب میں ہیں اور۔۔۔۔۔''

''اور ان کا حشر —؟''

''حشر؟ کوئی یہاں گری کوئی وہاں گری۔مایوس ہوگئیں۔میرے پاس ٹائم ہی نہ تھا۔آخر کب تک انتظار کرتیں، بھاگ کر کسی نہ کسی شوہر کے سائے میں پناہ لے لی۔''

میں نے کہا۔''خدمتِ خلق کرتے رہو گے تو شوہر تمہاری محبوباؤں کو لے ہی جائیں گے۔پیارے یہ زمانہ تو کاریں اور بنگلے بنانے کا ہے، خدمتِ خلق کا نہیں۔''

مگر وہ خدمتِ خلق کے اس ماڈرن مقصد کو نہیں سمجھ سکا۔کافی جاہل

ہے۔اور اپنی آٹو سائیکل لئے دوڑتا پھرتا ہے اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے ہر عاشق کا انجام آٹو سائیکل ہے۔اس کی آٹو سائیکل دہلی میں اتنی مشہور ہوگئی تھی جیسے چارلی چپلن کی مونچھیں اور یورپ کی پتلون۔جدھر سے گذر جاتی لوگ انگلیاں اٹھا کر کہہ اُٹھتے۔ع

وہ جارہا ہے کوئی شبِ غم گذار کے

کبھی داڑھ درد دور کرانے، کبھی ننھے کو چپ کرانے، کبھی سیمنار کرانے۔اور ایک دن تو میں نے دیکھا وہ سعودی عرب کے سفارت خانے کے باہر کھڑا تھا پوچھا۔''مجتبیٰ بھائی!انڈو عرب اتحاد پر کوئی سیمنار کروارہے ہو۔''

وہ بولا۔''نہیں! یہاں کے ایک چپراسی بے چارے کو کھانسی کی گولیاں دینے آیا تھا۔ ہفتے بھر سے کھانسے ہی جارہا ہے۔اس کھانسی میں بھلا انڈو عرب اتحاد کہاں ممکن ہے۔'' مگر پھر ایک دن اچانک دیکھا وہ آٹو سائیکل کی بجائے اسکوٹر پر نمودار ہوگیا۔

میں نے کہا۔''مجتبیٰ بھائی! آٹو سائیکل سے اسکوٹر تک؟ کیا فلسفۂ ارتقا کے قائل ہوگئے ہو۔''

وہ بولا۔''نہیں فکر بھائی! دراصل محبوباؤں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ ابھی ابھی نریندر لوتھر صاحب کو ہوائی جہاز پر سوار کرا کے آرہا ہوں، بڑی محبوبہ طناز قسم کی چیز ہے ظالم! اور اب عابد علی خاں صاحب کی زیارت کے لئے امپیریل ہوٹل جارہا ہوں۔آٹو سائیکل اور ہوائی جہاز میں فاصلہ کچھ زیادہ تھا۔ اسکوٹر سے قدرے کم ہوگیا ہے۔''

اور میں نے کہا۔''مجتبیٰ مجھے خطرہ ہے، ایک دن ایسا آجائے گا جب تم اپنے ہوائی جہاز پر سوار ہو کر ہمدرد دواخانے میں جا اُترو گے اور کہو گے ''جوشاندے کی ایک پڑیا دینا۔فکر بھائی کو بلغم ستارہا ہے۔''

مجتبیٰ حسین (مشتبہ آدمی)

کنور رسے مجتبیٰ کو''مشتبہ'' ہی پایا۔پروفیسر رشید احمد صدیقی کے لیے شوکت تھانوی نے لکھا تھا کہ اردو کے مشہور مزاح نگار ہیں مگر شکل وصورت سے مرثیہ گو معلوم ہوتے ہیں۔مجتبیٰ حسین کی صورت بھی خالق کائنات نے سوز خوانی کے لیے بنائی تھی۔انہوں نے اس کا ناجائز استعمال شروع کردیا۔مگر ان کی مزاح نگاری بھی خاصی''مشتبہ'' ہے۔یعنی مجھے ان کی ہنسی بھی''اشک آلود'' نظر آتی ہے۔ان کے فن کا کمال یہی ہے کہ آپ کو ہنساتے ہیں، خودنہیں ہنستے، لیکن اگر ہنسی کے ساتھ آپ کی آنکھیں نم ہوجائیں تو یہ ہنسنا شروع کردیتے ہیں۔طنز ومزاح دونوں الگ الگ شعبے ہیں، یہ ایک دوسرے سے مخلوط بھی ہوجاتے ہیں، ایک دوسرے میں کھو بھی جاتے ہیں۔کبھی ان کو الگ پہچاننا بہت آسان، کبھی بہت مشکل ہوتا ہے۔طنز یہی نہیں ہے کہ آپ اپنے چاروں طرف بکھری ہوئی کائنات کے بے ہنگم پن کو نمایاں کردیں، مزاح بھی صرف پگڑی اچھالنا نہیں ہے، ہنسنا اچھا مشغلہ ہے۔صحت کے لیے بھی ممکن ہے مفید ہو(اگر چہ یہ بات بھی مشتبہ ہے) مگر ہر فن کا ایک نقطہ کمال ہوتا ہے،طنز ومزاح کا نقطہ عروج یہ ہے کہ وہ ہنسنے میں رلادے۔خواجہ میر درد نے کہا تھا:

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا

کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا

مجتبیٰ حسین متوسط طبقے کا اوسط درجے کا انسان ہے، مگر وہ ایک اعلیٰ درجے کا مزاح نگار کیسے بن گیا، یہ بھی غور کرنے والی بات ہے۔ وہ صحافت کے راستے سے ادب کی دنیا میں آیا، اس راہ کے پیچ وخم میں بہت سے لکھنے والے کھو بھی گئے ہیں۔بہ قول میر:

وصل و ہجراں یہ جو دو راہیں ہیں شہر عشق میں

دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا

مگر مجتبیٰ اس شہر عشق کی راہوں میں خوب گھوما پھرا ہے، خوب مٹر گشت کی ہے، اور شہر کو اس نے اپنے وجود میں بسالیا ہے، اب تو خطرہ خود شہر عشق کے بھٹکنے کا ہوگیا ہے۔دراصل مجتبیٰ نے ایک عام اور معمولی انسان سے اپنا ذہنی وجذباتی رشتہ ہمیشہ باقی رکھا ہے، اس کے دکھ سکھ کو سمجھا ہے، اس کی بھولی بھالی نیم پختہ، نیم رس آرزوؤں اور تمناؤں سے یگانگت پیدا کی ہے۔اس کی حسرتوں اور ناکامیوں کو ہنس ہنس کر بیان کیا ہے۔اسی پردے میں وہ اپنے ماحول اور معاشرت پر بھرپور وار کرتا ہے اور اس کا کوئی وار اوچھا نہیں پڑتا۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی (•)

رنگ لائے گی ہماری پیش لفظی

دلیپ سنگھ

(●)

کسی کتاب کا پیش لفظ لکھنا اور کسی دولہا کا سہرا لکھنا تقریباً ایک جیسے کام ہیں۔ جیسے ہر شاعر سہرا نہیں لکھ سکتا، ایسے ہی کسی کتاب کا پیش لفظ لکھنا ہر ادیب کے بس کا روگ نہیں ہے۔ جیسے کچھ شاعروں نے سہرا لکھنا اپنا پیشہ بنا لیا ہے، اسی طرح کچھ ادیبوں نے پیش لفظ لکھنے میں مہارت حاصل کر لی ہے۔

طنز و مزاح کی کتابوں کے پیش لفظ لکھنے میں سرفہرست میرے دوست مجتبیٰ حسین صاحب کا نام ہے۔ بلکہ سچ پوچھا جائے تو وہ اِس سلطنت کے بلا شرکت غیرے مالک ہیں۔ اگر میں طنز و مزاح کی کوئی کتاب دیکھتا ہوں جس میں مجتبیٰ حسین کی بجائے کسی اور کا پیش لفظ ہو تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے کسی سِکھ کی شادی کوئی مسلمان مولوی کروا رہا ہو اور مجھے یہی ڈر رہتا ہے کہ بعد میں اِس شادی کو تسلیم بھی کیا جائے گا یا نہیں۔

سہرا اور پیش لفظ میں بہت سی باتیں مشترکہ ہونے کے باوجود ایک بڑا فرق بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ جوں جوں شاعر کا رتبہ شاعری میں بڑھتا جاتا ہے اس کو سہرا لکھنے کو نہیں کہا جاتا۔ آپ کو یاد ہوگا بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے اپنے بیٹے شہزادہ جواں بخت کا سہرا غالبؔ جیسے بڑے شاعر سے لکھوا کر ایک اچھی خاصی کنٹروورسی پیدا کر لی تھی۔ زمانہ مغلیہ سلطنت کے زوال کا تھا اس لیے بات غالبؔ کے معذرت نامے پر ٹل گئی۔ ایسی ہی کنٹروورسی آج کے دور میں ہوتی تو اس کو حل کرنے کے لیے دو تین کمیشن بیٹھ چکے ہوتے اور مسئلہ حل ہونے کی بجائے زیادہ اُلجھ چکا ہوتا۔ سہرے کے برعکس پیش لفظ ہمیشہ بڑے ادیب سے لکھوایا جاتا ہے۔ اِس کی وجہ مجھے ٹھیک سے تو معلوم نہیں لیکن اقبال کے اس شعر میں ہلکا سا اشارہ ضرور ملتا ہے۔

سند تو لیجئے لڑکوں کے کام آئے گی
وہ مہربان ہیں اب پھر رہیں رہیں نہ رہیں

سہرے اور پیش لفظ میں فرق تو صرف اتنا ہی ہے۔ لیکن مشترکہ باتیں بہت سی ہیں۔ سہرا لکھنے والے کو دولہا میاں کی صورت میں وہ خوبیاں تلاش کرنی پڑتی ہیں جن کا اُس کی ذات میں نام و نشان نہیں ہوتا۔ حسنِ مردانہ میں وہ یوسف ثانی ہے۔ شجاعت اس میں ٹیپو سلطان کی سی ہے۔ حوصلہ اُس میں شیر ببر کا سا ہے۔ اور تو اور اس کے ماتھے کے پسینے کو آبدار موتیوں سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ مجھے یاد ہے جب میرا سہرا پڑھا جا رہا تھا تو مَیں نے آئینہ منگوا کر دیکھا تھا کہ یہ تغیرات میرے جسم میں کب نمودار ہوئے۔ سہرے کے پھولوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ باغِ اِرم سے آئے ہیں اور خود پریاں انہیں لے کر آئی ہیں۔ حالانکہ یہ سب کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ نکڑ والے گُل فروش سے خریدے گئے ہیں اور اُن کی قیمت ابھی چکانا باقی ہے۔ دولہا میاں کے ہر رشتہ دار کا نام لے لے کر کہا جاتا ہے کہ وہ سہرے پر سے قربان ہوا جا رہا ہے حالانکہ وہ سامنے بیٹھا جل بھُن کر راکھ ہو رہا ہوتا ہے کہ اتنے بدشکل ٹائروں کو پنکچر لگانے والے لڑکے کو دلہن کس بے وقوف نے دے دی۔ جب کہ میرا سرکاری دفتر میں کلرک لڑکا ابھی تک کنوارا بیٹھا ہے۔

یہی سب کچھ پیش لفظ لکھنے والے کو بھی کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا کام اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ کیونکہ سہرا سننے اور پڑھنے والے دولہا کے رشتہ دار اور یار دوست ہوتے ہیں اور سب کو پتہ ہوتا ہے کہ سہرا نویسی میں مبالغہ آمیزی سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن پیش لفظ لکھنے والوں کو خطرہ درپیش رہتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اِس پیش لفظ کو مصنف اور اس کے رشتہ داروں کے علاوہ کوئی قاری بھی پڑھ لے۔ اِس لیے کہنا تو اُسے وہی پڑتا ہے جو سہرے میں کہا جاتا ہے۔ لیکن کچھ اِس طرح سے کہ اُس پر سچ کا گمان ہو۔

مجتبیٰ حسین صاحب نے اب تک اِس آرٹ میں خوب مہارت حاصل کر لی ہے۔ مَیں اُن کے بہت سے پیش لفظ پڑھنے کے بعد ان کی استادی کو کچھ کچھ سمجھ پایا ہوں۔ مجتبیٰ حسین صاحب کا پیش لفظ ایک ایسے گواہ کے بیان کی طرح ہوتا ہے جو گھر سے طے کر کے نکلتا ہے کہ وہ ملزم کے حق میں بیان دے گا۔ ایسے گواہ پر آپ اگر کڑی نظر رکھیں تو آپ دیکھیں گے کہ جب اُسے کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر کہو کہ جو کچھ کہو گے سچ کہو گے اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہو گے تو وہ اپنا ہاتھ اِس چابکدستی کے ساتھ مقدس کتاب کی طرف لے جاتا ہے کہ کتاب میں اور اس کے ہاتھ میں چھ انچ کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اُس کا ہاتھ کتاب پر ہے وہ جھوٹ کیسے بولے گا لیکن اُسے علم ہوتا ہے کہ کتاب اور اُس کے ہاتھ میں کِتنا فاصلہ ہے۔ اور اس فاصلے کی وجہ سے وہ سچ میں جھوٹ کی کتنی آمیزش کر سکتا ہے۔

مجتبیٰ حسین صاحب نے پیش لفظ لکھنے کے جو اصول بنائے ہیں اُن میں سے پہلا یہ ہے کہ جہاں تک ہوسکے کتاب پر بات کرنے سے پرہیز کرو۔ وہ اپنے پیش لفظ میں اصل مضمون کے علاوہ اور سب باتیں کریں گے۔ ان کا طریقہ اُس عورت کا سا ہے جس سے جب پوچھا گیا کہ آپ کے کتنے بچے ہیں تو اُس نے جواب میں یہ نہیں کہا کہ چار ہیں بلکہ یوں کہا کہ اللہ کا فضل ہے۔ یہ ایک طرح سے سوال کا جواب بھی تھا اور نہیں بھی۔ اللہ کے فضل کے حساب سے آپ بچّوں کی تعداد دس بھی سمجھ سکتے ہیں اور دو بھی۔

دوسرا اصول اُن کا یہ ہے کہ ادیب میں جو خوبیاں ہیں اُن کو گنواؤ، اس کے عیبوں کی طرف پیٹھ موڑ کر بیٹھ جاؤ۔ مَیں نے سُنا ہے کہ کرناٹک کے کسی دوکاندار سے اگر پوچھا جائے کہ اُس کے پاس ماش کی دال ہے اور اُس کے پاس

اگر دال نہ بھی ہو تو وہ نفی میں کبھی جواب نہیں دیتا۔ آپ نے پوچھا ''کیوں بھیّا ماش کی دال ہے''۔ وہ کہے گا ''کالے چنے ہیں۔'' آپ نے پوچھا ''پنگ کا پوڈر ہے''۔ اُس کے پاس اگر نہیں ہے تو کہے گا کہ ''پسا ہوا دھنیا ہے''۔ مجتبیٰ حسین صاحب اِسی طرح کتاب کی کمیوں سے پہلو بچا کر نکل جاتے ہیں۔

تیسرا اصول اُن کا یہ ہے کہ صاحبِ کتاب کی کتاب پر تبصرہ کرنے کی بجائے وہ ادیب کے ساتھ اپنی ملاقاتوں اور تعلقات میں قاری کو اُلجھا کے رکھتے ہیں۔ اُن کی ملاقات کا میرے پاس ایک بڑا دلچسپ قصّہ ہے۔ ایک بار مَیں نے انہیں کہا کہ آپ نے فلاں صاحب کی کتاب کا پیش لفظ لکھا ہے۔ کہنے لگے ہرگز نہیں۔ مَیں نے کہا مَیں نے خود اپنی آنکھوں سے پڑھا ہے۔ کہنے لگے میں انہیں آج تک ملا ہی نہیں تو پیش لفظ کیسے لکھوں گا۔ مَیں نے جب کتاب نکال کر اُن کے سامنے رکھ دی تو کہنے لگے کہ ہاں یاد آیا۔ صاحبِ کتاب سے میری ایک ہی ملاقات ہوئی ہے، اور وہ اُس وقت جب وہ اپنی کتاب پر پیش لفظ لکھوانے کے لیے میرے ہاں آئے تھے۔ مَیں نے چند منٹ کے لیے اُن سے ملاقات کی اور پھر پیش لفظ لکھ دیا۔

صاحبِ کتاب سے قریبی رشتہ داری نکالنے کے لیے مجتبیٰ حُسین صاحب کو کِن کِن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے یہ بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ مجھے یہ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ صاحبِ کتاب وہیں کے رہنے والے ہیں جہاں ایک دفعہ مَیں چوتھی جماعت میں داخلہ لینے گیا تھا۔ اِس سے ثابت ہوا کہ میرے اور اُن کے تعلقات بڑے پُرانے ہیں۔ اس رشتہ داری کو پڑھ کر مجھے ایک قصّہ یاد آیا جو میرے والد صاحب سُنایا کرتے تھے۔ میرے والد کسان تھے۔ ایک دن اپنے کھیتوں کے پاس پیپل کے ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے کہ پاس کے گاؤں کا ایک چودھری وہاں سے گزرا۔ گاؤں کے اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میرے والد نے اُسے دعوت دی کہ وہ لسّی پی کر جائے۔ مسافر نے کہا کہ لسّی تو پیوں گا ہی، ساتھ کھانا بھی کھاؤں گا۔ والد نے کھانا منگانے کے لیے ایک ملازم کو گھر بھیجا اور مسافر سے پوچھا کہ کھانے کی فرمائش میں اس قدر خود اعتمادی کی وجہ کیا ہے۔ مسافر کہنے لگا کہ میری آپ سے رشتہ داری ہے۔ میرے گاؤں کی ایک گدھی بک کر آپ کے گاؤں میں آئی ہے۔ دونوں نے قہقہہ لگایا اور مِل کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد مسافر نے وطیرہ سا بنا لیا کہ وہ جب کبھی ہمارے گاؤں کے راستے سے گزرتا، گدھی والی رشتہ داری کی بنا پر ڈٹ کر کھانا کھاتا۔ اِس طرح کوئی چھ مہینے گزر گئے۔ ایک بار مُسافر آیا تو میرے والد نے اُسے لسّی کے لیے بھی نہ پوچھا۔ مُسافر نے حیران ہو کر کہا ''کیوں سردار جی آج کھانے کو نہیں کہو گے، وہ ہماری تمہاری رشتہ داری کیا ہوئی۔'' میرے والد نے جواب دیا۔ چودھری اب کیسی رشتہ داری اور کہاں کی رشتہ داری۔ وہ گدھی کل مر گئی ہے''۔

مجتبیٰ حسین صاحب کو مَیں نے ایک بار پوچھا کہ وہ پیش لفظ لکھنے کے لیے کہاں سے نئی نئی باتیں اور نئے نئے جملے ڈھونڈ لیتے ہیں۔ کہنے لگے صبح کی سیر کو جاتا ہوں تو پارک میں مکمل تنہائی ہوتی ہے۔ موسم خوش گوار ہوتا ہے۔ مَیں چلتا جاتا ہوں اور جملے اپنے آپ ذہن میں آتے رہتے ہیں۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ان پیش لفظوں میں مجتبیٰ حسین صاحب کی اچھی صحت کا راز مضمر ہے۔ انسان کوئی بھی کام کرے۔ اُس میں کچھ فائدہ تو ہونا ہی چاہیئے۔

ایک بار مَیں نے اُن سے پوچھا کہ یہ پیش لفظ آپ کو تو اچھی صحت بخشتے ہیں۔ لیکن صاحب کتاب کو بھی ان سے کچھ فائدہ ہوتا ہے کیا؟ کہنے لگے کبھی کسی سہرا لکھنے والے سے پوچھئے کہ اُس کے سہرے کی وجہ سے کبھی کسی دولہا کی ازدواجی زندگی خوشگوار بنی ہے کہیں۔ وہ کتنا بھی خوبصورت سہرا لکھے، دولہا میاں کو شادی کا عذاب تو بھگتنا ہی پڑے گا۔ مَیں تو پیش لفظ لکھ کر ادبی دولہوں کو ازدواجی زندگی میں دھکیل دیتا ہوں۔ آگے وہ جانیں اور اُن کی قِسمت!

پُختہ اعتقاد کا مرکزی ادیب

مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری نے ایسے ایسے لوگوں کو مزاح پڑھنے اور سمجھنے پر مائل کیا جن سے کبھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ یہ شریفانہ رویہ اختیار کرسکیں گے۔ اب انہیں اندازہ ہوا ہے کہ وہ سابق میں کتنا نقصان اُٹھاتے رہے ہیں۔

طنز و مزاح کا معاملہ ذرا نازک ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ فرمائشی پروگرام کی طرح کی کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی۔ تاہم مجتبیٰ کی مزاح نگاری کے زخمیوں کی تعداد کم نہیں ہے (طنز و مزاح سے آدمی زخمی ہی ہوتا ہے، یہ اور بات ہے کہ اُسے پتہ نہیں چلتا) بلکہ ان میں آبادی کے تناسب سے دن بہ دن اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے اور اُردو کے آخری قاری، اب بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کا جب بھی جی چاہتا ہے اور انہیں اپنے زخمیوں کو دیکھ آنا منظور ہوتا ہے تو وہ 'سیرِ گل' کے بہانے باہر نکل پڑتے ہیں اور اب تو وہ اس سلسلے میں دور دور کا سفر کرنے لگے ہیں۔ ملک اب ایک دوسرے کے اتنے نزدیک آگئے ہیں کہ سیر اور سفر میں کوئی فرق نہیں رہا ہے۔

یوسف ناظم (حیدر آباد، دکن)

اردو ادب کا سُپر مین

ڈاکٹر شہریار

(●)

کئی سال پہلے کی بات ہے۔ رات کے نو بجے ناصر الدین اسٹاف کلب کے کمرے میں داخل ہوئے اِن کے پیچھے ایک اور صاحب تھے۔ ہاتھ میں ہیلمٹ تھا۔ ناصر نے تعارف کرایا کہ یہ مجتبٰی حُسین ہیں اور دہلی سے اسکوٹر پر آپ سے ملنے آئے ہیں۔ مَیں نے غور سے دیکھا، آنکھوں کے بہت پیچھے سے ایک معصوم لیکن شریر چہرہ دکھائی دیا۔ ہم تینوں مل کر حسن عسکری (جو اس وقت سوشیالوجی کے صدر تھے اور آج کل انگلستان میں ہیں) کی کھوج میں نکل پڑے...... ملے تو ہم چار ہو گئے۔ ہم چاروں گھر آئے۔ میری بیوی نجمہ مجھے اس وقت گھر پر دیکھ کر حیران ہوئیں۔ لیکن باقی لوگوں سے ملیں تو ہمارے ارادوں کو سمجھ گئیں اور اپنے حصّے کا کام کرنا شروع کر دیا۔ مَیں اپنے حصّے کی محنت میں لگ گیا۔ تادیر محفل جمی۔ مجتبٰی اور ناصر واپس چلے گئے۔ مجھ میں پھر ملنے بلکہ بار بار ملنے کی خواہش چھوڑ کر۔

کچھ دنوں بعد کسی کام سے دہلی پہنچا۔ این سی ای آر ٹی کے گیسٹ ہاؤس میں ناصر کا مہمان ہوا۔ میزبان مجتبٰی ہوئے۔ میں حیدر آبادیوں کا پہلے ہی سے اسیر تھا۔ مجتبٰی کے خلوص نے ایک گرہ اور بڑھا دی۔ دہلی میں دھیرے دھیرے یہ بات بھی کھلی کہ مجتبٰی بھی نارنگ صاحب کے قریب ہیں۔ یہ قربت بڑھتے بڑھتے قرابت کی صورت اختیار کر گئی۔ اب میرے اور مجتبٰی کے بیچ سے ناصر غائب ہو گئے یعنی اب ہمارا عشق نتھے پیامبر کا محتاج نہ رہا۔ میرے احباب کا حلقہ بہت محدود ہے۔ دہلی میں دو ڈھائی آدمی میرے لیے سب کچھ تھے اور ہیں۔ ان سے ملنے کے بعد میں خود کو مجتبٰی کے حوالے کر دیتا ہوں اور وہ ہر سفر میں کم سے کم تین نئے آدمیوں سے ملواتے ان سے میری خاطر کرواتے اور ان کو میرے شعر بھی سنواتے ہیں۔ ان ملنے والوں میں ادیب شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے ان سے میرے تعارف میں پہلے ''گمن'' اور پھر ''امراؤ جان'' کی غزلوں کی طرف اشارہ ضرور کرتے ہیں۔

مزاح نگاری کی وجہ سے ان کے مزاج میں مبالغہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ (یا یوں کہیئے کہ مزاج کے مبالغے نے مزاح نگاری کی طرف انہیں لگایا ہے) اس لیے وہ دوستوں کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ یہ پتا نہیں چلتا کہ تعریف کہاں ختم ہوئی اور کھنچائی کہاں شروع ہوئی۔ کچھ لوگوں کی تعریف میں البتہ احتیاط برتتے ہیں۔ مَیں اُن میں سے ایک ہوں۔ اس کے باوجود ان کی صحبت میں ہر آن چوکنّا رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اُردو کا شاید ہی کوئی ادیب ایسا ہو جو دہلی آئے اور مجتبٰی سے بغیر ملے واپس چلا جائے۔ یعنی اُنہوں نے ادیبوں کی پولیس چوکی کھول رکھی ہے جہاں آمد اور روانگی دونوں درج ہوتی ہیں۔ مجھے اب عادت سی پڑ گئی ہے۔ پہنچتے ہی اور اب ٹیلی فون کی آسانی کی وجہ سے پہنچنے سے پہلے ان کو اطلاع کر دیتا ہوں اور واپسی سے پہلے اجازت لے لیتا ہوں، میں کس سے ملوں گا، کیا کھاؤں گا، کیا پیئوں گا، کب تک رہوں گا۔ یہ سب کچھ مجتبٰی طے کرتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے خود پر غصّہ آنے لگتا ہے۔ وہ شخص جو آج تک زن مرید نہیں ہوا مجتبٰی مرید کیونکر ہو گیا۔

موصوف صرف باتیں نہیں کرتے کام بھی کرتے ہیں۔ یعنی بڑے کام کے آدمی ہیں۔ دہلی بلکہ ہندوستان میں کوئی جائز کام اور ضرورت پر ناجائز کام بھی آپ کو کرانا ہو تو مجتبٰی سے رجوع کیجئے۔ شرط یہ ہے کہ وہ آپ کو اپنا دوست سمجھتے ہوں۔ وہ اور ان کا اسکوٹر اس وقت تک دم نہیں لیتے جب تک کام مکمل نہ ہو جائے۔ ان کے معمولات کا اندازہ ان کے اس قول سے کیا جا سکتا ہے کہ دن اور رات کہیں بھی گزار و صبح کو اپنے بستر سے اُٹھو۔ اِن کی بیوی یعنی میری بھابھی ان کی اسی ادا پر جان دیتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ اُنہوں نے یہ بات شادی کی پہلی رات کو مجھ سے کہی تھی۔ زبان کے بڑے پکے ہیں آج تک اس بات پر قائم ہیں۔ این سی ای آر ٹی کی کتابوں کو چھپوانے اور ٹھکانے لگانے کے علاوہ ان کا کام دوسروں کے لیے روزی ڈھونڈنا، مکان تلاش کرنا، دوستیاں کرانا، ضرورت مندوں کو منسٹروں سے ملوانا، الیکشن کے ٹکٹ دلوانا، اخباروں میں لوگوں کے فوٹو اور ان کے کارناموں کی خبریں چھپوانا، کتابوں کی رسم اجراء پر ادیبوں کے خاکے ہی نہیں لکھنا بلکہ پیسوں کی فراہمی کا انتظام کرنا، پاسپورٹ اور ویزا بنوانا، شوہر اور بیوی کے خراب تعلقات کو درست کرنا اور تعلقات کی خرابی کے قانونی اور کبھی کبھی طبّی نکات پر روشنی ڈالنا، مَیں کہاں تک گنواؤں موصوف کا دائرہ عمل۔ بس یوں سمجھ لیجئے اردو میں یہ پہلے اور آخری سپر مین ہیں، خود ان کا کہنا ہے کہ Too Much تک سب جا سکتے ہیں مگر ہم Three Much ہیں اور مرتے دم تک اس پر قائم رہیں گے۔

کبھی کبھی ہم دبی زبان سے بچوں اور بیوی کے حقوق کا ذکر کرتے ہیں لیکن بہت جلد کسی دوسرے اہم حق اور فرض کو یاد کر کے اپنے اوپر گھڑوں پانی ڈال لیتے ہیں۔ ہندوستان کی سیاحت سے تھک جاتے ہیں تو بیرون ملک نکل جاتے ہیں۔ کبھی مشرق کی طرف تو کبھی مغرب کی طرف۔ مَیں جب فرانس اور انگلستان کے سفر پر جا رہا تھا تو انہوں نے اپنے آشناؤں کے اتنے ڈھیر سارے پتے اور فون نمبر دیئے تھے کہ مجھے ہینڈ بیگ کے سامان کو سوٹ کیس میں منتقل کرنا پڑا۔ پردیس میں ان میں سے کئی پتے اور ٹیلیفون نمبر میں نے استعمال کئے اور مجتبٰی کا قائل ہوا۔ پتا نہیں وہ کون سا خلوص ہے جو مجتبٰی استعمال کرتے ہیں کہ آدمی ان کا اسیر ہو جاتا ہے، میں نے کئی بار ان کا برانڈ جاننا چاہا لیکن اُنہوں نے کبھی بتا کر نہیں دیا۔

علی گڑھ میں جب سے ہاشم علی صاحب وائس چانسلر ہو کر آئے ہیں

مجتبیٰ کی آمدورفت بڑھ گئی ہے۔ وہ عام طور سے کسی کی سفارش لے کر آتے ہیں۔ ہاشم علی صاحب کے کہنے کے باوجود وہ ٹھہرتے میرے ہی یہاں ہیں۔ علی گڑھ کے کئی لوگ بغیر مجھے بتائے ہوئے، میرے حوالے سے ان سے مل چکے ہیں اور ان سے اپنا کام کرا چکے ہیں— عابد علی خان ان کی سب سے بڑی کمزوری ہیں۔ وہ جب دہلی آتے ہیں تو مجتبیٰ کا پروگرام ان کے پروگرام کے تابع ہوجاتا ہے۔ جب تک ہوائی جہاز ایئر پورٹ سے اُڑ نہیں جاتا مجتبیٰ اپنے میں واپس نہیں آتے۔ زندہ دلان حیدرآباد کے تمام اراکین پر وہ جان چھڑکتے ہیں۔ اقبال سمینار کے دوران میں ان لوگوں سے اجتماعی طور پر ملا۔ فرداً فرداً تو پہلے بھی مل چکا تھا۔ واقعی زندہ دل لوگ ہیں۔

حیدرآباد کو اپنے پورے جمال میں مجتبیٰ کے ساتھ ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ میرا کئی بار کا تجربہ ہے۔ حیدرآباد کا کوئی قابلِ ذکر شخص ایسا نہیں ہے جو مجتبیٰ کو نہ جانتا ہو۔ دہلی میں حیدرآباد کی سفارت کا کام مجتبیٰ کرتے ہیں۔ آندھرا پردیش گیسٹ ہاؤس کا ایک چکر ان کے روز مرہ کے معمول میں ہے۔ حسینی صاحب اور مجتبیٰ جب مخصوص حیدرآبادی لہجے میں حیدرآباد سے آنے اور حیدرآباد کو جانے والے اشخاص کا ذکر کرتے ہیں تو بڑا اچھا لگتا ہے۔

مجتبیٰ میں اختراعی قوت بے پناہ ہے۔ جو اس قوت کی زد میں آیا رُسوا ہوا۔ وہ ذراسی بلکہ معمولی سی بات میں ایسی نمک مرچ لگاتے ہیں کہ خُدا کی پناہ۔ ان دنوں ان کو ایک غم بہت ستا رہا ہے۔ میں ان کے غم کو کم کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں لیکن یہ مرض بڑھتا ہی جارہا ہے۔ مَیں کھاؤں کہاں کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ کے مصداق عجیب مخمصے میں ہوں۔

مجتبیٰ اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی رگ رگ سے واقف ہیں۔ ان کی فطری کمزوریوں کو وہ خوب خوب ہوا دیتے ہیں اور پھر اپنے قلم سے ان کو زندہ جاوید کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے بعض کمزور خاکوں کی طرف جب میں نے اشارہ کیا تو ان کا برجستہ جواب یہ تھا کہ جس ادیب کی کوئی شخصیت نہ ہو، مَیں اس کا اچھا خاکہ کیوں کر لکھ سکتا ہوں۔ فرمائشی کام تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مَیں اور مجتبیٰ کئی بار مرتب زندگی گزارنے کا میلان بنا چکے ہیں۔ لیکن جس طرح ہندوستان کا کوئی پنج سالہ منصوبہ کامیاب نہیں ہوا، ہمارا منصوبہ بھی ناکام رہا ہے۔ شاید ہم لوگوں کی بنیادوں میں کچھ کجی ہے۔ مجتبیٰ میں کئی کمزوریاں ہیں جو ان کی شخصیت کی دلنوازی کی وجہ سے کسی کو نظر نہیں آتیں یہ لوگوں کا کہنا ہے۔ مجھ میں ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ مَیں کسی دوست کی کمزوری کو دیکھ ہی نہیں سکتا۔ بلکہ کمزوری کو اس کی طاقت تصوّر کرتا ہوں اور اس بات پر لڑ جاتا ہوں۔ مجتبیٰ سے ایسی لڑائیاں کئی بار ہو چکی ہیں۔

چند سالوں پہلے مجتبیٰ کے تعارف میں ان کے بڑے بھائی ابراہیم جلیس کا ذِکر ضرور شامل ہوتا تھا لیکن دھیرے دھیرے مجتبیٰ نے ادبی میدان میں ایک ایسا مقام بنالیا ہے کہ خود مکتفی ہوگئے ہیں۔ یہ ایک بڑی بات ہے۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ مجتبیٰ میرے بہت قریبی دوست ہیں۔ خدا ان کو اور بھی بلندیوں تک لے جائے۔ سلور جبلی کے بعد ان کی گولڈن جبلی ہو۔

مجتبیٰ حسین

مخدوم محی الدین کے بعد مجتبیٰ حسین وہ واحد فن کار ہیں جنہیں حیدرآبادیوں نے ٹوٹ کر پیار کیا۔ جو بات انہوں نے مخدوم صاحب کے بارے میں لکھی تھی وہ ان پر بھی پوری طرح صادق آتی ہے۔ ''مخدوم کو حیدرآباد سے بے پناہ پیار تھا جسے وہ ہمیشہ وطن مالوف کہا کرتے تھے۔ حیدرآباد مخدوم کے اندر تھا اور مخدوم حیدرآباد کے اندر۔ حیدرآباد کی گلی گلی میں ان کے چرچے تھے۔ حیدرآبادیوں نے انہیں ٹوٹ کر چاہا بھی۔''

شمال میں حیدرآبادیوں اور بہاریوں کو احمقانہ حد تک سادہ لوح سمجھا جاتا ہے۔ بقول وحید اختر: ''بہاری اپنی جارحانہ مقامی عصبیت کی بنا پر ہدف طنز بنتے رہے اور حیدرآبادی اپنے ضرورت سے زیادہ غیر جارحانہ، مرنجاں مرنج، صلح کن اندازِ معاشرت کی وجہ سے ضعیف الارادہ وضعیف الفہم سمجھے گئے۔'' مجتبیٰ حسین اس کے برعکس ثابت ہوئے۔ وہ دلی والوں کے لیے ناگزیر بن گئے۔ مجتبیٰ حسین نے دلی والوں کو مفلوج بنادیا، اتنا مفلوج کہ بغیر مجتبیٰ کے نہ ان کی ضرورتیں پوری ہوسکتی تھیں اور نہ ادبی محفلیں۔ تعزیتی جلسوں تک میں مجتبیٰ حسین نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں خاکے سنائے۔ سننے والے کشش و پنج میں مبتلا ہوگئے کہ انہیں قہقہے لگانا چاہئے یا خاموش رہنا چاہئے۔ جب وہ مجبور ہوکر ہنسنے لگتے تو مجتبیٰ اپنے خاکوں کو ایسے موڑ پر لے آتے کہ لوگ ہنستے ہنستے اچانک رونے پر مجبور ہوجاتے۔ بنے بھائی کے تعزیتی جلسے میں ایسی ہی سچویشن ہوگئی تھی۔

پروفیسر بیگ احساس (حیدرآباد، دکن)

مجتبیٰ حسین اور طنز و مزاح

شمس الرحمٰن فاروقی

(الہٰ آباد، بھارت)

مزاح نگار کو ہمارے یہاں عام طور پر درجۂ دوم کا فن کار اور مزاح نگاری کو درجۂ دوم کی چیز سمجھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہماری زبان یا ہمارے ملک میں مزاح کی صلاحیت نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو زبان اور اس کے بولنے والوں میں مزاح کی صلاحیت عام جدید ہندوستانی زبانوں اور ان کے بولنے والوں سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری زبان جن عناصر سے مرکب ہے، یعنی سنسکرت اور فارسی، دونوں میں اعلیٰ مزاح کی روایت بہت قدیم اور بہت وسیع رہی ہے۔ دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں کی طرح سنسکرت، فارسی اور پھر اُردو میں بڑے ادیبوں نے مزاح کو نام نہاد سنجیدگی سے الگ کوئی چیز نہیں سمجھا۔ موجودہ زمانے میں بعض لوگوں نے یہ خیال کیا کہ مزاحیہ اور طنزیہ تحریریں صرف ہلکی پھلکی تحریریں ہوتی ہیں۔ ان میں کوئی گہرائی یا وزن نہیں ہوتا یا اگر ہوتا بھی ہے تو اس درجہ نہیں جس درجہ کسی سنجیدہ تحریر میں ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انگریزی تعلیم کے بعض غلط نتائج نکلے، کیونکہ زیادہ تر لوگ انگریزی یا مغربی ادب سے پوری طرح واقف نہیں تھے۔ ان کا مُبلغ علم سُنی سنائی باتوں یا ادھر اُدھر کی باتوں تک محدود تھا۔ پھر انگریزی تنقید کے بعض اہم نمائندوں کی ایک آدھ تحریر پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کیا گیا۔ مثلاً آرنلڈ نے سو برس پہلے لکھا کہ ڈرائڈن اور پوپ انگریزی شاعری کے نہیں بلکہ انگریزی نثر کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ پھر کیا تھا، لوگ فوراً ایمان لے آئے کہ جب آرنلڈ جیسا نقاد اور پوپ جیسے بڑے طنز و مزاح نگار شعراء کو شاعروں کی فہرست سے ہی خارج کر رہا ہے تو اُردو کے چھٹ بھیّوں کی کیا اوقات ہے۔ لوگ یہ بھول گئے کہ آرنلڈ کا قول غلط بھی ہوسکتا ہے۔ لوگ یہ بھی بھُول گئے کہ آرنلڈ کی اس رائے کو اس کے زمانے میں بھی بہت سے لوگوں نے قبول نہیں کیا اور اس کے پچیس ہی تیس برس بعد ٹی ایس ایلیٹ نے ان شاعروں کی تعریف کی بلکہ بڑی شاعری کی ایک صفت یہ بھی بتائی کہ اس کو پڑھ کر پوری طرح نہیں کھلتا کہ شاعر سنجیدہ ہے یا مذاق کر رہا ہے یا سنجیدہ بھی ہے یا مذاق بھی کر رہا ہے۔ غالب اور میر کے یہاں یہ صفت واضح ہے۔ لیکن ہم لوگوں نے ان کے یہاں بھی ایسے شعروں کو نظر انداز کر دیا بلکہ اکثر ان پر شرمندہ بھی ہوئے کہ صاحب یہ پُرانے زمانے کے نیم مہذب لوگ تھے، ان کی عمر کا لحاظ کر کے انہیں معاف کر دیجئے۔

لیکن سارا قصور انگریزی تعلیم کا نہیں ہے کیوں کہ اسی انگریزی تعلیم کے دورے کے زمانے میں ہمارے یہاں اکبر الہ آبادی جیسا عظیم طنز و مزاح نگار پیدا ہوا۔ اسی زمانے میں اقبال تک نے ظریفانہ شعر کہے اور ان لوگوں کے فوراً بعد ہمارے یہاں رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری نے ہمارے ادب کو مالا مال کیا۔ اسی زمانے میں ظریف لکھنوی بھی تھے اور خواجہ حسن نظامی بھی۔ ظریفانہ ادب اور ادیب کی تقلیل قدر یعنی Devaluation کی کچھ ذمّہ داری ہمارے ظریفانہ ادیبوں پر بھی ہے، جنہوں نے بھونڈے پن کو ظرافت اور کھردرے جھنجھلائے ہوئے اندازِ بیان کو طنز نگاری سمجھا۔ طنزیہ مزاحیہ ادیب کی پہلی صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ خود کو دنیا والوں اور رسم و رواج سے بندھی ہوئی ان کی ذہنیت سے برتر اور الگ سمجھتا ہے یعنی طنز و مزاح قائم اسی وقت ہوتے ہیں جب ہم طنز نگار یا مزاح نگار کی ذہنی برتری یا اخلاقی برتری کو قبول کریں۔ طنز و مزاح نگار اگر دنیا اور اہلِ دنیا کو حقیر یا بے وقوف یا نا سمجھ نہ سمجھے تو اس کی تحریر کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا۔ لیکن ذہنی اور اخلاقی برتری کا یہ رویّہ لطیفہ بازی، جملہ بازی، دانت پیس کر کوسنے، گلا پھاڑ کر چلاّنے سے نہیں قائم ہوتا۔ ہمارے زمانے کے ظریفانہ ادیبوں نے خود کو مسخرا یا جھگڑالو بنا کر پیش کرنا پسند کیا۔ ذہنی اور اخلاقی برتری نصیب نہیں تھی، ان میں سے اکثر میں وہ Malice یا کینہ توزی بھی نہ تھی جس نے سودا سے شاہ ولی اللہ جیسے محترم اور مقدس اور مفکر بزرگ اور مرزا مظہر جانِ جاناں جیسے مرنجاں مرنج اور فرشتہ صفت صوفی کی ہجوئیں لکھوائیں۔ لہٰذا اُنہوں نے خود کو بھانڈ یا محفل کی وقت گزاری کو آسان کرنے والے لطیفہ گو یا فقرہ باز یا بات بات پر گالیاں سنانے والے سٹھیائے ہوئے بڈھے کے روپ میں پیش کرنے میں عافیت سمجھی۔

ہمارے زمانے کے اکثر طنز و مزاح نگار اپنے لیے ''میں'' کے بجائے ''ہم'' کا استعمال کرتے ہیں، کیونکہ ''ہم'' میں ایک طرح کی گم نامیت Anonymity ایک طرح کی مسکینی اور عاجزی ہے۔ یہ وہ ''ہم'' نہیں ہے جو غزل کا شاعر استعمال کرتا ہے، بلکہ یہ وہ ''ہم'' ہے جسے لوگ عام بول چال میں گھریلو انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے اکثر طنزیہ مزاحیہ مضامین میں ''ہم'' ایک سادہ لوح شخص کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ یہ سادہ لوح شخص بیوی سے ڈرتا ہے، دوست اس کی شرافت اور سیدھے پن کا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ دفتر میں یا کاروبار میں اسے ترقی نہیں ملتی۔ اس کی خوبی صرف یہ ہے کہ وہ موقع بے موقع بھونڈے یا سپاٹ لطیفوں سے اپنی باتوں کو قابلِ برداشت بناتا ہے۔ مرزا مظہر جان جاناں اور میر کے بارے میں سودا کے اشعار، خواجہ سرا کی ہجویں، میر کے اشعار، ظہور اللہ نوا کی ہجویں، جرأت کا مخمس، انگریزی تہذیب کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہندوستانی نوجوانوں کے بارے میں اکبر کی نظمیں پڑھ کر جس شخصیت کے خدو خال سامنے آتے ہیں اس کو آپ ناپسندیدہ کہہ سکتے ہیں، اس سے دوستی کرنا آپ شاید پسند نہ کریں، لیکن آپ اسے گھر گھسنا، نکھٹو، زن مرید، دوستوں اور ساتھیوں کے فقروں کا ہدف نہیں کہہ سکتے۔ نہ ہی آپ اسے کٹ کھنا، چڑچڑے بوڑھے کی طرح بڑبڑاتا ہوا کوئی مجہول الحال لفظوں کا بھاڑ جھونکنے والا کہہ سکتے ہیں۔ آج

کل ہمارے زیادہ تر مزاح وطنز نگار جس شخصیت اور ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ انہیں دو خانوں میں سے ایک میں فِٹ ہو سکتی ہے۔

مزاح میں گہرائی طنز کے بغیر نہیں آسکتی اور طنز کی پہلی شرط غصّہ نہیں بلکہ فکر ہے۔ یہ سمجھنا کہ طنز نگار کا میلان مفکرانہ نہیں ہوتا طنز نگاری اور کالم نگاری کو خلط ملط کرنا ہے۔ مفکرانہ میلان سے میری مُراد یہ نہیں کہ طنز نگار کسی فلسفے کی تلقین کرتا ہے یا وہ افلاطون اور ارسطو کی کتابیں پڑھ کر ان کے خیالات کو بیان کرتا ہے۔ مفکرانہ میلان سے مراد یہ ہے کہ طنز نگار خود کو دنیا اور اہل دنیا کی کمزوریوں اور مجبوریوں سے اوپر سمجھتا ہے لیکن وہ ان کمزوریوں اور مجبوریوں سے بخوبی واقف ہوتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ وہ خود بھی ان برائیوں کا شکار ہو سکتا ہے۔ اس میں کھلنڈرا پن نہیں ہوتا لیکن ایک طرح کی Irreverence اس میں ضرور ہوتی ہے جیسا کہ S.J. Perelman نے کہا ہے، لوگوں کے کولہوں میں کبھی کبھی سوئی چبھوتے رہنا چاہیے۔ لیکن یہ Irreverence سرکس کے مسخرے والی حرکت نہیں ہوتی جو ہیروئن کو چپت لگا کر خود چاروں شانے چت گر جاتا ہے۔ ہمارے زمانے کے اکثر ظریفانہ ادیبوں نے خود کو میؔر کے شیخ کے مصداق بنا لیا۔

شہرہ رکھے ہے تیری حُرّیت جہاں میں شیخ
مجلس ہو یا کہ دشت اچھل کود ہر جگہ

بہت دن پہلے جب مَیں نے مجتبیٰ حسین کی تحریریں پڑھی تھیں تو ان کی نثر کی چُستی اور بھونڈے اچھل کود والے لطیفوں اور فقروں سے ان کے اجتناب کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوا تھا کہ اعلیٰ مزاحیہ تحریروں کا گھر جو ایک عرصہ سے اُردو میں بند پڑا تھا آہستہ آہستہ کھُل رہا ہے۔ میں نے اس وقت بھی ان کا خیر مقدم کیا تھا جب وہ حیدر آباد کے ایک بالکل نو آمدہ لیکن چلبلے اور کسی طائرِ نو پر کی طرح نئی نئی اڑانیں بھرنے کے شائق مزاح نگار کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آئے تھے۔ پچھلے بیس برسوں میں مَیں نے بہت سے نئے ادیبوں سے توقعات وابستہ کیں، اور ان میں سے اکثر نے بعد میں مایوس کیا۔ یہ بھی ہمارے زمانے کا المیہ ہے کہ لوگوں کے شعلے بہت جلد بجھ جاتے ہیں یا شاید اب کے لوگ کاروبار ادب میں روحانی اور داخلی منفعت کے بجائے شہرت اور مالی منفعت زیادہ تلاش کرتے ہیں۔ بات جو بھی ہو، میری کتابوں کی الماریاں ایسے مجموعوں سے بھری پڑی ہیں جن میں شامل تحریروں کے لکھنے والے آج یا تو خاموش ہیں یا پہلے سے بہت خراب لکھ رہے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کے بارے میں مجھے یہ خوف کئی سال تک رہا کہ یہ چمک دمک یہ آن بان کہیں چار دن کی چاندنی نہ ہو۔ میں نے ان کی ہر تحریر کو اور بعد میں جب ان سے ملاقات ہوئی اور ملاقاتیں ہونے لگیں تو خود ان کو اسی غور اور شوق اور تشویش سے دیکھا جس غور اور شوق اور تشویش سے کوئی ماہر نباتات کسی ایسے پودے کو دیکھتا ہو جس کا دنیا میں صرف ایک نمونہ ہو اور جس پر اس پودے کی تمام نسل کے قیام واستقلال کا دارومدار ہو۔ وہ جس طرح ہر ہر پتی، ڈالی کی ہر نوک اور پھننگی کو توجہ سے دیکھتا ہے کہ کہیں مُرجھا تو نہیں رہی ہے، کمزور تو نہیں پڑ رہی ہے، اسی طرح مجتبیٰ حسین اور ان کی تحریروں کو دیکھتا تھا کیوں کہ مجھے یقین ہی نہ آتا تھا کہ ایسا طرحدار مزاح نگار دس پانچ برس کے بعد بھی ترقی کرتا رہے گا۔ کیا معلوم ہمارے بزرگ مزاح وطنز نگاروں کا بھونڈا پن، ان کا مسخرا پن، ان کی تلملاتی ہوئی جھنجھلاہٹ اس پر کب اثر انداز ہو جائے۔ لیکن مجتبیٰ حسین نے میں ہی کیا مجھ سے بہتر لوگوں کو بھی حیرت میں مبتلا رکھا۔ اور اب جب کہ ہم ان کے سفرنامۂ جاپان کا خیر مقدم کرنے یہاں جمع ہوئے ہیں تو اس اطمینان اور یقین کے ساتھ کہ ابھی اِس کنوئیں میں کئی ڈول پانی ہے۔

معاصر ظریفانہ ادیبوں میں دو ہی چار ایسے ہیں جنھوں نے طنز و مزاح کی ادبی حیثیت کو دوبارہ مستحکم کیا ہے۔ ایسے لوگوں میں مجتبیٰ حسین کا نام بہت نمایاں ہے۔ مشتاق احمد یوسفی ظاہر ہے، اس گروہ کے سردار ہیں۔ کوئی اور اصطلاح میسّر نہ ہونے پر مَیں ان لوگوں کو ادبی مزاح وطنز نگار کہتا ہوں۔ اس وجہ سے نہیں کہ مشتاق احمد یوسفی کی طرح مجتبیٰ حسین کے یہاں بھی اُردو کے ادب عالیہ کی روایت اور اس کے کارناموں سے گہری واقفیت کا اظہار ہوا ہے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ ان لوگوں نے طنز ومزاح کی اس روایت کو زندہ کیا ہے جس کا سلسلہ سوداؔ اور میؔر سے لے کر پطرس بخاری تک پھیلا ہوا ہے۔ مجتبیٰ حسین ابھی ''ہم'' کے جال سے اور لطیفہ گوئی کے گورکھ دھندے سے پوری طرح آزاد نہیں ہوئے ہیں۔ شاید وہ وقت نزدیک ہی ہے جب وہ ان بیساکھیوں کو بالکل ترک کر دیں گے لیکن جو چیز ان کی سب سے بڑی قوت ہے وہ یہ کہ انہیں زبان کو مزاحیہ طریقے سے برتنے کا سلیقہ آتا ہے جیمس تھربر James Thurber نے New Yorker کے ایڈیٹر ہیرالڈ راس Harold Roses کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ جس مزاح نگار کو کم تر درجے کا قرار دیتا تھا اس کے بارے میں وہ کہتا تھا کہ He is not funny he does not know English یعنی اس کی ظرافت مزے دار نہیں ہے اس کو زبان نہیں آتی۔ تھربر کہتا ہے کہ جب راس سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی اور تھربر نے اس کو اپنی لیاقتوں کی فہرست بتائی تو راس نے پوچھا ''وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن تم کو انگریزی آتی ہے کہ نہیں؟'' تھربر نے جواب دیا کہ ''کیوں نہیں آتی''؟ تو راس نے کہا ''خدا غارت کرے، انگریزی کسی کو نہیں آتی''۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مزاح نگار کو زبان کی قوّت کا اندازہ ہونا کس قدر ضروری ہے۔ ہنسی پیدا کرنے والے واقعات تو ہَما شُما سب نکال لیتے ہیں لیکن زبان کو اس طرح برتنا کہ تضاد، تناسب، توازن کے ذریعہ، ہنسی والی بات بن جائے ہر ایک کا کام نہیں۔ مجتبیٰ حسین ان تینوں طریقوں کو بہت خوبی سے برتتے ہیں۔ ''ہمارے معاشرے کی خرابی یہ ہے کہ جب بھی زمین پر کوئی آفت آتی ہے تو آسمان کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔'' ''کپڑے بنانے والی کمپنیاں ہمیشہ اپنے کیلنڈروں پر ایسی حسیناؤں کی قد آدم تصویر چھاپتی ہیں جن کے بدن پر گھڑی اور انگوٹھی کے سوائے کوئی لباس نہیں ہوتا۔'' ''مہنگائی کا یہ عالم ہے کہ اس شہر میں

ہمیں اپنے سوا کوئی اور سستی چیز نظر نہیں آتی۔'' ''کمرہ اتنا چھوٹا ہے کہ اس میں کسی خواب کے داخل ہونے کی گنجائش نہیں ہے۔'' ان جملوں میں وہ باریکیاں ہیں جو تخلیقی زبان میں ہوتی ہیں۔

پھر یہ بھی ہے کہ مجتبیٰ حسین کو غیر متوقع Connections ملانا خوب آتا ہے۔ یہ صفت بھی زبان کے خلاقانہ استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔'' قدرت اللہ مجھ سے ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ وہ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ درست بھی تھا کیوں کہ ایک بار میں نے خود اپنی آنکھوں سے انہیں سوکھی روٹی کا ٹکڑا چٹنی کی مدد سے کھاتے اور بعد میں پانی پیتے دیکھا تھا۔'' ایک زمانے میں انگریزی تعلیم کے زیر اثر لوگوں کا خیال تھا کہ Incongruity مزاح کا جوہر ہے۔ بات صحیح ہے لیکن Incongruity کا مطلب بے تکا پن نہیں، بلکہ غیر متوقع چیزوں کو یک جا کرنا ہے۔ مجتبیٰ حسین اِس کے ذریعہ طنز کا بھی کام لیتے ہیں۔ ان کی شگفتگی کو دیکھ کر بعض لوگ اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ وہ معاصر دنیا سے خاصے ناراض بھی ہیں اور ان کا مزاح ان کے طنز سے الگ نہیں ہے۔'' جاپان چلو جاپان چلو'' میں ان کی ناراضگی ذرا کم جھلکتی ہے۔ ویسے یہ ٹھیک بھی ہے، کیوں کہ میں انہیں سفرنامہ نگار یا نامہ نگار نہیں سمجھتا بلکہ میں انہیں پطرس بخاری کی کرسی کی طرف بڑھتا ہوا دیکھنا پسند کرتا ہوں—!

مجتبیٰ حسین: ایک تاثر

مجتبیٰ حسین اس دور کے ممتاز مزاح نگاروں میں سے ہیں۔ اردو دنیا میں مشتاق احمد یوسفی کے بعد ان ہی کی شہرت ہے۔ وہ طنز نگار نہیں مزاح نگار ہیں۔ طنز نگار کا بقول رشید احمد صدیقی عام طور پر کوئی ''کو بڑ'' ہوتا ہے مگر مزاح نگار کسی ایک کو بڑ کے بجائے کئی سے کام لیتا ہے۔ وہ طنز نگار کی طرح ایک ''مجاہد'' نہیں ہوتا جو کسی میلان، روش یا شخصیت کے خلاف جہاد کرتا رہے بلکہ وہ زندگی کی ناہمواریوں پر، اس کے عجائبات پر اور شخصیتوں کے تضاد کا مذاق اُڑا کر زندگی کے لطف و انبساط میں اضافہ کرتا ہے۔ یوں تو مزاح نگار بھی کبھی کبھار طنز سے کام لیتا ہے۔ مگر طنز اس کا مقصد نہیں ہوتا ہے۔ طنز نگار کے ہاں بھی مزاح ہوتا ہے مگر اس کی برہمی اور بیزاری کا کوئی مخصوص ہدف ہوتا ہے۔ غالبؔ کے خطوط میں مزاح نگار کی ساری عظمت نظر آتی ہے۔ اکبرؔ کے ہاں طنز نگار اپنے سارے جاہ و جلال کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

مشتاق احمد یوسفی نے مجتبیٰ حسین کی تین خوبیاں بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ قلم برداشتہ لکھتے ہیں، دوسرے ان کے ہاں تکرار کا عمل نہیں ہے اور تیسرے ان کی تحریروں میں تر و تازگی برقرار ہے۔ ہمارے دور کے سب سے بڑے مزاح نگار اور طنز نگار کا مجتبیٰ حسین کو یہ خراجِ تحسین قابل ذکر ہے۔

اپنے ایک مضمون میں انہوں نے ایک جگہ ذکر کیا ہے کہ امریکہ جو جاتا ہے وہ اپنے آپ کہیں نہیں جا سکتا بلکہ اس کی ''میّت'' لے جانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس سے مجھے خیال ہوا کہ مجتبیٰ دراصل Wit کے مرد میدان یعنی بذلہ سنجی اور ذکاوت کا پیکر ہیں۔ Wit صرف لفظی ظرافت نہیں۔ لفظ سے ظرافت تو اس میں پیدا کی جاتی ہے مگر ذہن کی کارفرمائی بھی ضروری ہے۔ جدید تنقید میں Wit کو اس کی ہمہ گیری کی وجہ سے پہلے سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ میرے نزدیک Wit مزاح کا ایک مؤثر آلہ ہے۔ اس کی مثالیں مجتبیٰ حسین کے ہاں جا بجا ملتی ہیں۔ ادھر مجتبیٰ حسین کے خاکوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ اور ان کا جو کالم ''سیاست'' میں شائع ہوتا ہے بہت مقبول ہو رہا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ کمبل کو حاجی بغلول نے کراماً سے اٹھا کر کاتبین پر ڈال دیا۔ مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں کہ واشنگٹن امریکہ کا صدر مقام تو ہے ہی ہمارا بھی 'صدر مقام' ہے اس لیے امریکہ میں ہم جہاں بھی جائیں وہاں سے واشنگٹن پہنچتے ہیں پھر لوٹ کر آتے ہیں۔ Wit کی ایک اور مثال دیکھئے۔ مجتبیٰ حسین جب صادقین کے ہاں سے رخصت ہونے لگے تو بولے ''اچھا بھئی صادقین، ہم چلتے ہیں'' پھر اپنے ساتھی سے کہا ''اٹھاؤ لالٹین اور دباؤ نعلین در بغلین''

مجھے مجتبیٰ حسین کی زود نویسی سے یہ ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کہیں وہ اپنے آپ کو دہرانے نہ لگیں۔ ابھی تک بقول مشتاق احمد یوسفی ان کے مضامین میں تازگی برقرار ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور (●)

طنزومزاح کا خانہ خالی

مشفق خواجہ

(•)

ایک مرتبہ ہم نے شفیقہ فرحت کے حوالے سے لکھا تھا کہ ہندوستان میں طنزومزاح کا حال خاصا پتلا ہے،لیکن جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین بارہ بارہ کتابوں کے مصنف ہیں تو ہمارے دل میں ہندوستان کے اردو قارئین کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے۔ان بے چاروں کا حال بھی خاصا پتلا ہوگا!

یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کی ہمت کی داد دینی چاہیے کہ ایک ایسے زمانے میں جب اپنا لکھا آپ پڑھنے کی روایت مضبوط بنیادوں پر قائم ہے، انہوں نے بارہ بارہ کتابیں لکھ کر اردو زبان کی ناقابلِ فراموش خدمت کی ہے۔ ان کا یہ احسان ہمیشہ اردو زبان پر رہے گا۔یہ دوسری بات ہے کہ اس احسان کے بوجھ سے اردو کی گردن جھک جائے۔واضح رہے کہ ''گردن جھکنا'' ایک محاورہ جس کے دو معنی ہیں۔ایک احسان سے زیر بار ہونا اور دوسرے شرمندہ ہونا۔ہم نے یہ محاورہ پہلے معنوں میں استعمال کیا ہے۔قارئین سے درخواست ہے کہ وہ بھی ان ہی معنوں سے سروکار رکھیں، دوسرے معنوں کو لغت نویسوں کی غلطی سمجھیں۔آخر لغت نویس بھی ہماری آپ کی طرح انسان تھے اور انسان خطا کا پُتلا ہوتا ہے۔لغت لکھی جائے یا کوئی عام کتاب، ایک کتاب لکھی جائے یا بارہ کتابیں، غلطی کا امکان بہرحال رہتا ہے لیکن صورت حال اُس وقت سنگین ہوجاتی ہے جب بارہ کتابوں کے بعد تیرھویں کتاب بغیر لکھے وجود میں آجائے۔

ممکن ہے بعض لوگ اوپر کے پیراگراف کے آخری جملے کو مہمل قرار دیتے ہوئے یہ پوچھیں کہ کوئی کتاب لکھے بغیر کس طرح وجود میں آسکتی ہے۔ہم پورے پیراگراف کو مہمل ماننے کے لیے تیار ہیں لیکن آخری جملے کو نہیں۔اس کے بامعنی ہونے کا ثبوت اس وقت ہمارے سامنے ہے۔

یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین نے جو بارہ بارہ کتابیں تصنیف کی ہیں، ان کے انتخابات حال ہی میں شائع ہوئے ہیں جس کے نتیجے میں اب وہ تیرہ تیرہ کتابوں کے مصنف بن گئے ہیں۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ آج کل ہندوستان میں یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کے ناموں کا ڈنکا بج رہا ہے۔(معلوم نہیں خود بج رہا ہے یا دونوں خود ہی بجا رہے ہیں) جس رسالے کو اٹھایئے اس میں ان دونوں کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین، شخصی خاکے اور سفرنامے نظر آتے ہیں۔ہندوستان بھر میں طنزومزاح کی کانفرنسیں ہوتی ہیں اور ان کانفرنسوں کی کامیابی کا سہرا انھیں دونوں کے سر بندھتا ہے (سر کا کچھ نہ کچھ مصرف تو ہونا ہی چاہیے) رشید احمد صدیقی، کنھیا لال کپور اور فکر تونسوی کی وفات کے بعد اردو طنزومزاح میں جو خلا پیدا ہوا تھا اسے ان دونوں نے نہایت خوش اسلوبی سے پُر کیا ہے۔''خانہ خالی را دیوی گیرد'' اسی کو کہتے ہیں۔پچھلے سال یہ دونوں پاکستان تشریف لائے تو ان کی بڑی دھوم ہوئی تھی۔ہر محفل میں انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور ان کے مضامین ذوق و شوق سے سنے گئے۔پاکستانیوں کو اس پر حیرت ہوئی کہ ہندوستانی ادب کے خاکستر میں ایسی چنگاریاں بھی ہیں۔مزید حیرت اس پر ہوئی کہ ان دونوں کی کوئی کتاب پاکستان میں شائع نہیں ہوئی حالانکہ ہندوستان کی ہر اچھی کتاب کا جعلی ایڈیشن یہاں چھپ جاتا ہے۔اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ ان دونوں کی جو کتابیں ہندوستان میں چھپی ہیں ان میں سے بیشتر کی طباعت وکتابت کچھ ایسی ہے کہ صورت سے جعلی ایڈیشن دکھائی دیتی ہیں۔ظاہر ہے کہ پاکستانی پبلشر ایسے گئے گزرے نہیں کہ جعلی ایڈیشنوں کے جعلی ایڈیشن چھاپیں۔

بہرحال وجہ کوئی بھی ہو، اہل پاکستان کا یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کی تحریروں سے لاعلم رہنا افسوس ناک ہے۔دونوں کو مشورہ دیا گیا کہ وہ اپنی کتابیں پاکستان میں چھپوائیں۔دونوں نے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ انہیں جو زرمبادلہ ملا ہے وہ اتنا نہیں ہے کہ کتابیں چھپوائی جاسکیں۔

اکادمی ادبیات سے رابطہ قائم کیا گیا تو وہاں سے یہ جواب ملا کہ اکادمی صرف معذور ادیبوں کی مدد کرتی ہے۔ایسے ادیبوں کی مدد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جو معذور بھی نہ ہوں اور پھر پاکستانی بھی نہ ہوں۔اگر یہ دونوں پاکستانی ہوتے تو اُنہیں بہت سے صحت مند پاکستانی ادیبوں کی طرح معذور ادیبوں کے فنڈ سے مدد دی جاسکتی تھی۔واضح رہے کہ اکادمی کے پاس معذور ادیبوں کی مدد کے لیے جو فنڈ ہے اس کا بڑا حصہ صحت مند ادیبوں پر صرف ہوجاتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ جو ادیب معیاری ادب تخلیق نہ کرسکیں انہیں بھی معذور ادیب تصور کیا جاتا ہے۔

مایوسی کے اس عالم میں ایک ادب دوست امید کی کرن بن کر طلوع ہوئے اور انہوں نے اپنے ادارے کی طرف سے یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کے انتخابات شائع کرنے کی پیش کش کی جو فوراً قبول کرلی گئی۔فوراً اس لیے کہ موصوف کو اپنی پیش کش پر نظر ثانی کا موقع نہ مل سکے۔ویسے اس کا امکان نہیں تھا کیونکہ یہ صاحب کتابوں کی اشاعت کا کام محض شوق کی بنا پر کرتے ہیں تجارت ان کا مقصد نہیں۔اسی لیے وہ کتابیں چھاپ کر گودام میں رکھ دیتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ کتاب اس وقت تک فروخت نہیں ہوتی جب تک اسے چھپے ہوئے ایک طویل عرصہ نہ گزر جائے۔کتاب پرانی ہوجائے تو اُس کا شمار نوادر میں ہوتا ہے اور نوادر بآسانی فروخت ہوجاتے ہیں۔

خوشی کی بات ہے کہ یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کی تحریروں کے انتخابات بالترتیب ''زیرِغور'' اور ''قطعِ کلام'' کے ناموں سے شائع ہوگئے ہیں۔ انتخاب کا کام معروف خاتون صحافی اور افسانہ نگار رعنا فاروقی نے انجام دیا ہے۔ رعنا فاروقی کی شہرت کا سبب کہانیوں کا وہ مقبول سلسلہ ہے جو ''تین عورتیں تین کہانیاں'' کے نام سے چھپتا رہا ہے۔ یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کے انتخابوں کو اِس سلسلے کی ایک کڑی نہ سمجھا جائے۔ یہ بالکل مختلف نوعیت کا کام ہے۔

رعنا فاروقی کی ہمت قابل داد ہے کہ انہوں نے پہلے دونوں مصنفوں کی دو درجن کتابوں کو پڑھا اور پھر اُن میں سے ایسی تحریروں کو الگ کیا جو اُن کے نزدیک بہترین ہیں۔ ہمت کی داد ہم نے اس لیے دی ہے کہ دو درجن کتابوں کو پڑھنے کے بعد بھی وہ اس لائق رہیں کہ بُرے بھلے میں تمیز کرسکیں۔ ان کی جگہ ہم ہوتے تو تحریروں کا انتخاب قرعہ اندازی سے کرتے اور پڑھنے کی ذمہ داری دوسروں پر ڈال دیتے۔ ویسے بھی یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کی تحریریں سراپا انتخاب ہوتی ہیں۔ انتخاب کرنا ایسا ہی ہے جیسے دیگ میں سے کچھ چاول نکال کر کہا جائے کہ یہ باقی چاولوں سے بہتر ہیں۔ دیگ میں سب چاول ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کی اردو کمزور ہے، ممکن ہے کہ وہ ہمارے اس بیان سے یہ نتیجہ نکالیں کہ مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم دیگیں پکانے کا کام کرتے ہیں۔ ان کمزور اردو والوں کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ دیگیں پکانا، طنز و مزاح لکھنے سے کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔

بہر حال پاکستانی قارئین کے لیے ان انتخابات کی ضرورت تھی۔ ان سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ دونوں مصنفین کی وہ تحریریں جو نگاہِ انتخاب میں اعتبار حاصل نہ کرسکیں، کیسی ہوں گی۔ انہیں پڑھنے کی خواہش بھی دل میں پیدا ہوتی ہے۔ رعنا فاروقی نے دونوں کتابوں کے دیباچوں میں نہایت عمدگی سے ان کی خوبیاں اجاگر کی ہیں۔ اس کے لیے رعنا فاروقی اور دونوں مصنفین مبارک باد کے مستحق ہیں۔ رعنا فاروقی اس لیے کہ انہیں خوبیوں کی تلاش میں ناکامی نہیں ہوئی۔ یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین اس لیے کہ بالآخر اُن کی تحریروں کی خوبیاں تلاش کرلی گئیں۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ اردو کے محقق جو کام دوسو سال بعد کرتے، وہ آج ہمارے سامنے انجام پاگیا۔

''زیرِغور'' میں ۹۱ مضامین اور چار شخصی خاکے ہیں۔ ان مضامین کا تعلق معاشرے کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں سے ہے۔ کچھ مضامین ادب اور ادبی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ یوسف ناظم کا کمال یہ ہے کہ ان کی نظر انہیں گوشوں کی طرف جاتی ہے جہاں معمول کے خلاف کوئی بات نظر آتی ہے۔ وہ پہلے سنجیدگی سے صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں اور پھر نہایت ''معصومیت'' کے ساتھ مسئلہ زیرِ بحث کو سمجھنے اور سمجھانے کی اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو الجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً ان کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات کیوں کہلاتا ہے۔ وہ نہایت غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شرافت، اخوت اور بہادری وغیرہ کے اوصاف کی وجہ سے انسان اس کا مستحق ہے کہ وہ اشرف المخلوقات کہلائے۔ پھر وہ اپنے گرد و پیش پر نظر دوڑاتے ہیں اور انسانوں میں ان خوبیوں کو تلاش کرلیتے ہیں۔ کس طرح؟ اس کی ایک مثال یہ ہے: ''دلیری اور بہادری میں انسان کا مقابلہ کوئی اور نہیں کرسکتا۔ کسی کی جیب کاٹ لینا، مکان لوٹ لینا، فساد برپا کروا دینا، چھری مار دینا، مندر سے مورتی اور مسجد سے جوتے اُڑا لینا، انسان کے لیے روزمرہ کے کام ہیں...... ایسے کام انجام دینے سے ایک سکون سا محسوس ہوتا ہے''۔

ادب اور ادبی مسائل پر لکھتے ہوئے بھی انہوں نے یہی طریق کار اختیار کیا ہے۔ ''مرزا غالب کی صحت جسمانی'' ایک دلچسپ مضمون ہے جس میں انہوں نے کلامِ غالب سے ثابت کیا ہے کہ غالب گوناگوں امراض کا ہدف تھے اور اُن کی ساری زندگی مختلف بیماریوں میں گزری۔ ہمارے محققوں خصوصاً غالب پر تحقیق کرنے والوں کو یہ مضمون ضرور پڑھنا چاہیے اور اس موضوع پر مزید تحقیق کرنی چاہیے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ غالب زیادہ بیمار تھا یا اس کے محقق۔

اس کتاب میں جو چار شخصی خاکے ہیں، وہ باقر مہدی، سلیمان اریب، راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر کے ہیں۔ ان میں سے آخری تین اب ہمارے درمیان موجود نہیں اور باقر مہدی 'خدا انہیں سلامت رکھے' پہلے سے زیادہ موجود ہیں۔ انہیں اپنی کالی غزلوں اور پیلی تنقید سے اتنی شہرت نہیں ملی جتنی یوسف ناظم کے خاکے سے ملی ہے بلکہ ہم تو یہاں تک کہیں گے کہ یوسف ناظم کی شہرت میں بھی اس خاکے کا بڑا حصہ ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ آیندہ چل کر باقر مہدی اور یوسف ناظم اسی خاکے کی وجہ سے یاد رکھے جائیں۔

مجتبیٰ حسین کے انتخاب ''قطعِ کلام'' میں مضامین اور خاکوں کے علاوہ سفرنامے بھی شامل ہیں۔ موصوف خاصے ''جہاں دیدہ'' ہیں۔ انہوں نے محاورۃً دنیا کو خوب اچھی طرح برتا ہے اور عملاً دنیا کے کئی ملکوں کو دیکھا ہے۔ اس لیے ان کے تجربات و مشاہدات میں تنوع بھی ہے اور وسعت بھی۔ انہوں نے طنز کی گہرائی اپنے بڑے بھائی ابراہیم جلیس سے اور اسلوب کی چاشنی اپنے بڑے بھائی کے جگری دوست ابن انشا سے لی ہے۔ مزاح میں وہ کسی کے مقلد نہیں۔ اس سلسلے میں ان کی طباعی اپنی مثال آپ ہے۔ عام لکھنے والے مُردوں سے متعلق طبع زاد واقعات بیان کرتے ہیں لیکن مجتبیٰ حسین زندوں کے بارے میں بھی طبع زاد باتیں لکھتے ہیں اور اس کی داد زیادہ تر اُنہیں سے ملتی ہے جن کے بارے میں یہ باتیں لکھی جاتی ہیں۔

وہ بنیادی طور پر افسانہ گو ہیں۔ ان کے بیشتر بلکہ تمام مضامین افسانوی نوعیت کے ہیں جن میں وہ دلچسپ واقعات اپنے دلچسپ ترین اسلوب میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ درمیان میں اس قسم کے معنی خیز اور فکر انگیز جملے کثرت سے آتے رہتے ہیں: ''اب ادیب کا قلم کان پر نہیں رکھا جاتا۔ اسے

ادیب یا تو اپنی جیب میں رکھتا ہے۔ یا قلم سمیت ادیب کو حکومت اپنی جیب میں رکھ لیتی ہے۔ پہلی صورت میں قلم محفوظ رہتا ہے اور دوسری صورت میں ادیب''۔
''قطع کلام'' میں تیرہ مضامین چار شخصی خاکے اور دو سفرنامے ہیں، شخصی خاکے راجندر سنگھ بیدی، کنھیا لال کپور، صادقین اور مشفق خواجہ کے ہیں۔ سفرنامے جاپان اور روس کے ہیں۔ مضامین ہوں یا خاکے یا سفرنامے، ان کا بنیادی وصف مجتبیٰ حسین کا اندازِ بیان ہے۔ وہ ایک ایسی بے تکلفانہ فضا تخلیق کرتے ہیں کہ قاری مسحور ہو جاتا ہے اور اِس کیفیت سے اسی وقت آزادی حاصل کرتا ہے جب مضمون ختم ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو جی چاہتا ہے کہ کاش مجتبیٰ حسین مضمون کو ختم نہ کرتے اپنی بات جاری رکھتے۔ صادقین کا خاکہ ایک ایسی ہی تحریر ہے۔ صادقین کی شناخت کے لیے اس کی بنائی ہوئی تصویروں کو دیکھنے کے ساتھ اس خاکے کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ تصویروں میں صادقین کی شخصیت کا عکس نظر آتا ہے، اس خاکے میں ہم جیتے جاگتے صادقین سے ملتے ہیں
مجتبیٰ حسین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ شخصیات پر لکھتے ہوئے واقعے اور افواہ میں فرق نہیں کرتے۔ ہم اس قدر مبالغہ سے کام نہیں لیں گے لیکن یہ ضرور عرض کریں گے کہ مجتبیٰ حسین واقعہ کو افواہ بنائیں یا افواہ کو واقعہ دونوں صورتوں میں ان کے اسلوب بیان کی دلکشی برقرار رہتی ہے۔

مجتبیٰ حسین بحیثیت مزاح نگار

مجتبیٰ صاحب اپنی مشہور و معروف کتاب ''جاپان چلو جاپان چلو'' میں دل کھول کر لکھ چکے ہیں۔ اس لیے مجھے زیادہ جسارت نہیں کرنی ہے۔ اس سفرنامے کو پڑھ کر ہم بے اختیار یہ داد دینے لگتے ہیں کہ مجتبیٰ حسین مزاح نگاری کے فن میں پورے اترتے ہیں۔ اسی کتاب کا ایک باب ''بلٹ ٹرین میں کبھی نہ بیٹھو'' ملاحظہ فرمایئے کہ اس میں انہوں نے ہماری بلٹ ٹرین (شین کان سین) پر بہت کچھ کہا اور سنایا ہے بلکہ یہاں تک فرماتے ہیں کہ ''کبھی جاپان جاؤ تو بلٹ ٹرین میں بالکل نہ بیٹھو بڑی واہیات ٹرین ہے۔'' ہم خوب جانتے ہیں کہ بلٹ ٹرین جس کی رفتار ۲۳۰ کیلومیٹر فی گھنٹے سے کچھ زیادہ ہے بھارت کی وسیع، آرام دہ اور زندگی سے بھرپور ٹرین کے مقابلے میں، ہیچ ہوتی ہے۔ پھر ہم مجتبیٰ صاحب کی بظاہر نکتہ چینی کو پڑھ کر ناراض بالکل نہیں ہوتے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہم ان کی نرم و گرم اور دردمند اور انسانیت سے بھری روح کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ مجتبیٰ صاحب شاید یہ فرمائیں گے کہ تم کیا جانو میرے اندرونی غم و حسرت کو۔ خیر چھوڑیئے اس بحث کو۔

چند سال ہوئے عوامی جمہوریہ چین کی کمیونسٹ پارٹی کے صدر یہاں بطور سرکاری مہمان تشریف لائے تھے۔ انہوں نے بھی ہماری منحوس بلٹ ٹرین میں سوار ہونے کی ہمت کی تھی۔ ٹوکیو سے کیوٹو تک ۵۱۴ کیلومیٹر کے فاصلے کو ڈھائی گھنٹے اور دس منٹ میں طے کرنے کے بعد جب ان سے سفر کے تاثرات پوچھے گئے تو منہ بنا کر فرمایا کہ تیز رفتار تو ضرور ہے لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا رہا کہ پیچھے سے لگاتار چابک لگایا جا رہا ہے۔ مجھے دوبارہ کبھی نہیں بیٹھنا ہے۔ ایک عملی سیاستدان اور ایک اصلی مزاح نگار کے درمیان جنت سے جہنم تک کا فاصلہ جو ہونا لازمی ہے، یہی تو ہے۔

مجتبیٰ صاحب ٹوکیو میں قیام کے دوران جس ہوٹل میں رہے اس کا کمرا اتنا چھوٹا تھا کہ پنجرے کا گمان ہوتا ہے۔ اتفاق سے اسی ہوٹل میں میرے ایک پاکستانی دوست کو ٹھہرنا پڑا تھا۔ آج سے کوئی دس سال پُرانی بات ہے۔ وہ بدنصیب اس تنگ کمرے سے اتنا گھبرا گیا کہ بہت جلد اپنے آپ کو قیدی سمجھنے لگا۔ یورپی مشترکہ منڈی کے ایک معتمد صاحب نے بجا فرمایا ہے کہ جاپانیوں کے گھر خرگوش خانے کے برابر ہیں۔ کیا عجب کہ ٹوکیو کے ایک معمولی ہوٹل کے کمرے کو میرے دوست نے قید خانہ قرار دیا ہو۔ پھر اسی کمرے کی کیفیت کو مجتبیٰ صاحب اِس طرح دلچسپ انداز میں پیش کرتے ہیں کہ ''کمرہ اتنا چھوٹا ہے کہ اس میں کسی خواب کے داخل ہونے کی گنجائش نہیں ہے۔''

جہاں تک طنز و مزاح کا تعلق ہے یہ عام فہم حقیقت ہے کہ مزاح اور طنز میں بنیادی فرق ہوتا ہے۔ طنز نگاری اپنی جگہ اور مزاح نگار دوسری جگہ۔ طنز کی عمارت نفرت کی اساس پر تعمیر کی جاتی ہے ادھر مزاح نگاری میں محبت اور ہمدردی ناگزیر ہوتی ہے اور اسی لیے ایک مزاح نگار کا دل بھی محبت اور ہمدردی سے بھرا ہوا ہوتا ہے اور ہونا بھی ضروری ہے۔ یہاں ان کی ایک اور تصنیف ''آدمی نامہ'' کو دیکھئے۔ اس میں پندرہ ایسی شخصیتوں کے خاکے پیش کیے گئے ہیں کہ ہر ایک ہمارے لیے رہبرِ زندگی بن سکتی ہے۔ ان پندرہ خاکوں کو پڑھ کر ہمارے دل کو بڑی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اس میں طنز کی ذرّہ بھر بھی بے دردی نہیں ملتی۔ اور اسی مسرت آفرینی کے فن میں مجتبیٰ حسین یکتا فنکار ہیں۔ بس مجھے افسوس ہے کہ ''آدمی نامہ'' میں سولہویں شخصیت کے لیے جگہ نہیں محفوظ رکھی گئی ہے۔ اصل میں وہ جگہ بحیثیت مزاحیہ آدمی خود مجتبیٰ صاحب کے لیے ہونی چاہئے! مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری واقعی ان کی اپنی شخصیت کا پرتو ہے!!

پروفیسر سوزوکی تاکیشی (جاپان)

مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری

انور سدید
(لاہور)

خاکہ نگاری دوسرے اشخاص کے ذاتی مطالعے اور چنیدہ تاثرات کومضمون کی صورت میں پیش کرنے کی ادبی صنف ہے۔بعض لوگ اس صنف کواتنا آسان سمجھتے ہیں کہ اِدھرقلم اٹھایا،ادھر کھٹ سے خاکہ تیار......اور بعض اصحاب اسے اتنا مشکل سمجھتے ہیں کہ خامہ خونچکاں اور انگلیاں فگار ہونے کے باوجود شخصیت کی ڈور مصنف کے ہاتھ میں نہیں آتی،اور خاکہ کا پتنگ پہلی اڑان پر ہی زمین پر گر پڑتا ہے۔کبھی عقیدت مدح کا روپ اختیار کر لیتی ہے اور نفرت مدح کی صورت میں ظاہر ہوجاتی ہے۔میرے دوست مشفق خواجہ نے خامہ بگوش کے قلم سے لکھا تھا:

''شخصی خاکہ ذاتی تعلق کے بغیر نہیں لکھا جاسکتا۔لکھنے والا جب کسی دوسری شخصیت کوموضوع بناتا ہےتو وہ اپنے تجربےاور مشاہدے کے حوالے سے بات کرتا ہے۔یہ تجربہ اور مشاہدہ جہاں ایک طرف موضوع کی تصویر بناتا ہے وہیں دوسری طرف لکھنے والے کی شخصیت کی جھلکیاں بھی دکھاتا چلا جاتا ہے۔اگر ایسا نہیں ہے تو خاکہ،خاکہ نہیں رہتا۔جواب مضمون بن جاتا ہے''۔

خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش ہمیں ناصر لکھنوی کے ''تذکرہ خوش معرکہ ٔ زیبا'' میں ملتے ہیں جو''آبِ حیات''(مصنفہ محمد حسین آزاد) کی خاکہ نگاری کاایک بنیادی ماخذ شمار کیا جاتا ہے۔مرزا فرحت اللہ بیگ اس صنفِ ادب کاایک اہم ترین نام ہے کہ انہوں نے''مولوی نذیر احمد کی کہانی......کچھ ان کی،کچھ اپنی زبانی'' لکھ کر اس صنف کا آغاز بھی کیا اور اسے اعتماد بھی عطا کردیا۔اس خوبصورت اور خوش سیرت ابتدا نے رشید احمد صدیقی،مولوی عبدالحق،چراغ حسن حسرت،عبدالمجید سالک،اشرف صبوحی،خواجہ حسن نظامی،شاہد احمد دہلوی اور ڈاکٹر اسلم فرخی جیسے تہذیبی خاکہ نگاروں کومتعارف کرایا۔عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو کی خاکہ نگاری میں ان کا افسانہ تخلیق کرنے کا فن ان کے مشاہدے میں معاونت کرتا ہے۔شوکت تھانوی نے''شیش محل'' کے خاکوں میں مزاح کوقدر اول کی حیثیت دی اور شخصیت کووسیلۂ ظرافت بنانے کی کاوش۔ہندوستان کے ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین کی کتاب ''آپ کی تعریف'' مجھے اظہر جاوید صاحب کی وساطت سے ملی تو مجھےان کی کتاب ''آدمی نامہ'' یاد آئی جو۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی تھی اور ادبی شخصیات کے خاکوں کی ایک عمدہ کتاب تسلیم کی گئی تھی۔اور خوبی کی بات یہ تھی کہ انھوں نے شوق مزاح اور تخلیقی وفور میں اپنے ممدوح کی تہذیبی شخصیت پر آنچ نہیں آنے دی تھی اور اپنے اظہار کی آزادی کو بھی قائم رکھا تھا۔مجتبیٰ حسین کے خاکوں کی زیرِنظر کتاب جناب سید امتیاز الدین نے مرتب کی ہے اور اس میں ۲۷ خاکے مرحومین پر اور اتنی ہی تعداد میں خاکے زندگان پر پیش کیے ہیں۔آخری خاکہ ''ایک خاندان......ستر برس اور اردو ادب'' میں مجتبیٰ حسین نے اس خاندان کامختصر سا تذکرہ پیش کردیا ہے،جس نے اُردو ادب کومحبوب حسین جگر،ابراہیم جلیس اور مجتبیٰ حسین جیسے ادیب دیئے۔اس مضمون میں مجتبیٰ حسین نے صرف اول الذکر دو بھائیوں پر قلم اٹھایا ہے اور اپنا ذکر شاید اس لیے چھوڑ دیا ہے کہ وہ خود اس کتاب کے پچاس سے زائد خاکوں میں ہر جگہ موجود ہیں۔اور بہجت افروزی ہی اس کتاب میں پڑھنے والوں کومتوجہ کراتی اور ان کی شخصیت کے نقوش مرتب کرنے میں معاونت عطا کرتی ہے۔مجتبیٰ حسین مزاح نگار ہیں لیکن شوکت تھانوی کی طرح انہوں نے خاکہ نگاری میں مزاح کومقصد اول کی حیثیت نہیں دی،نہ خاکہ اڑانے کی کوشش کی ہے بلکہ زیرِقلم شخصیت کاایک مثبت تاثر ان واقعات سے مرتب کیا ہے جو ملاقاتوں کے دوران خود مجتبیٰ حسین نے حاصل کیا۔مثال کے طور پر کرشن چندر کی''اُردو دوستی'' کا تاثر اس بات سے ابھارا ہے:''ان کے ایک ہاتھ پر انگریزی میں ان کا نام بڑے حروف میں گدا ہوا تھا:Krishan Chander۔میں نے ایک بار مذاق میں ان سے کہا تھا''کرشن بھائی!یہ آپ نے اپنے ہاتھ کووزیٹنگ کارڈ کیوں بنا رکھا ہے اور پھر یہ بتایئے کہ جب آپ کاایک ہاتھ مطبوعہ ہے تو دوسرے ہاتھ کوغیر مطبوعہ کیوں رکھا ہے؟اس پر بھی کچھ لکھیے بلکہ اردو میں لکھیے کیوں کہ آپ تو اُردو کے ادیب ہیں،آپ کے ہاتھ پر اردو کوجائز مقام ملنا چاہئے۔''

میری بات سن کر پہلے تو زوردار قہقہہ لگایا،پھر گمبھیر ہو کر بولے''ہاتھ پر انگریزی میں نام لکھا ہو تو کیا ہوتا ہے۔میرا ہاتھ تو اردو لکھتا ہے''......اُردو کے معاملے میں وہ فوراً گمبھیر ہوجایا کرتے تھے۔

میرا اندازہ ہے کہ مجتبیٰ حسین نے اس کتاب کے خاکوں کوضابطۂ تحریر میں لانے کے لیے اس طرح نہیں سوچا ہوگا جس طرح شاہد احمد دہلوی یا ڈاکٹر اسلم فرخی نے اپنے ممدوحین کی شخصیت کا تار وپود بُنا ہوگا۔اور اس سوچ میں لمبا وقفہ صرف کیا ہوگا۔مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری میں ایک خاص قسم کی ارتجالی کیفیت محسوس کی جاسکتی ہے جو بالعموم کسی روزنامے کے لیے کالم لکھتے وقت تخلیق کار پر طاری ہوتی ہے۔چنانچہ ان کے خاکوں میں''رپورتاژ نگاری'' کے عناصر بھی تلاش کیے جاسکتے ہیں لیکن خوبی کی بات یہ ہے کہ جب وہ کسی ادبی محفل میں شرکت یا کسی بڑی ادبی شخصیت سے ملاقات کے بعد اس کے تذکرے کے لیے قلم اٹھاتے ہیں تو ان کی تخلیقی رو کرنیں بکھیرنے لگتی ہے اور زیرِتعارف شخصیت کاعکس مجتبیٰ حسین کے کیمرے سے کاغذ پر اترنے لگتا ہے۔میں ان کی مخصوص تکنیک کی مثال کشور ناہید کے خاکے سے پیش کرتا ہوں جس میں مجتبیٰ حسین پورے کا پورا موجود ہے۔

''پچھلے ہفتے ہم کالم نہیں لکھ سکے۔اس کی دو وجوہات ہیں پہلی وجہ تو یہ کہ جس دن ہم یہ کالم لکھتے ہیں،(اس دن) بقرعید آگئی۔دوسری وجہ یہ کہ اس دن صبح کی فلائیٹ سے کشور ناہید حیدرآباد سے دلّی آگئی تھیں۔اگرچہ وہ ہمارے

ہاں مقیم نہیں تھیں لیکن کشور کسی بھی شہر کے کسی بھی مکان میں مقیم رہیں، یوں لگتا ہے جیسے سارے شہر میں آباد ہوگئی ہیں، سارا شہر بلاوجہ مصروف سا ہوجاتا ہے۔ کشور نے آتے ہی فون کیا ''میں حیدرآباد سے بہت خوش لوٹی ہوں''۔ ہم نے کہا ''آپ کسی شہر سے خوش ہوکر آئیں تو اس کا مطلب یہ بھی تو ہوتا ہے کہ اس شہر کے باسی آپ سے خوش نہیں رہے''۔ بولے ''ایک بات سن لو۔ حیدرآباد میں ایک صاحب نے تمہارے بارے میں کہا ''تم ان کے سرپرست ہو''......اس پر میں نے انہیں آگاہ کیا کہ آپ جسے ''سرپرست'' سمجھ رہے ہیں وہ اصل میں ''شرپرست'' ہے اور اس میں کیا شک ہے کہ تم شرپرست تو ہو ہی''۔

کشور ناہید کی مجتبیٰ حسین کے بارے میں رائے بے لاگ ہے۔ حیدرآباد کے بڑے بڑے ادیبوں کے بارے میں بھی انہوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر رائے دی۔ مجتبیٰ حسین نے اس ''خاکہ نما'' کالم میں احباب سے گزارش کی کہ ''جب ہم حیدرآباد آئیں تو آواز دے کر ہم سے اپنے بارے میں کشور ناہید کی رائے طلب کرلیں۔''

(مغنی تبسم، راشد آزر اور ذکی بلگرامی خاص طور پر نوٹ فرمالیں'')۔

اس کتاب میں رشید احمد صدیقی، علی سردار جعفری، کرشن چندر، جگن ناتھ آزاد، نثار احمد فاروقی، سید حامد، گوپی چند نارنگ اور رشید حسن خاں کے خاکے پڑھیں تو مجتبیٰ حسین حفظ مراتب کو پورے آدابِ نیازمندی سے ملحوظ خاطر رکھتے نظر آتے ہیں لیکن ذکر اپنے قریبی معاصرین کا ہو تو وہ تکلف کو قریب نہیں پھٹکنے دیتے اور ''سچ'' کو قلم پر اس طرح اتارتے ہیں جیسے ہندو پاک کے شاعروں پر غزل کا شعر اترتا ہے۔ تارک وطن شاعر ساقی فاروقی سے لندن میں ملے تو ان کے بارے میں بہت سی معلومات جمع کرچکے تھے۔ مجتبیٰ حسین نے بتایا کہ ساقی فاروقی:

''......گلے میں خضاب لگا کر کلام پڑھتے ہیں، جب شعر پڑھتے ہیں تو شعر ان کے روم روم سے ادا ہونے لگتا ہے۔ ایسے شگفتہ مزاج کہ جس محفل میں بیٹھیں لوگوں کو ہنسا ہنسا کر رلا دیں۔ کھلے دل، کھلے دماغ، کھلے ہاتھ، کھلے گریبان اور کھلے منہ (منہ کچھ زیادہ ہی کھلا ہوا ہے) کے آدمی ہیں۔''

اس نادرالاوصاف ساقی فاروقی سے ملاقات کا ذکر مجتبیٰ حسین نے یوں کیا ہے:

''ابھی ساقی فاروقی کی باتیں یاد کرہی رہے تھے کہ سیاہ پتلون اور سیاہ قمیض میں ملبوس، گلے میں سیاہ منکوں کی مالا ڈالے ساقی فاروقی گنڈی بھابی (مسز ساقی فاروقی کا نام ہی کچھ ایسا ہے کہ ہم ''گنڈی'' پکارنے جاتے ہیں تو منہ سے ''غنڈی'' ادا ہوجاتا ہے)......کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں بھونچال کی طرح داخل ہوئے۔ پہلے ایک عدد گالی دی اور بے ساختہ ہم سے لپٹ گئے۔ جب ہم گنڈی بھابی سے ہاتھ ملانے لگے تو بولے: ''تم ہمارے خاص دوست ہو۔ تم گنڈی کو پیار کروگے، ہاتھ نہیں ملاؤ گے'' پھر گنڈی بھابی سے کہا ''مجتبیٰ ہمارا یار ہے۔ تم اسے کس (Kiss) کروگی''۔ (صفحہ ۱۶۸)

اور مجتبیٰ حسین گنڈی بھابی سے مشرقی آداب سے ملے تو ساقی فاروقی کو ایک پاکستانی نقاد یاد آگیا (گمان غالب ہے کہ یہ نظیر صدیقی تھے) ساقی فاروقی بولے ''ابھی کچھ عرصہ پہلے وہ سالا......(ایک مشہور پاکستانی نقاد) آیا تھا۔ وہ بھی ہمارا خاصا یار ہے۔ ہم نے اس سے گنڈی کو پیار کرنے کے لئے کہا تو ہمیں یاد ہی نہیں رہا کہ وہ تین چار زردوں اور ایک خاص بُو والے قوام کا پان کھاتا ہے پھر اس......نے گنڈی کے گال پر پیار کرنے کی بجائے گنڈی کے ہونٹوں پر زردے اور قوام کا لیپ لگادیا......سالے اردو کے شاعر، ادیب اور نقاد کو پیار کرنا تو آتا ہی نہیں۔ ان کی تو......'' ساقی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا پھر بولے ''تم نے مغربی آداب کہاں سے سیکھ لیے، تمہارے اردو ادیب ہونے پر شبہ ہورہا ہے''۔ (صفحہ ۱۷۸)

مجتبیٰ حسین نے اس کتاب میں بلاشبہ ان نامور شخصیات کو اہمیت دی ہے جن سے بار بار ملنے اور ان کے بارے میں اپنی رائے مرتب کرنے کے مواقع ملے لیکن غور کیجئے کہ ان شخصیات کے گرد ہی گزشتہ نصف صدی کی ادبی تاریخ گردش کرتی ہے۔ چنانچہ بالواسطہ طور پر اس کتاب میں اردو کی ترقی کی وہ تاریخ بھی سما گئی ہے جو ہندوستان اور پاکستان کی جغرافیائی حدوں سے نکل کر پوری دنیا میں پھیل گئی ہے۔ اور قتیل شفائی، مشفق خواجہ، پروین شاکر، دلاور فگار، ساقی فاروقی، شان الحق حقی، کشور ناہید کے خاکے پڑھیں تو حیرت ہوتی ہے کہ مجتبیٰ حسین کا حلقۂ احباب زمان و مکان کی حدود سے ماورا ہوگیا ہے اور چشم کالمانہ ہر شخصیت کو اپنے مخصوص زاویے سے دیکھ رہی ہے۔ میں اس پُرلطف اور بہجت افروز کتاب کا خیرمقدم کرتا ہوں۔ یہ کتاب سید امتیاز الدین نے محبت کے داخلی جذبے سے مرتب کی ہے۔ پریم گوپال متل نے موڈرن پبلشنگ ہاؤس (۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، دہلی) سے اُردو زبان کے فروغ اور خاکہ نگاری کی صنف کی خدمت کے جذبے سے بڑے خوبصورت انداز میں شائع کی ہے۔

سایہ دار آدمی

مجتبیٰ حسین جب دلّی آئے تو طنز و مزاح کا وہ زرہ بکتر پہنے ہوئے تھے جو فکر تونسوی کے علاوہ دلّی میں کسی اور کو میسّر نہ تھا، یہ زرہ بکتر پہن کر جب مجتبیٰ نے حیدرآباد میں کئی معرکے سر کرلیے تو انہیں دلّی فتح کرنے کا خیال آیا جس کے خوابوں سے تو ہماری تاریخ بھری پڑی ہے۔ مجتبیٰ دلی وارد ہوئے تو میری طرح اور لوگوں نے بھی اسے دیوانے کا خواب کہہ کر ٹال دیا۔ اور وہ دن بھی آیا جب اَدبی محفلوں اور مجلسوں میں مجتبیٰ کے داخل ہوتے ہی بے شمار ہاتھ گرم جوشی کے ساتھ ان کی طرف بڑھنے لگے۔

زبیر رضوی (دہلی، بھارت)

مجتبیٰ حسین کا تخلیقی سفر

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال

(حیدرآباد، دکن)

مجتبیٰ حسین عصری طنز و مزاح کا ایک معتبر نام ہے۔ مجتبیٰ حسین کے ادبی سفر کا آغاز ۲۶۹۱ء میں ہوا۔ کالم نگاری اس سفر کی پہلی منزل تھی۔ ایک ایسے دور میں جب کہ کالم نگاری کی روایت خاص طور سے ہندوستان میں کمزور سے کمزور تر ہوتی جارہی تھی، ذہین و فطین نوجوان مجتبیٰ حسین نے اپنی جولانئ طبع، نُدرت فکر، برجستگی اور لطیفہ سنجی کے ذریعہ ادبی و صحافتی حلقوں کو چونکا دیا۔ مجتبیٰ حسین کی تربیت ایک خاص تہذیبی و ادبی ماحول میں ہوئی ہے۔ ان کی طالب علمی کا دور ہوسٹلوں میں گزرا۔ اس زمانہ کے ہوسٹل شائستہ شرارتوں، مہذب فقرہ بازی اور مؤدب ہوٹنگ کے مرکز تھے۔ ہوسٹل کی زندگی، ادبی و تہذیبی سرگرمیوں سے دلچسپی، دوست داری اور محفل آرائی نے مجتبیٰ حسین کی فطری بذلہ سنجی کو جلا بخشی۔ ان کا علمی و ادبی گھرانہ ترقی پسند خیالات کا حامل تھا۔ اپنے بھائیوں محبوب حسین جگر اور ابراہیم جلیس سے مجتبیٰ حسین نے محنت و ریاضت اور فکری توازُن کے سبق حاصل کئے اور فن کے دائرہ میں رہ کر شائستہ طریقہ پر احتجاج کرنا سیکھا۔ چنانچہ ابتدائی دور میں روز نامہ ''سیاست'' کے کالم ''شیشہ و تیشہ'' کے لیے لکھی گئی ظریفانہ تحریریں کینہ، کپٹ، طعن و تشنیع اور زہرناکی سے عاری لطف و انبساط کا خزانہ تھیں۔ ان کالموں میں آمد ہی آمد تھی۔ مجتبیٰ حسین کے اسلوب کی شیرینی، تلخیٔ دوراں کے شکار اُردو، کے قاری کو نیا مزہ دے گئی۔ مجتبیٰ حسین کے تخلیقی سوتوں سے اُبلنے والے پُر جوش دریا کے بہاؤ نے تنگنائے کالم کے حدود کو توڑ کر ادب کی نئی وسعتوں اور میدانوں میں پناہ ڈھونڈ لی۔ ان کے اصل نام کے ساتھ پہلا مزاحیہ مضمون ''ہم طرف دار ہیں غالبؔ کے سخن فہم نہیں'' ۴۶۹۱ء میں شائع ہوا۔ غالب کی طرفداری کے مُدّعی مجتبیٰ حسین نے حیوانِ ظریف سے ایسا ناطہ جوڑا کہ غالب کی شوخی پر لکھے گئے حالی کے شعر و فقرے مجتبیٰ حسین کے حال کی تفسیر بن گئے۔

ادبی محفلوں میں مجتبیٰ حسین کے لطیفوں اور ٹھٹھوں کے چرچے تھے۔ اولین مضمون کی اشاعت کے ساتھ ہی مجتبیٰ کے دلچسپ اور پر لطف مزاحیہ مضامین تابڑتوڑ یکے بعد دیگرے شائع ہونے لگے۔ مزاح مجتبیٰ حسین کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ گھر، دفتر اور محفل احباب ہر جگہ شوخ و شنگ مجتبیٰ گل افشانئ گفتار کے ذریعہ مزاح کی دولت بے دریغ لٹاتے رہے۔ پھر ان کے ذہن میں ایک اچھوتا خیال کلبلایا کہ جب سازندوں سے لے کر دندان سازوں تک سب کی کانفرنس ہوسکتی ہے تو طنز و مزاح نگاروں کی کانفرنس کیوں نہ منعقد ہو۔ چنانچہ ۶۶۹۱ء میں ایک منفرد یادگار کانفرنس کی نیو ڈالی گئی۔ یہ کانفرنس طنز و مزاح کے فروغ کی تحریک کا نقطہ آغاز تھی۔ خود مجتبیٰ اب مرکزِ نگاہ تھے۔ مزاح نگاروں، ادیبوں و شاعروں اور نقادانِ ادب نے مجتبیٰ حسین کی تخلیقی صلاحیتوں کو بے حد سراہا۔ تحسین و ستائش کی صحت مند فضا میں مجتبیٰ حسین اپنے تخلیق کردہ کالموں پر نئی منزلیں تعمیر کرتے گئے۔ ان کی کتابیں شائع ہوتی رہیں اور دنیائے اردو نے ان کتابوں کو ادبی دلبستگی کے سامان کے طور پر لائبریریوں کی زینت بنایا۔ انشائیے، خاکے، سفر نامے، تعارف نامے، دیباچے، استقبالیہ و صدراتی خطبے، کتابوں پر رائے، تقاریظ، تذکرے، رپورتاژ، محفلوں کی روداد، ملاقاتوں کا حال، ادبی و سیاسی تجزیے و تبصرے، رزم و بزم کی داستانیں، یہاں تک کہ تعزیت نامے اور بجز فکشن (ویسے مجتبیٰ حسین کے فن مزاح کی ترکیب و تہذیب میں مبالغہ کی ہلکی آنچ کے ساتھ فکشن کے بنیادی اور ترکیبی عناصر کارفرما نظر آتے ہیں) غرض نثری اظہار کے جتنے پیرائے ہوسکتے ہیں ان سب میں مجتبیٰ حسین کی تحریریں اس کی بہترین مثالیں ہیں بلکہ وہ اکثر کوئی بات نہ ہو بھی تو ایک بات پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کی یہ خوبی کالم نگاری کے رواں تسلسل کی ضامن ہے۔

مجتبیٰ حسین آج اردو کے مقبول ترین مزاح نگار ہیں۔ ان کے مضامین نثری محفلوں میں مکرر اور دو بارہ ارشاد کی صداؤں اور فرمائشوں کے درمیان شعر کی طرح سنے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ مزاح کے وقار کو بلند کیا۔ ادبی رجحان سے زیادہ مزاح کو ایک الگ صنف یا شعبہ کی حیثیت سے منوانے کے لئے بھی وہ ہمیشہ کوشاں رہے ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے خاکہ نگاری کے فن میں بھی اپنے لئے ایک منفرد جگہ بنالی ہے۔ ان کے خاکوں میں ممدوح کے ساتھ خاکہ نگار کا کردار بھی سایہ کی طرح لگا رہتا ہے۔

بڑا مزاح نگار خالص مزاح کے سہارے کبھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ادھر چند برسوں سے مجتبیٰ حسین کی تحریروں پر طنز حاوی ہوتا جارہا ہے۔ ان کا پیکرِ تحریر طنز کے ہلکے رنگوں میں ملبوس نظر آتا ہے۔ طنز کی یہ زیریں لہر مزاح کی ادبی شان میں اضافہ کا باعث ہے۔ خاص طور سے وہ اپنے مضامین کے آخری پیراگراف میں (جسے کلائمکس بھی کہا جاسکتا ہے) طنز کے کاری وار کے ذریعہ مزاح میں ایک ڈرامائی موڑ پیدا کر دیتے ہیں۔ قاری مجتبیٰ حسین کے ایک ایک لفظ سے اتفاق کرتا ہے اور اگر مضمون سن رہا ہو تو آخر میں تالیاں بجا بجا کر مزاح نگار کے خیالات میں خود کو شریک کرتا ہے۔ قاری کا یہ ردِ عمل ایک تخلیق کار کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

مجتبیٰ حسین کی کالم نگاری کے دو دور ہیں۔ ۲۱/اگست ۲۶۹۱ء کو انہوں نے پہلا کالم لکھا تھا۔ جس کے بعد وہ تقریباً پندرہ سال تک یہ کالم روزانہ پابندی سے لکھتے رہے۔ اور عجیب اتفاق ہے کہ سولہ سترہ سال کے وقفہ کے بعد اگست ۳۹۹۱ء کی انہی تاریخوں میں وہ دوبارہ کالم نگاری کی طرف متوجہ ہوئے۔

اس مرتبہ قلمی نام کے بجائے وہ اپنے ہی نام سے ''میرا کالم'' کے زیرِعنوان روز نامہ ''سیاست'' کے لئے ہر ہفتہ اور مسلسل لکھ رہے ہیں۔اس طرح پابندی کے ساتھ لکھنا،کوہ بے ستوں کی تیشہ زنی سے کیا کم ہے؟لہو رونے کے بعد کرب والم کو پوشیدہ رکھ کر اپنے اور دوسروں کے چہرے پر مسکراہٹ پیدا کرنے سے جی تو خوش ہوجائے گا لیکن آنسو بھی نکل پڑیں گے۔دراصل مجتبیٰ حسین کے ہاں مزاح،رنج و غم پر قابو پانے کا نام ہے،وہ

برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

مزاح کی یہ کوند اندھیرے میں روشنی کی ایک لکیر ہے۔اس طرح مجتبیٰ حسین عصری وآفاقی تناؤ کے تناظر میں مختلف النوع مسائل ومصائب سے دو چار انسان کو چند خوش گوار لمحے فراہم کرتے ہیں۔پھر اس خوش گوار ماحول سے فائدہ اٹھا کر چند ثانیوں میں اپنے دل کی بات کہہ جاتے ہیں۔مجتبیٰ حسین نے اپنے کالم کے لئے عنوان ''میرا کالم'' شاید اس لئے منتخب کیا تھا کہ کبھی سنجیدہ باتیں بھی کرلیں۔سچ تو یہ ہے کہ مجتبیٰ حسین اپنے شگفتہ اندازِ تحریر سے کبھی خود کو جدا نہیں کرسکتے۔موضوع کتنا ہی فکر انگیز کیوں نہ ہو مجتبیٰ حسین کی تحریروں کے رگ و پے میں مزاح اچھلتا کودتا نظر آتا ہے۔قدرت نے انہیں خلاقانہ ذہن اور بے مثل تخلیقی توانائی کے ساتھ طنز ومزاح نگاری کی بنیادی صفات،بصیرت وبصارت،ذہنی برتری،نکتہ رسی اور قلم کی روانی عطا کی ہے۔ان کے کالموں کا جائزہ لیجئے تو یہ احساس ہوگا کہ مجتبیٰ حسین نے کالم کی روایتی ہیئت اور کردار کو بدل دیا ہے۔''میرا کالم'' مجتبیٰ حسین کے موڈ کے تابع ہے۔اس کے موضوعات میں بلا کا تنوّع ہے۔ان کو برتنے کا انداز جداگانہ ہے۔اظہار میں تازگی وطرفگی اور مضحک پہلو،خلوت وجلوت کی کارستانیاں،ادب وسماج کی بوالعجبیاں،سیاست دانوں کی ریاکاری،جبر واستحصال اور عام شہری مسائل مجتبیٰ کے مخصوص اندازِ نگارش کا ہدف بنتے ہیں۔مجتبیٰ کا قاری ان کے پرمزاح اندازِ تحریر کا قتیل ہے اور مجتبیٰ کی تحریریں اس کے مطالعے کا لوازمہ ہیں۔

پدم شری مجتبیٰ حسین

ایوارڈ،انعام یا اعزاز مل جائے تو کوئی فرد عظیم اچھا اور ممتاز فنکار نہیں بن جاتا بلکہ عظیم،اچھے اور ممتاز فنکاروں ہی کو ایوارڈ،انعام اور اعزاز ملا کرتے ہیں۔ٹھیک ہے آپ بیسیوں ایسے نام لے لیں گے جو عظیم،اچھے اور ممتاز فنکار تھے یا ہیں لیکن ایوارڈ وغیرہ سے محروم ہیں۔اس کے جو بھی وجوہ ہوں یہ تو طے ہے کہ ایوارڈ پانے والے عظیم فنکار ہی ہوتے ہیں۔کبھی کبھار ایسی ویسی باتیں ہوجاتی ہیں اور لوگ باگ ایوارڈ حاصل کرنے کے لئے دوڑ دھوپ بھی کرلیتے ہوں لیکن عموماً ایسا نہیں ہوتا۔حق بہ حقدار رسید والی بات ہی ہوتی ہے۔نوبل انعام اور عالمی سطح کے ایوارڈز واعزازات سے قطع نظر ہمارے وطن عزیز میں کتنے ایوارڈ اور اعزاز نہیں۔محلّہ داری اور مقامی انجمنوں سے لے کر ساہتیہ اکادمی اور گیان پیٹھ ایوارڈ تک اور ادھر سرکاری سطح پر بھارت رتن،پدماوی بھوشن،پدما بھوشن اور پدما شری اعزازات ایسے ہی حاصل نہیں ہوتے۔اپنے من میں ڈوب کر جب کوئی سراغ زندگی پاتا ہے تو یہ دولت بیدار ہاتھ آتی ہے۔گھسنے پسنے کے بعد ہی حنا کا رنگ چوکھا ہوتا ہے۔اصل چیز فنکار کا اپنے قلم کے ساتھ اخلاص ہے۔آپ کسی رجحان،تحریک یا ازم کے حامی ہوں،اگر آپ اپنے قلم کے وفادار نہیں تو کچھ نہیں ہوتا،کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ہمارے ملک میں اور کئی اعزازات کی طرح پدما بھوشن،پدما شری اور دیگر اعزازات ہر سال عطا کئے جاتے ہیں۔ظاہر ہے اعزازات کے لئے کوئی ضابطہ،کوئی طریقہ کار،کوئی شرائط نامہ تو ہوتا ہی ہوگا۔بعض خود کو یا کسی اور کو ان ایوارڈ کے مستحق سمجھتے ہوں اور انہیں یہ نہیں ملا لیکن جب اور جتنے اصحاب کو ملا ہے ان کے تعلق سے یقیناً یہ کہا جائے گا کہ یہ لوگ اس کا استحقاق رکھتے تھے۔سال حال یوم جمہوریہ کے موقع پر تقسیم کئے جانے والے ان ایوارڈز میں ایک اہم نام معروف طنز ومزاح نگار مجتبیٰ حسین کا ہے۔مجتبیٰ حسین ایک طویل مدت سے لکھ رہے ہیں اور آج بھی ان کا قلم زندہ ہے۔وہ اردو کے فنکار ہیں اور ان کا قلم اردو لکھتا ہے لیکن ہمارے ملک کی بیشتر زبانوں میں ان کی تحریر کا ترجمہ ہوچکا ہے۔انگریزی کے علاوہ بیرون ملک کی زبانوں مثلاً جاپانی اور روسی وغیرہ میں ان کے ترجموں کو پڑھنے اور پسند کرنے والوں کی تعداد قابل لحاظ ہے۔چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ اردو میں لکھنے کے باوصف وہ صرف اردو کے نہیں ہندوستان کے ممتاز طنز ومزاح نگار ہیں درست ہوگا۔واقعہ بھی یہی ہے۔پدم شری کا یہ اعزاز مجتبیٰ حسین ہی کو نہیں اردو میں طنز ومزاح کی شستہ وشائستہ روایات کو،مجتبیٰ حسین کے ان گنت قارئین کو اور اردو ادب کو ملا ہے۔ویسے ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں۔مجتبیٰ حسین کو بھی ابھی کئی جہانوں کی سیر کرنی ہے۔یقین ہے وہ اور جہانوں کی سمت اپنا سفر جاری رکھیں گے۔مزید اعزاز وایوارڈ ان کے حصے میں آئیں گے۔

سلیمان اطہر جاوید (حیدرآباد،دکن)

اردو کا آخری قاری

مجتبیٰ حسین

پھر یوں ہوا کہ ۲۰۰۰ عیسوی گزر گئی تو لوگوں نے بیسویں صدی سے صاف بچ کر نکل جانے اور اکیسویں میں داخل ہونے کی خوشی بہت دُھوم دھام سے منائی۔ اُردو کے شاعر اور ادیب بھلا اس خوشی میں کیسے شریک نہ ہوتے، وہ تو خوشی منانے کے معاملہ میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ دوسرے کی بھی شادی ہو تو ایک عدد سہرا لکھ کر اس کی خوشی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ہم نے اُردو زبان کے سوائے کسی اور زبان کے شاعر کو دوسرے کی شادی پر اس قدر والہانہ انداز میں خوش ہوتے نہیں دیکھا۔ ہمارا ایمان ہے کہ شادیوں میں اتنی آمد نہیں ہوتی جتنی کہ سہروں میں ہوتی ہے۔ شادیاں اتنی فی البدیہہ نہیں ہوتیں جتنے کہ سہرے فی البدیہہ ہوتے ہیں۔ شادی تو خیر پھر بھی شادی ہے، آدمی میں ظرف ہو تو وہ دوسرے کی شادی پر بھی خوش ہو سکتا ہے مگر ہم نے بعض باکمال شاعروں کو دوسروں کے بچوں کی بسم اللہ پر شعر و سخن کے دریا بہاتے دیکھا ہے۔ ادب کا ایسا بے جا مصرف کسی اور زبان میں دیکھنے کو نہیں ملا۔ غرض اُردو کے شاعروں اور ادیبوں نے بھی اکیسویں صدی کے خیر مقدم کے لئے بے پناہ نظمیں کہیں اور ایک دوسرے کو لہک لہک کر سنائیں۔ مگر ایک منچلے شاعر نے اُردو ادیبوں اور شاعروں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اکیسویں صدی کی آمد کی خوشی ہمیں اپنے قارئین کے سامنے منانی چاہیے۔ بات معقول تھی مگر نہایت نامعقول وقت پر کہی گئی تھی۔ اردو کے شاعر اور ادیب پہلے تو بغلیں جھانکنے لگے کیوں کہ اُردو محاورے کے مطابق جھانکنے کے لیے بغل سے زیادہ کوئی اور موزوں جگہ نہیں ہوتی، بغلوں میں قاری نہ ملا تو بولے ”یہ کون سی بڑی بات ہے، ہم جب اُردو میں ادبِ عالیہ کی تخلیق کر رہے ہیں تو ہمارا کوئی قاری بھی ہوگا، کہیں نہ کہیں کوئی ہمارا کلام بھی پڑھتا ہوگا، ہم اپنے قاری کو جلد ہی تلاش کر لیں گے۔“

پھر ہر ادیب و شاعر نے اپنے اپنے علاقے میں قاری کی تلاش شروع کر دی۔

ایک راہ گیر سے پوچھا: ”کیوں بھئی! کیا آپ اُردو کے قاری ہیں؟“

راہ گیر بولا: ”یہ قاری کیا چیز ہوتی ہے جی؟“

”بھئی پاٹھک، پاٹھک کو قاری کہتے ہیں یعنی پڑھنے والا۔“

راہ گیر بولا: ”اوہ، آئی سی۔ آپ کون سی صدی کی بات کر رہے ہیں۔ سنتے ہیں کہ بیسویں صدی میں اُردو نام کی کوئی زبان بھی تھی، میرے دادا اُس زبان کے شاعر تھے۔ اپنا غیر مطبوعہ کلام میرے والد کو سونپ گئے تھے کہ بیٹا اس کلام کو محفوظ رکھنا، میں نے اس میں اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے۔ یہ کلیجہ پچھلے برس تک میرے پاس تھا، پھر میری بیوی نیا سے رڈّی والے کے ہاتھوں فروخت کر دیا اور اس طرح میرے دادا جان مرحوم کے کلام کی رائلٹی حاصل کر لی، چند دن اور گزر جاتے تو اُسے دیمک چاٹ جاتی اور یہ رائلٹی بھی نہ ملتی۔“

پھر ایک چور سے پوچھا، ”کیوں بھئی! کیا تم اُردو پڑھتے ہو؟“

چور بولا ”اُردو شریفوں کی زبان رہی ہے۔ اس سے ہمارا کیا تعلق۔ یوں بھی اردو کے ذریعہ نہ تو تالے توڑے جا سکتے ہیں اور نہ ہی نقب لگائی جا سکتی ہے۔“

ایک تاجر سے پوچھا: ”لالہ جی! کیا آپ اُردو پڑھتے ہیں؟“

تاجر بولا: ”دیکھو جی! ہم بزنس مین ہیں۔ کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتے، ہم تو صرف منافع کی زبان جانتے ہیں۔ اردو پڑھنے سے اگر ہمیں چار پیسے کا منافع ہوتا تو ہم اسے ضرور پڑھتے۔“

ایک اور شخص سے پوچھا: ”کیوں جناب! کیا آپ اُردو جانتے ہیں؟“

وہ بولا: میں تو نہیں جانتا البتہ میرے گھر میں ایک طوطا ہے جو بہت اچھی اُردو جانتا ہے۔ آپ میرے گھر آئیں تو کہے گا ”مہربانی، آداب عرض ہے، تشریف لائیے، زہے نصیب۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

”اچھا تو آپ کا طوطا سخن فہم بھی ہے، کیا یہ شعر اسے آپ نے سکھایا ہے؟“

وہ شخص بولا: ”میں کیا جانوں کہ شعر کیا ہوتا ہے۔ اصل میں میرے دادا کے پاس ایک طوطا تھا جسے مذکورہ بالا اُردو آتی تھی۔ اس کے بعد ہمارے گھر میں جتنے طوطے آئے وہ اُردو سیکھتے گئے، طوطوں کے پاس یہ اُردو نسلاً بعد نسلٍ آئی ہے۔“

”آپ نے اُردو کیوں نہیں سیکھی؟“

”میں پرندوں کی بولیاں سیکھنے کو ضروری نہیں سمجھتا۔“

ایک اور شخص سے پوچھا ”کیا آپ اُردو جانتے ہیں؟“

وہ بولا ”میں اُردو سیکھنا تو چاہتا تھا مگر مجھے معلوم ہوا کہ اُردو بڑی میٹھی زبان ہے اور مجھے شوگر کی بیماری ہے۔ ڈاکٹروں نے میٹھی چیزوں سے پرہیز بتایا ہے نا اس لیے اُردو سے دور رہتا ہوں۔“

o

عام لوگوں سے مایوس ہو کر اُردو کے شاعر اور ادیب اُردو کے ایک مرحوم نقاد کے بیٹے کے پاس گئے اور کہنے لگے:

”بھئی تمہارے والد بزرگوار تو اُردو کے پروفیسر اور نقاد تھے، وہ اُردو کی بقا کیلیے ایک انجمن بھی چلاتے تھے، تم اُردو ضرور جانتے ہوگے۔“

نقاد کے بیٹے نے کہا ”بھیا! کیوں میرے والد کی رُوح کو تکلیف پہنچاتے ہو۔ وہ اُردو کے نقاد تھے ضرور مگر صرف اس لیے اُردو کے نقاد تھے کہ

اُنہیں کوئی دوسری زبان نہیں آتی تھی ورنہ کون اس زبان میں تنقید لکھتا۔رہی اُردو کی بقاء کے لیے انجمن چلانے کی بات تو بھیا پیٹ بڑا بدکار ہے، شرافت کی زندگی گزارنے کے لیے آدمی کو بہت سے دھندے کرنے پڑتے ہیں۔ میرے والد نے صرف انجمن چلائی تھی کسی کی جیب تو نہیں کاٹی تھی۔ اگر وہ انجمن نہ چلاتے تو میری تین بہنوں کی شادیاں اس قدر دُھوم دَھام سے کون کرتا۔''

نقّاد کے بیٹے سے پوچھا گیا ''کیا تمہارے والد مرحوم نے تمہیں اُردو نہیں سکھائی تھی؟''

جواب ملا ''میرے والد دوسروں کے لڑکوں کو اردو ضرور پڑھایا کرتے تھے لیکن ذرا سوچئے وہ خود اپنی اولاد کے ساتھ ایسی زیادتی کیسے کر سکتے تھے۔ اُسی اُردو سے بچنے کے لیے تو انہوں نے مجھے انگلینڈ بھیجا تھا۔ میرے والد بڑے دُور اندیش آدمی تھے۔ اُردو کی خدمت اس ڈھنگ سے کرتے تھے کہ بھلے ہی اُردو تباہ ہو جائے لیکن خاندان پر کوئی آنچ نہ آئے۔ نتیجہ میں آج ہمارا خاندان دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے، اور اُردو کا ردیکھیے کیا ہو چکا ہے۔''

o

چراغ تلے اندھیرے کو دیکھ کر ادیب پریشان ہو گئے۔ انہوں نے فوراً ایک میٹنگ بُلائی تا کہ اس نازک صورتِ حال پر غور کیا جا سکے۔ جلسے کے صدر نے گلوگیر آواز میں کہا: ''بھائیو! آج ہم ایک عجیب وغریب صورت حال سے دوچار ہیں، ہمارے پاس ساز تو ہے پر آواز نہیں، آگ تو ہے مگر دُھواں نہیں، پھول تو ہے مگر خوشبو نہیں، ہوا تو ہے مگر طوفان نہیں، سمندر تو ہے مگر قطرہ نہیں، دل تو ہے مگر دھڑکن نہیں، غم تو ہے مگر آہ نہیں....''

اس پر کسی نے پکار کر کہا ''قبلہ، یہ شاعری تو ہے مگر تقریر نہیں، صاف صاف بتائیے کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

صدرِ جلسہ نے کہا ''بھائیو! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم برسوں سے شعر کہہ رہے ہیں اور آج ہمیں پتہ چل رہا ہے کہ ہمارے کلامِ بلاغت نظام کو پڑھنے والا کوئی نہیں۔ ہم برسوں سے ایک دوسرے کو کلام سُنا کر خوش ہو رہے ہیں، ہمیں وہ قاری چاہیے جو خود شاعر یا ادیب نہ ہو، ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی زبانوں کے پاس قاری موجود ہیں لیکن قاری نہیں ہے تو صرف اُردو کے پاس۔ ہمیں فوراً اپنے قاری کو تلاش کرنا چاہیے۔''

اس پر ایک ادیب نے تجویز پیش کی ''ہمیں فوراً حکومت سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ وہ ہمارے شعر اور افسانے پڑھنے کے لیے چند اُردو قاریوں کا تقرّر کر دے، ان قاریوں پر یہ ذمہ داری عائد کی جائے کہ وہ روزانہ پابندی سے دفتر آئیں اور آٹھ گھنٹے ہماری شاعری اور افسانوں کا مطالعہ کریں۔ یوں بھی اِدھر کئی برسوں سے ہم اُردو کے معاملہ میں حکومت کی طرف دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں، اُردو اکیڈمیوں کی امداد سے ہم کتابیں چھاپتے رہے ہیں، ان کتابوں پر انعام لیتے رہے ہیں۔ جب حکومت نے ان کتابوں کی اشاعت کا بندوبست کیا ہے تو حکومت کا یہ فرض بن جاتا ہے کہ وہ ان کتابوں کو پڑھنے کے لیے قاریوں کا انتظام بھی کرے۔ اگر حکومت ہمارے مطالبہ کو تسلیم نہیں کرتی تو ہم اس کے خلاف نظمیں کہیں گے، افسانے لکھیں گے اور حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔''

ایک شاعر نے کہا: ''بھائیو! اب ہماری اینٹ صرف محاورے میں ہی بج سکتی ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنے طور پر قاری کو تلاش کرنا چاہیے۔ سرکاری قاری ہمارے ادب کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے گا۔ وہ ہمارے ادب کو بھی دفتر کی فائل بنا دے گا۔''

بہت غور وفکر کے بعد یہ طے ہوا کہ اُردو کے قاری کی تلاش کے لیے ہندی اور انگریزی اخباروں میں اشتہار دیے جائیں۔ اُردو جریدوں میں اشتہار دینے کا سوال اس لیے پیدا نہیں ہوتا تھا کہ اُن کو صرف شاعر اور ادیب ہی پڑھتے تھے۔ چنانچہ دوسرے دن ہی اخباروں میں حسب ذیل اشتہار چھپا:

اردو کے قاریو! تم کہاں ہو؟

''ہم اُردو کے شاعر اور ادیب اس بات سے بہت دُکھی ہیں کہ تم ہم سے رُوٹھ کر چلے گئے ہو، اگر چہ ہمیں پتہ نہیں کہ تم کب رُوٹھ کر چلے گئے، ہم شعر وشاعری میں اس قدر مصروف رہے کہ تمہارے جانے کا احساس بھی نہیں ہوا، بھلے آدمی کوئی اس طرح روٹھ کر چلا جاتا ہے، جانے سے پہلے بتا تو دیا ہوتا، یوں چوروں کی طرح جانے کی کیا ضرورت تھی، چاہے کچھ بھی ہو ہم تمہارے جانے سے بہت دُکھی ہیں۔ کھانا تو ہم پہلے بھی نہیں کھاتے تھے۔ تمہارے غم میں ادھر ایک ہفتہ سے کسی شاعر نے ایک شعر بھی نہیں کہا ہے۔ تم اس اشتہار کو دیکھتے ہی فوراً چلے آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے۔ تمہیں کچھ بھی نہیں کہا جائے گا۔ اگر واپسی کا کرایہ نہ ہو تو ہمیں لکھ بھیجو، ہم اردو اکیڈمی کی طرف سے تمہارے لیے واپسی کا کرایہ بھیج دیں گے، پیسے کی فکر نہ کرو۔ اکیڈمی کے بجٹ کی بڑی رقم ہر سال لیپس (LAPSE) ہو جاتی ہے۔ تم اُردو ادب کی آبرو ہو، تم اُردو کی آخری شمع ہو، تم اُردو کی مانگ کا سیندور ہو۔

نوٹ:۔ اگر کوئی شخص اُردو قاری کا پتہ بتائے تو اسے اُردو اکیڈمی کی طرف سے منہ مانگا انعام دیا جائے گا اور اُردو ادب کی اس عظیم خدمت کے صلے میں اس کا نام اُردو ادب کی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔ یوں بھی اُردو ادب کی تاریخ لکھنے کے لیے ہمارے پاس عموماً سنہری روشنائی کا ہی استعمال کیا جاتا ہے''۔

اشتہار چھپنے کے بعد کئی دِنوں تک نہ قاری آیا اور نہ ہی کوئی اطلاع آئی، البتہ پندرہ دن بعد ایک مخبر کا خط انڈمان سے آیا کہ اُردو کا ایک قاری یہاں موجود ہے، خبر دار کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے، اس بات کو راز میں رکھا جائے۔ اگر اُسے پہلے سے معلوم ہو جائے کہ آپ حضرات اسے لینے کے لیے آ رہے ہیں تو وہ بھاگ جائے گا، اب وہ بڑی خوشحال زندگی گزار رہا ہے کیوں کہ اب وہ اُردو نہیں پڑھتا۔ میں اس پر نظر رکھتا ہوں اور ہاں آتے ہوئے میرا انعام بھی لیتے آیئے جو آپ کے اشتہار کے مطابق منہ مانگا ہوگا۔ پہلے آپ اپنے

قاری کو دیکھ لیں اور اس کے بعد مجھے انعام دیں۔

o

اس اطلاع کا ملنا تھا کہ اُردو ادیبوں اور شاعروں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، خوشی کی لہر کیسے نہ دوڑتی، آخر انہیں اُن کا قاری جو مل گیا تھا۔ شاعروں نے اپنی غزلوں کو مانجھنا اور افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کو چمکانا شروع کر دیا۔

طے یہ کیا گیا کہ اُردو شاعروں اور ادیبوں کا ایک وفد چپکے سے انڈمان جائے اور اپنے قاری کو سمجھا بجھا کر لے آئے۔ چنانچہ ایک رات اُردو کے کچھ ادیب اور شاعر اپنی پیٹھوں پر اردو کے عصری ادب کو لادے جزیرۂ انڈمان کی دھرتی پر اُتر گئے۔ مخبر پہلے سے اُن کا انتظار کر رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں وفد کے ارکان دبے پاؤں اُردو کے آخری قاری کے گھر پہنچے۔ وہ اپنے گھر میں میٹھی نیند سو رہا تھا۔

مخبر نے کہا: ''بھائیو! اس مکان کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لو، آپ کا قاری اور میرا انعام بچ کر نہ جانے پائے۔''

شاعروں اور ادیبوں نے قاری کے گھر کے دروازے کے آگے عصری ادب کو اس طرح رکھ دیا کہ قاری اپنے گھر سے باہر نہ نکلنے پائے۔ صبح ہوئی تو قاری نے دیکھا کہ وہ اُردو ادیبوں اور اُردو ادب کے نرغے میں آ چکا ہے۔

اس نے اندر سے پُکار کر کہا ''تم لوگ کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو؟''

وفد کے لیڈر نے کہا ''اے اُردو کے آخری قاری! ہم اُردو کے ادیب اور شاعر ہیں۔ ہم بڑی دُور سے تمہاری چوکھٹ پر آئے ہیں۔''

قاری نے پُکار کر کہا: ''اُردو کے شاعرو اور ادیبو! مجھے معلوم تھا کہ ایک دن تم میرے پاس ضرور آؤ گے مگر پہلے میرے دروازے کے سامنے سے اُردو ادب کو تو ہٹاؤ تا کہ میں باہر آ سکوں۔''

اُردو ادب کو ہٹایا گیا تو قاری دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ اس کے آنے کی دیر تھی کہ ایک شاعر نے لپک کر سلام عرض کیا اور کہا ''حضور توجہ چاہتا ہوں، مطلع عرض کیا ہے...''

قاری پھر گھر کے اندر بھاگ گیا اور بولا ''بھائیو! میں ادب کے اس اچانک حملے کو برداشت نہیں کر سکوں گا۔ عرصہ ہوا کہ اُردو شعر سننے کی پریکٹس چھوٹ چکی ہے زبان کو مکرّر اور سُبحان اللہ کہنے کی عادت نہیں رہی۔''

اس پر وفد کے لیڈر نے کہا ''پیارے قاری! ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تمہیں غفلت میں شعر نہیں سنائیں گے۔ ہم تم سے ملنا چاہتے ہیں۔''

قاری ڈرتا اور سہمتا ہوا پھر باہر آ گیا۔ وفد کے لیڈر نے اسے سینے سے لگا کر کہا: ''پیارے قاری! تم ہم سے روٹھ کر کیوں چلے آئے۔ تمہیں کیا پتہ کہ ہم تمہارے لیے کتنے بے چین ہیں، تمہیں ہمارے ساتھ واپس چلنا ہوگا۔ ہم تمہیں آرام سے رکھیں گے۔ ہم جنوں کی حکایت لکھتے رہیں گے اور تم اسے پڑھتے رہو۔''

قاری بولا ''بھائیو! میں برسوں تمہارے جنوں کی حکایت پڑھتا رہا مگر بعد میں اس حکایت سے شکایت ہونے لگی کہ یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں نے دو ایک شاعروں سے شکایت بھی کی کہ تمہاری حکایت اب اتنی خونچکاں ہو چکی ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ اب ادب میں ذات کے کرب کا اظہار ضروری ہو گیا ہے۔ میں نے شعر پڑھنا چاہا تو مجھے عجیب و غریب علامتیں دی گئیں۔ میں نے افسانہ پڑھنا چاہا تو نفسیات میرے آگے بڑھا دی گئی۔ نظم پڑھنی چاہی تو تنہائی کا زہر میری ذات میں گھولا جانے لگا۔ ادب میں اتنے تجربے کیے گئے کہ ادب لیبارٹری میں تبدیل ہو گیا۔ ہر ادیب نے ادب کو ایک نیا موڑ دینا چاہا۔ چنانچہ ہمارا ادب اتنا مُڑا تُڑا ہو گیا کہ اسے دیکھتا تو احساس ہوتا کہ برسوں بعد کسی گھڑے میں سے نکالی ہوئی شیروانی کو دیکھ رہا ہوں۔ جب افسانے میں سے کہانی اور غزل میں سے شاعری غائب ہونے لگی تو میں نے دبی زبان میں آپ حضرات سے پھر شکایت کی۔ آپ نے فرمایا کہ اب ہم اپنے لیے شعر کہتے ہیں۔ قاری کے لیے نہیں کہتے۔ سو پندرہ سال پہلے ایک دن میں چپ چاپ اُردو شعر و ادب کو چھوڑ کر یہاں چلا آیا۔ اب میں دوسری زبانیں سیکھ گیا ہوں۔ خدا کے فضل سے اچھا ہوں۔ آپ لوگوں کی آمد سے پتہ چلا کہ ہندوستان میں اب بھی اُردو میں شعر کہے جا رہے ہیں اور افسانے لکھے جا رہے ہیں۔ بڑے بے شرم لوگ ہیں آپ بھی۔''

وفد کے لیڈر نے آہ بھر کر کہا کہ ''پیارے قاری، شعر اور افسانے لکھے تو جا رہے ہیں مگر انہیں پڑھنے والا کوئی نہیں۔ جبھی تو ہم تمہیں لینے آئے ہیں۔ تم ہمارے ساتھ چلو، اور وہ اُردو ادب پڑھو جسے ہم نے پچھلے پندرہ بیس برسوں میں لکھا ہے۔''

ایک افسانہ نگار نے کہا: ''پہلے میرے افسانے پڑھو، صرف چھ مجموعے ہیں۔''

ایک شاعر نے کہا: ''نہیں پہلے میرا کلام پڑھو، صرف دس مجموعے ہیں۔''

اس پر دوسرے شاعر نے کہا: ''پہلے میری نظمیں پڑھو کیوں کہ یہ اب تک نہیں چھپی ہیں۔''

پہلے شاعر نے کہا: ''نہیں تمہیں پہلے میرا کلام پڑھنا ہوگا۔''

دونوں شاعروں میں اس بات پر ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی۔ اس افرا تفری سے فائدہ اُٹھا کر اُردو کا آخری قاری بھاگ کھڑا ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

پھر پتہ نہ چلا کہ اُردو کا یہ آخری قاری کہاں چلا گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ مرا نہیں زندہ ہے اور سبھاش چندر بوس کے ساتھ ایک دن پھر ہمارے درمیان آئے گا۔ اُردو شاعر اور ادیب اب بھی اس کی واپسی کی آس لگائے بیٹھے ہیں اور شعر کہے چلے جا رہے ہیں۔

ادیبوں کے
گھریلو حالات بے تصویر
مجتبیٰ حسین

ادھر چند روز پہلے ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ادیبوں کے گھریلو حالات باتصویر شائع کئے جائیں۔ چنانچہ اسی فیصلہ کی روشنی میں ادیبوں کے گھریلو حالات بے تصویر شائع کئے جارہے ہیں، اگر آپ پوچھیں کہ ہم ادیبوں کے گھریلو حالات کو بے تصویر کیوں شائع کر رہے ہیں تو جواب اس کا یہ ہے کہ:

''تصویر تیری دل مرا بہلا نہ سکے گی۔''

بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ جو ادیب صاحب نہایت سیدھی سادی سے بھی گئی گزری زندگی گزارتے ہوں وہ تصویر میں یوں نظر آئیں جیسے کسی فلم کے ہیرو ہوں اور جیسے ان کی دس پندرہ کوٹھیاں ہوں اور پندرہ بیس موٹریں دروازے پر کھڑی جھول رہی ہوں۔

مثلاً ایک ادیب محترم نے جو تصویر روانہ کی ہے تو وہ تصویر کم ہے اور اُن کے گھر کا اشتہار زیادہ۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اطراف گھر کی ساری قیمتی اشیاء جمع کر رکھی ہیں (سوائے بیوی کے)، ایک طرف ریڈیو رکھا ہے، دوسری طرف ریفریجریٹر ایستادہ ہے، تیسری طرف کپڑوں کی الماری ہاتھ باندھے کھڑی ہے (حد تو یہ کہ الماری بھی کھلی چھوڑ رکھی ہے تا کہ دنیا والوں کو معلوم ہو کہ دیکھئے صاحب ہم بھی کیسے خوش لباس ہیں) چوتھی طرف کتابوں کی الماریاں رکھی ہوئی ہیں۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں، ہم نے جب اس تصویر کو ان لارج کروایا تو پتہ چلا کہ ان الماریوں میں خود ادیب موصوف کی پرانی تصانیف کے وہ نسخے رکھے ہوئے ہیں جو بک نہ سکے۔ پھر پانچویں طرف خود ادیب صاحب، جو سوٹ میں ملبوس ہیں، ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں اور ٹیبل پر جھکے ہوئے تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف ہیں، پتہ نہیں عکس کشی کے وقت جب وہ تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف تھے ان کے قلم میں سیاہی بھی تھی یا نہیں۔ یا صرف کاغذ پر ڈرائی رائٹنگ کا مظاہرہ فرما رہے تھے۔ اب ان ادیب صاحب سے کون کہے کہ صاحب گھر میں سوٹ نہیں پہنا جاتا بلکہ قمیص پاجامہ پہنا جاتا ہے اور اگر یہ بھی نہ پہنا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں (کیونکہ گھر ہے ہی ایسی جگہ)۔ پھر یہ جو آپ نے اپنے ریڈنگ ٹیبل کے برابر ریفریجریٹر رکھا ہے تو یہ کس خوشی میں رکھا ہے۔ پھر اس کے برابر الماری کیوں رکھی ہے۔ بہتر تو یہ ہوگا کہ آپ اپنی کتابیں بھی ریفریجریٹر میں رکھا کریں۔ اس طرح ان کی تازگی بھی برقرار رہ سکے گی اور انہیں دیمک بھی نہ چاٹ سکے گی۔

ہمیں ان تصاویر کو چھاپنے میں کوئی اعتراض نہ تھا لیکن ان کی اشاعت سے خود ادیبوں اور شاعروں کا نقصان ہوسکتا تھا۔ مثلاً کسی مقامی چور نے یہ تصاویر دیکھ لیں تو وہ خواہ مخواہ ان کے گھر چوری کرنے کی سعی لا حاصل کرے گا اور جب وہاں سے کچھ نہ ملے گا تو اخبارات میں تردیدی بیانات شائع کرواتا پھرے گا کہ صاحب فلاں ادیب نے دو ریفریجریٹر، دو ریڈیو سٹ، دس پندرہ گھڑیوں، دو الماریوں اور نہایت قیمتی اشیاء کے ساتھ جو تصویر فلاں رسالہ میں شائع کروائی تھی وہ بالکل جھوٹ اور بے بنیاد ہے۔ کیونکہ جب میں اس تصویر کو اپنا رہنما بنا کر ان کے گھر میں چوری کرنے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ موصوف کے گھریلو حالات اور میرے گھریلو حالات میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ میں نے ان کے گھر میں جو اشیاء پائیں تقریباً وہی اشیاء میرے گھر میں بھی موجود ہیں، پھر میں ان اشیاء کو چرا کر کیا کرتا بلکہ ادیب صاحب کے گھر میں نے ایک ایسی پھٹی ہوئی پرانی چپل بھی دیکھی کہ مجھے بے ساختہ ترس آ گیا اور میں اپنی چپل ان کے گھر چھوڑے آرہا ہوں۔ لہٰذا چور برادری کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ وہ ایسی بے بنیاد اور لغو تصویروں سے متاثر نہ ہوں بلکہ یہ سمجھیں کہ ؏

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

اب ہم آپ کو کیا بتائیں کہ ابھی چند روز پہلے ایک افسانہ نگار نے اپنے گھریلو حالات کے ساتھ اپنے گھر کی ایک تصویر بھی روانہ کی تھی۔ کیا بتائیں کیسی شاندار تصویر تھی (ہمارا مطلب گھر کی تصویر سے ہے) لیکن ابھی ہم نے اسے شائع بھی نہ کیا تھا کہ ایک بزرگ کا خط ہمیں وصول ہوا جس میں ہمیں وارننگ دینے کے انداز میں لکھا تھا کہ وہ جو فلاں افسانہ نگار نے اپنے گھر کی تصویر آپ کے ہاں بغرض اشاعت روانہ کی ہے براہ کرم اسے شائع نہ فرمایئے کیونکہ افسانہ نگار نے جس گھر کی تصویر روانہ کی ہے وہ دراصل میرے گھر کی تصویر ہے اور میں ان کا سسر ہوں۔ صاحب یہ تو بڑی زیادتی ہے کہ افسانہ نگار صاحب اول تو میرے گھر میں ''گھر داماد'' کی حیثیت سے رہتے ہیں اور اوپر سے میرے گھر کو اپنا بتلا کر اس کی تصویریں اخباروں میں شائع کروا دیتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ میں اپنے گھر کے حقوق مالکانہ افسانہ نگار موصوف کے نام منتقل کرنا چاہتا تھا لیکن ان کی موجودہ حرکات کو دیکھنے کے بعد میں نے اپنا فیصلہ تبدیل کر دیا ہے۔ صاحب حد ہوگئی کہ انہوں نے اپنے افسانوں کا جو تازہ مجموعہ شائع کیا ہے اسے کم از کم میرے نام معنون کرنے تک کی موصوف نے زحمت گوارہ نہیں کی۔ پھر میں کس امید پر اپنا گھر اُن کے نام معنون کر دوں۔ لہٰذا آپ سے گزارش ہے کہ آپ میرے گھر کی تصویر رسالہ میں شائع نہ فرمائیں ورنہ آپ کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔ پھر ہرجہ و خرچہ کی ذمہ داری بھی آپ پر ہی ہوگی۔

غرض حضرات! یہی وہ مشکلات ہیں جن کی بناء پر ہم نے ادیبوں کے گھریلو حالات کو ''بے تصویر'' ہی شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہم یہاں صرف ایسے ادیبوں کے گھریلو حالات شائع کر رہے ہیں جنہوں نے اپنے گھریلو حالات کو لکھتے وقت ''ادب برائے زندگی'' کے نظریہ پر عمل کیا ہے:

شاہین تمنّا (واضح ہو کہ یہ صاحب افسانہ نگار ہیں)

مکرمی! میرے گھریلو حالات یہ ہیں کہ میرا کوئی گھر نہیں ہے، اگر

آپ اپنے خرچہ سے کوئی مکان دلا دیں تو انشاءاللہ پانچ چھ مہینوں میں کچھ ایسے حالات پیدا کرنے کے قابل ہو جاؤں گا کہ جنہیں گھریلو حالات کا نام دیا جا سکے۔ تب میں آپ کو اپنے گھریلو حالات ضرور روانہ کروں گا۔ اگر آپ کو یہ شرط منظور ہے تو براہِ کرم اس کی اطلاع ڈاک کے ذریعہ دینے کی کوشش نہ کریں کیونکہ میرا کوئی اتا پتہ نہیں ہے۔ اتا پتہ تو اس کا ہوتا ہے جو گھر میں رہتا ہے اور ابھی ہمارے ملک میں ڈاک کا انتظام اتنا بہتر نہیں ہوا ہے کہ وہ چلتے پھرتے بے گھر ادیبوں کے ''محل وقوع'' کا پتہ چلا سکے۔ لہٰذا آپ اس اطلاع کو اگر اپنے رسالہ میں شائع فرما دیں تو میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔

س۔فرشوری کانپوری

مکرمی! آپ نے میرے ''گھریلو حالات'' طلب کئے ہیں۔ اگر آپ میرے گھریلو حالات خود لینا اور اپنے گھریلو حالات مجھے سونپ دینا چاہتے ہیں تو میں بخوشی اپنے گھریلو حالات آپ کی خدمت میں روانہ کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن پہلے کچھ تو معلوم ہو، بصورت دیگر میں اپنے گھریلو حالات کو شائع کرنے کا خواہشمند نہیں ہوں کیونکہ یہ ایک کانفیڈنشیل مسئلہ ہے۔ باقی گھریلو حالات لائق تشکر۔

شاہد قادری رزّاقی فاروقی، آسام

مکرمی! آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ آپ میرے گھریلو حالات شائع کرنا چاہتے ہیں۔ بھائی، آپ نے بڑا مشکل مسئلہ کھڑا کر دیا ہے کیونکہ میں گزشتہ چھ مہینوں سے اپنے گھر نہیں جا سکا ہوں۔ چھ ماہ پہلے جنوبی ہند سے مشاعرے پڑھتے پڑھتے جو نکلا تھا تو اب آسام پہنچا ہوں۔ اس لئے مجھے اپنے گھریلو حالات کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے بلکہ میں نے خود اپنی بیوی سے اپنے گھریلو حالات طلب کئے ہیں لیکن وہ مجھ سے کچھ اتنی خفا ہے کہ جواب دینا تک پسند نہیں کرتی۔ لہٰذا میں آپ سے گزارش کروں گا کہ آپ خود میری بیوی کو خط لکھیں اور اس سے میرے گھریلو حالات آواز دے کر طلب فرما لیں لیکن انہیں شائع کرنے سے پہلے مجھے ضرور بتا دیجئے۔ اگر بیوی نے ایسی ویسی بات لکھ دی تو میرا سارا ادبی وقار خاک میں مل جائے گا۔

عبدالرحیم وفا، حیدرآباد

مکرمی! آپ نے میرے گھریلو حالات طلب کئے ہیں۔ عالی جناب آپ کو کیا اختیار پہنچتا ہے کہ میرے گھر کے حالات میں مداخلت کریں۔ لیکن آپ نے خواہش کی ہے تو عرض کئے دیتا ہوں۔ میرے گھریلو حالات یہ ہیں کہ میں رات دو بجے گھر پہنچتا ہوں اور ٹھیک سوا دو بجے سو جاتا ہوں۔ میری بیوی بڑی نافرمانبردار ہے کیونکہ میں نے آج تک اُسے میری واپسی کا انتظار کرتے نہیں دیکھا۔ صبح نو بجے اٹھتا ہوں۔ اس وقت تک سارے بچے اسکول چلے جاتے ہیں۔ اب آپ سے کیا کہوں کہ میں نے گزشتہ تین سال کے عرصہ میں اپنے بچوں کی صورت ہی نہیں دیکھی بلکہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس وقت میرے کتنے بچے ہیں۔ سنا ہے کہ گیارہ بچے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

لیکن میں حساب میں بہت کمزور ہوں (جیسا کہ ہر شاعر ہوتا ہے) اور ہر سال چونکہ گھر میں ایک بچہ کا اضافہ ہوتا رہتا ہے اس لئے میں نے یہ حسابی مفروضہ بنا رکھا ہے کہ شادی کی تاریخ کے بعد سے برسوں کا حساب لگایا جائے اور جتنے برس نکلتے ہیں، بچوں کی تعداد بھی اتنی ہی قرار دی جائے (واضح ہو کہ گیارہ سال پہلے میری شادی ہوئی تھی) اگر کسی دن فرصت ملے تو کسی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کی خدمات سے استفادہ کروں گا اور بچوں کا بیلنس شیٹ مرتب کروں گا۔ میری بیوی نے آج تک مجھ سے کبھی سیدھے منہ بات نہیں کی (اس کے منہ کا بھی کچھ قصور ہے) البتہ ایک بار میں نے اس سے کہا تھا ''پیاری! تم مجھ سے خفا کیوں رہتی ہو۔ اگر میں تمہارے لئے اس زندگی میں کوئی عالی شان بنگلہ تعمیر نہ کرواسکا تو کیا ہوا، میں تمہارے مرنے کے بعد ایک ایسا مقبرہ ضرور تعمیر کراؤں گا جو تاج محل کو بھی شرما دے۔'' اس پر وہ نابنجار بولی ''میرے پیارے شاعر، تم یہ مقبرہ ضرور بنوا دینا لیکن اس مقبرہ پر جو کتبہ لگایا جائے گا اس پر یہ عبارت کندہ ہونی چاہیے کہ ''یہ مقبرہ وفا مرحوم کی بیوہ کا ہے۔'' اس دن کے بعد سے آج تک میں نے اس سے بات نہیں کی۔ دیکھئے کون کس کا مقبرہ بناتا ہے چونکہ میں رات کے دو بجے سے صبح نو بجے تک سوتا رہتا ہوں اور دوسرے دن پھر رات میں دو بجے واپس آنے کے لئے ساڑھے نو بجے روانہ ہو جاتا ہوں اس لئے مجھے اپنے گھریلو حالات کا کوئی علم نہیں۔

جناب دماغ پاشی

(موصوف چونکہ شاعر واقع ہوئے ہیں اس لئے اپنا نام بڑا مناسب رکھا ہے۔)

عزیز دوست! میرے گھریلو حالات یہ ہیں کہ میرے گھر کی چھت بارش میں بہت ٹپکتی ہے اور گرمی میں اس چھت سے دھوپ چھن چھن کر آتی ہے۔ موسم سرما آتا ہے تو میں اس کی دیواریں اوڑھ لیتا ہوں اور یوں سردیوں سے بچا رہتا ہوں۔ سچ پوچھئے تو گھر ہی میرا اوڑھنا بچھونا ہے یعنی اس کا فرش میرا بچھونا ہے اور اس کی چھت میرا اوڑھنا ہے۔ یہی وہ کمرہ ہے جہاں بیٹھ کر میں فکرِ غزل کرتا ہوں (کاش کہ کبھی فکرِ معاش بھی کر سکتا)۔ میرا پروگرام یہ ہے کہ میں دن میں اپنی اولاد حقیقی سے دل بہلاتا ہوں۔ اور جب رات آتی ہے تو میری اولاد معنوی یعنی شاعری میرا دل بہلانے لگتی ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ میں ایک دفتر میں معمولی اکاؤنٹنٹ ہوں۔ لہٰذا میری شاعری پر کبھی حساب غالب آجاتا ہے اور کبھی حساب پر شاعری غالب آجاتی ہے۔ میں نے اب تک جملہ ایک ہزار غزلیں کہی ہیں اور اس طرح فی غزل پانچ اشعار کے حساب سے میرا شعری سرمایہ پانچ ہزار اشعار بنتا ہے (جس کے دس ہزار مصرعے بنتے ہیں)۔ چھوٹی بحر میں پانچ سو غزلیں کہی ہیں اور بڑی بحر میں تین سو غزلیں۔ بقیہ غزلوں میں بحر تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ہر بار یوں لگا جیسے بحر ہند میں غوطے لگا رہا ہوں۔ شعر کہنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہر نصف گھنٹہ کے وقفہ کے بعد شعر کہتا ہوں (لوگ میری شعر گوئی سے اپنی گھڑیوں کا وقت تک ملا لیتے ہیں)۔ اگر میں بیس برسوں تک جیتا رہا تو تین لاکھ پچاس ہزار چار

سواشعار کہہ ڈالوں گا۔ دیکھتا ہوں دنیا میرا کیا بگاڑ لے گی۔
شفا دواخانوی، گورکھپور

مجی! میرے گھریلو حالات یہ ہیں کہ میں نے گزشتہ چھ مہینوں سے مکان کا کرایہ ادا نہیں کیا۔ ایک سال سے بجلی بھی کٹ گئی ہے۔ نل تو پہلے بھی نہیں تھا لیکن خوش قسمتی یہ ہے کہ ہمارے مالک مکان کے لڑکے کو شعر و شاعری سے بڑی دلچسپی ہے۔ دلچسپی ان معنوں میں کہ وہ مجھ سے اشعار لکھواتا ہے اور انہیں مشاعروں میں اپنے نام سے پڑھ کر سناتا ہے۔ اور یوں خوب داد و تحسین وصول کرتا ہے (کرایہ جو وصول نہیں کرتا)۔ میں بھی ان اشعار کی جی کھول کر داد دیتا ہوں۔ اگر کبھی داد نہ دوں تو کہتا ہے، ابھی مکان سے تخلیہ کرادوں گا۔ دیکھئے میری شاعری کب تک مجھے اس مکان میں سکونت پذیر رہنے کو موقع عطا کرسکتی ہے۔ ان حالات کے بعد میرے کیا گھریلو حالات ہوسکتے ہیں۔ زندگی نے وفا کی تو آپ سے کبھی نہ کبھی ضرور ملاقات ہوگی ورنہ جہنم میں آپ سے ملاقات تو یقینی ہے۔ باقی بالمشافہ (جہنم میں)۔
عالم بے عملوی۔ لدھیانہ

قبلہ! آپ نے بحیثیت شاعر میرے ''گھریلو حالات'' طلب کئے ہیں۔ سو میں آپ کو آگاہ کیئے دیتا ہوں کہ شاعری میں میری حیثیت یہ ہے کہ میں نے زندگی بھر میں صرف ایک شعر کہا ہے۔ سنا ہے کہ ایک بار غالب، مومن کا ایک شعر سن کر اپنا سارا دیوان ہی ان کے حوالہ کر دینے پر تیار ہوگئے تھے۔ میں بھی کسی ایسے شاعر کی تلاش میں ہوں جو میرے اس شعر کے معاوضہ میں سارا دیوان دینے کے لئے تیار ہوجائے۔ یہ بڑا اچھا سودا رہے گا اور میں بھی شاعری کی زد میں آنے سے بچ جاؤں گا۔ اگر آپ کی نظر میں کوئی ایسا شاعر ہو تو معلوم کیجئے۔
شائستہ دانستہ۔ لکھنؤ
(یہ خاتون افسانہ نگار ہیں)

مکرمی! آپ نے مجھے یاد کیا، اس کے لئے میں آپ کی شکر گزار ہوں کیونکہ اب اس دنیا میں مجھے یاد کرنے والے بہت کم باقی رہ گئے ہیں اور جو ایک شخص مجھے یاد کرسکتا تھا تو اس نے مجھ سے شادی کرلی ہے۔ خیر وہ بھی کیا یاد کرے گا۔ آپ میرے گھریلو حالات کیا پوچھتے ہیں۔ میں اپنے گھریلو کاموں میں بہت مصروف رہتی ہوں یعنی صبح میں خادمہ سے جھاڑو لگواتی ہوں، ماما سے کھانا پکواتی ہوں، ایک اور ملازم سے بازار سے سودا سلف منگواتی ہوں۔ ابھی ناشتہ بھی نہیں کرنے پاتی کہ بچّوں کو اسکول بھجوانے کی فکر لاحق ہوجاتی ہے۔ چنانچہ حامد کو (جو میرے شوہر ہیں) یہ کام سونپ دیتی ہوں، بڑے کام چور آدمی ہیں۔ اسی لئے جب بچّوں کو کپڑے پہناتے ہیں تو مجھے ان کے سامنے بیٹھ کر ہدایات دینی پڑتی ہیں کہ فلاں بٹن ٹھیک سے لگاؤ، پپّو کے جوتے ڈبّو کو نہ پہناؤ۔ ڈبّو کی قمیص پپّو کو نہ پہناؤ۔ ہر بچے کی نصابی کتابوں کے ساتھ میرے افسانوں کے تازہ مجموعہ کے نسخے بھی رکھ دو۔ بچّے نہ پڑھیں گے تو کم از کم ان کے ٹیچر صاحب ہی پڑھ لیں گے۔ حامد کو ہدایتیں دیتے دیتے جب ناک میں دم آجاتا ہے تو میں ستانے کے لئے بستر پر لیٹ جاتی ہوں۔ اچانک نیند آجاتی ہے اور پھر شام میں پانچ بجے اچانک نیند اچٹ جاتی ہے، چھ بجے حامد دفتر سے واپس لوٹتے ہیں۔ اس لئے دروازے پر کھڑے ہوکر ان کا انتظار کرتی ہوں۔ اب میں اس انتظار سے بھی تنگ آگئی ہوں۔ کوئی ایک کام ہو تو انسان کرے بھی۔ سوچ رہی ہوں کہ آئندہ سے اپنی خادمہ کو حامد کے انتظار کے لئے دروازہ پر کھڑا کروں۔ اس طرح کچھ تو فرصت مجھے مل سکے گی۔ رات ہوتی ہے تو حامد کو اپنے ڈرائنگ روم میں طلب کرتی ہوں اور اپنا کوئی تازہ افسانہ ڈکٹیٹ کروانے لگتی ہوں۔ حامد چونکہ دن بھر کے تھکے ماندے ہوتے ہیں اس لئے روزانہ دو چار جملوں سے زیادہ ڈکٹیٹ نہیں کرواتی لیکن اس کام میں بھی کم از کم دو گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ جب حامد اونگھنے لگتے ہیں تو ان کے ہاتھ سے افسانہ کا ادھورا مسوّدہ لے لیتی ہوں۔ دو چار جملے ہی پڑھتی ہوں کہ نیند آنے لگتی ہے۔ پھر سو جاتی ہوں اور دوسرے دن جب بیدار ہوتی ہوں تو ایک نیا مصروف دن میرے انتظار میں کھڑا رہتا ہے اور پھر وہی مصروفیت کا چکر چل نکلتا ہے۔

مجتبیٰ حسین کا اسلوبِ مزاح

مجتبیٰ حسین بہت حساس واقع ہوئے ہیں، شخصیت فہمی جس گہرے نفسیاتی درک اور باریک بینی کا مطالبہ کرتی ہے اور بالخصوص ایک مزاح نگار کو جس طور پر بڑے وثوق اور بڑے اعتماد کے ساتھ اسے دلچسپ اور توجہ خیز بنانا پڑتا ہے، مجتبیٰ کے خاکے گروہی Stock یا انفرادی کردار انہیں ترجیحات کے حامل ہیں۔ البتہ آبگینوں کو ٹھیس لگنے کا ڈر انہیں بے حد محتاط بھی بنا دیتا ہے، یہی پاسِ احتیاط جہاں طنز کے آہنگ کو ایک خاص سطح سے بلند نہیں ہونے دیتا، وہیں مزاح کے لیے گنجائش پیدا کرنے یا بے خطر راہ نکالنے میں انہیں یقیناً بڑی کشاکشوں سے بھی گزرنا پڑتا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ خالص کشتگانِ شعروادب کے مقابلے میں بالانشینانِ عہد رواں اور دانشورانِ قہر ساماں کے خاکوں میں قلم کی رفتار اور شوخیٔ گفتار میں بڑا فرق ہے، تاہم کوئی بھی تحریر مجتبیٰ کے بلیغ جملوں اور ایسی عبارتوں سے خالی نہیں ہوتی جس میں ظاہر اور باطن کا تضاد جو قول محال کو راہ دیتا ہے۔

عتیق اللہ (•)
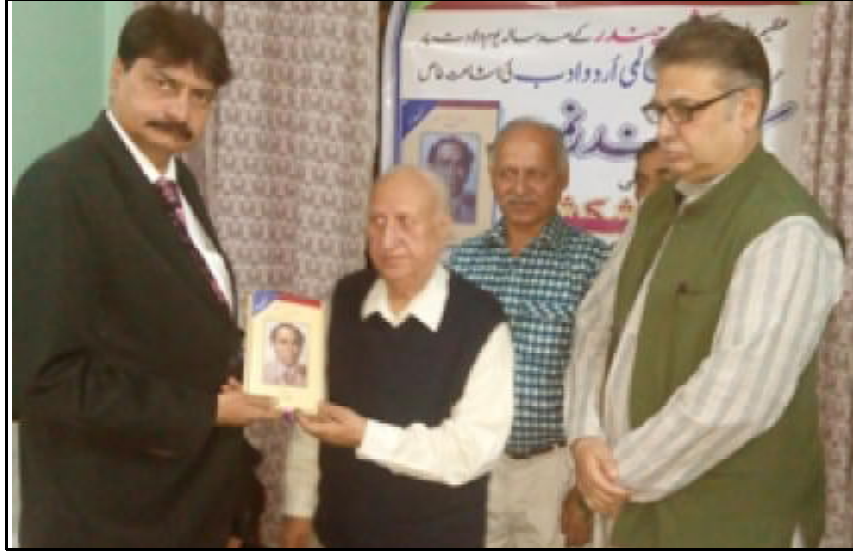
مدیرِ''عالمی اُردو ادب'' نند کشور وکرم کرشن چندر کے بھتیجے پون چوپڑا کو''کرشن چندر نمبر'' پیش کرتے ہوئے
ساتھ میں ہیں ڈاکٹر خالد اشرف اور دیپک بدکی

کرشن چندر کے صد سالہ یومِ ولادت کی تقریب
''عالمی اُردو ادب'' کے خصوصی نمبر کی پیش کش

نئی دہلی، ۲۴ نومبر:

عظیم افسانہ نگار کرشن چندر کے صد سالہ یوم ولادت ۲۳ر نومبر کو کرشن نگر، دہلی میں ایک تقریب کا انعقاد ہوا، جس میں ''عالمی اُردو ادب'' کے مدیر جناب نند کشور وکرم نے رسالہ کا خصوصی شمارہ ''کرشن چندر نمبر'' کی پہلی کاپی کرشن چندر کے بھتیجے جناب پون چوپڑا کو پیش کی۔ اس موقع پر دہلی کی متعدد مشہور و معروف ادبی شخصیات نے شرکت کی اور کرشن چندر کے فن و شخصیت پر اظہارِ خیال کیا۔ تقریب میں شرکت کرنے والوں میں پروفیسر صادق، پروفیسر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ، ڈاکٹر خالد اشرف، ڈاکٹر خالد علوی، جناب شہباز حسین، جناب خورشید اکرم، جناب فاروق ارگلی، جناب نارنگ ساقی، جناب دیپک بدکی حسن ضیا، حمران اعظمی وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ تقریب کے اختتام پر سبھی شرکاء کو مذکورہ خصوصی شمارہ کی ایک ایک جلد بطور تحفہ پیش کی گئی۔

''حرفِ کُن''

حمد

(سورۃ الشعراء کی آیات ۸۰تا۸۵ کی روشنی میں)

وہی تو ہے جو مجھے روشنی میں لاتا ہے
وہی تو ہے جو مجھے راستہ دکھاتا ہے

وہی تو ہے جو مجھے نعمتیں کھلاتا ہے
وہی تو ہے جو مِری تشنگی بجھاتا ہے

وہی تو ہے کبھی دکھ دے کر آزماتا ہے
وہی تو ہے جو شفا دے کر دل بڑھاتا ہے

وہی تو مار کے بے دست و پا بناتا ہے
وہی تو ہے جو بہ یک حرفِ کُن جلاتا ہے

اُسی سے آس بندھی ہے مِری بہ روزِ جزا
خطائیں میٹ کے جو سرخ رُو بناتا ہے

دعا یہ ہے کہ عطا مجھ کو علم و حکمت ہو
ترا کرم ہے جو ابرار میں بٹھاتا ہے

ہو ذکر خیر نئی نسل کی زبانوں پر
مجھے جو وارثِ فردوس تُو بناتا ہے

رؤف خیر (حیدرآباد، دکن)

نعت بحضور سرورِ کائنات ﷺ

یہی آرزو ہے اے دل کہ مدینے ہم بھی جائیں
درِ پاک مصطفیٰ سے کبھی لوٹ کر نہ آئیں

مرے قلبِ مضطرب کو ملے کاش کامیابی
کبھی زخم دل دکھائیں، کبھی حال دل بتائیں

مری چشم بے بصر بھی ہو بصارتوں کی محرم
کبھی خواب ہی میں آ کر ذرا جلوہ تو دکھائیں

مری ذات کا سمندر بڑے جوش پر ہے آقا
مری کشتی ہے شکستہ اسے آپ ہی بچائیں

بھلا کب قبول ہوگی مجھے خسروی جہاں کی
مرا فخر تو یہی ہے کہ گدائے در بنائیں

لیے دید کی تمنا وہ تڑپ رہا ہے کب سے
کبھی کاش اعظمی کو درِ پاک پر بلائیں

مشتاق اعظمی (اسنسول، بھارت)

''اُفق کے اُس پار''

عذرا اصغر (کراچی)

''کہاں رہیں اتنے دن؟'' اسے دیکھتے ہی میں نے سوال داغا۔

''پتہ نہیں کہاں کہاں پھرتی رہی ہوں'' اس نے جواب دیا۔

''صحرانورد بن گئی ہو؟'' میں نے طنز کا تیر چلایا۔

''ایسا ہی سمجھ لو'' وہ مسکرا دی۔

''پھر بھی کچھ تو کہو۔۔۔ کچھ تو بتاؤ!'' میں نے اشتیاق بھرا اصرار کیا

''بھئی بس، جستجو، کھوج، تجسّس۔ ایسے ہی الجھی رہی ہوں۔''

''اچھا۔۔۔! تو فلسفے کی گتھیاں سلجھاتی رہیں؟''

''ارے ہم کہاں کے فلسفی'' اس کے لہجے میں ازلی بے نیازی تھی۔

''کیوں۔۔۔ فلسفیوں کے سر پر سینگ ہوتے ہیں کیا؟ تمہاری ہی طرح ہوتے ہیں بے چارے، بیوقوف سے، پاگل سے، بہکے بہکے۔۔۔''

وہ ہنس پڑی۔۔۔ ''واللہ! تم بھی ذرا نہیں بدلیں''

وہ جب بھی مجھے ملتی ہے ایسی ہی اوٹ پٹانگ باتیں ہم کرتے ہیں۔ وہ کبھی میری بات کا بُرا نہیں مانتی۔ وہ میری بہت اچھی دوست، بہت مخلص اور محبت کرنے والی سہیلی ہے۔ اس نے اور میں نے کچی پکی جماعت میں ایک ساتھ داخلہ لیا تھا۔ ہمارا بہناپا بچپن کے ابتدائی دنوں سے ہے۔ وہ چھٹپن سے ہی ایسی تھی۔ کھوئی کھوئی سی۔۔۔ کیوں۔۔۔ کیا۔۔۔ کیسے۔۔۔ تجسّس آمیز لفظ اس کے لبوں سے نکلتے رہتے۔ غور وفکر اس کا متمع نظر تھا جبکہ وہ یہ سب سمجھ بھی نہ پاتی ہوگی۔ مگر جان لینے کا شوق اسے متجسس کیے رکھتا اور میں اس جھنجھٹ سے یکسر آزاد تھی۔ بے فکر اور لاابالی، مگر اس تضاد کے باوجود ہماری دوستی مثالی تھی۔ اس میں کبھی رخنہ نہیں پڑا تھا۔ وہ میری رازداں تھی۔ میری زندگی کے تمام نشیب وفراز سے آگاہ۔۔۔ اس کی زندگی میں تو کوئی راز تھا ہی نہیں۔ یونیورسٹی میں تھے تو اکثر لڑکے آگے پیچھے ہوتے تھے میں نے اسے بتایا تو وہ بولی:

''تو یوں کہو تم عشق کرنے لگی ہو؟''

''ہاں! شاید ایسا ہی ہے'' میں نے اعتراف کیا تو وہ قہقہے لگانے لگی۔

''اچھا۔۔۔ تو تمہیں عشق ہوگیا ہے'' ہنسی کا دورہ تھما تو بولی۔ ''اچھا تو پھر۔۔۔ اب کیا ہوگا؟''

''پھر کیا۔۔۔ پھر عشق کے امتحاں ہوں گے''

''حیرت ہے۔ تمہاری جیسی غیر سنجیدہ لڑکی عشق کیسے کرسکتی ہے'' حیرت زدہ لہجے میں وہ بولی۔

''اب تو ہوگیا۔۔۔'' میں نے بے نیازی سے کہا۔

''کیا یہ عشق دوطرفہ ہے۔ یعنی آگ دونوں طرف لگی ہے؟ کسی وکیل کی طرح اس نے جرح کی۔

''یقین سے کچھ کہا نہیں جاسکتا!''

''کون ہے وہ؟'' اس کی جرح جاری تھی۔

''بھئی جب مل جائے گا تو تمہیں بھی بتلا دوں گی''

''اس کا مطلب ہے۔۔۔!'' ہاں جی اس کا بالکل یہ ہی مطلب ہے کہ جس سے مجھے عشق ہوگیا ہے وہ ابھی ملا نہیں، اُس کی بات کو درمیان سے کاٹتے ہوئے میں نے جملہ مکمل کیا۔

''عشق۔۔۔ وہ بھی ان دیکھا'' شانے اُچکاتے ہوئے ''کمال ہے بھئی''

''خیر چلو! ان دیکھا ہی سہی، اللہ تمہیں عشق مبارک کرے'' اس نے جیسے بادل نخواستہ کہا۔

اس کے بعد جب وہ ملی درمیان میں خاصہ وقت گزر گیا تھا۔

''کہو خوش اور مطمئن ہو؟''

''ہاں بالکل۔ ہمارے درمیان چاہت کا تعلق اسی طرح برقرار ہے۔ تم سناؤ! تم اپنے اُنہی نظریات پر ابھی تک قائم ہو؟''

''بالکل۔۔۔ اسی کی کھوج میں ہوں جو ابھی تک ملا نہیں!''

''کبھی کسی کو ملا؟'' میں نے ہلکا سا طنز کیا۔

''کیوں نہیں۔۔۔ جو ڈھونڈتے ہیں وہ پا لیتے ہیں'' اس کے لہجے میں یقین تھا۔

''میں نے سوچا زندگی کی پیچیدگیاں تو ہمیشہ انسان کا گھیراؤ کیے رکھتی ہیں مگر مشکلیں کب نہیں ہوتیں؟ اور اگر زندگی بالکل سیدھی، سپاٹ کورے لٹھے کی مانند گزر جائے تو اُسے زندگی تو نہیں کہا جاسکتا!

''سناؤ! کہاں پہنچی تمہاری تپسیّہ۔۔۔!''

''اس کی اتھاہ تک پہنچنا آسان نہیں ہے۔ کائنات لامحدود ہے۔ تہہ در تہہ۔ ہم تو ایک چپّہ بھر زمین پر بسے ہوئے ہیں۔ مٹھی میں سما جاتا ہے ہمارا یہ ملک اور ہم اسے بھی ملیامیٹ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ہم آج تک ایک ڈیم نہیں بنا سکے۔ اس لیے کہ ہمارے بڑوں کے پیٹ ڈیم سے زیادہ بڑے ہیں۔ برسات آتی ہے تو یلغاروں پانی ضائع ہوجاتا ہے۔ آبادیاں بہہ جاتی ہیں اور کھیتیاں پیاسی رہ جاتی ہیں۔ بے گھر لوگوں کی فریاد اور مرنے والوں کے نالے بہرے کانوں تک نہیں پہنچ پاتے۔ تھر میں بچے بھوک سے بلک بلک کر دم توڑ دیتے ہیں اور حکمران ایک وقت میں اسّی طرح کی ڈشز ہڑپ کر جاتے ہیں۔ ارے اس سرزمین سے

باہر نکل کر دیکھو انہوں نے کائنات کو زمین کے اندر تہہ در تہہ ڈھونڈ نکالا ہے۔ صرف چاند تاروں تک ہی رسائی حاصل نہیں کی زمین کی پرتیں ادھیڑ ڈالی ہیں۔ شہر کے شہر بسا لیے اور ایک ہم ہیں کہ آگے بڑھے نہ منزلِ عشقِ بتاں رہے“

”یہ تم مجھ پر طنز کر رہی ہو؟“ میں تلملائی۔

”نہیں ڈیئر تم پر طنز نہیں کر رہی۔ اپنے جگر میں اٹھتے درد کا تجزیہ کر رہی ہوں۔ ہم دین کے پیشوا ہونے کے دعویدار ہیں اور جو ہماری نگاہ میں لادین ہیں انہوں نے کھوج نکالا ہے کائنات کو۔ ہم تو اس چپّہ برابر زمین کی حفاظت نہیں کر پا رہے ہیں۔ لہولہان کر دیا ہے اسے۔“

وہ اپنی رو میں بولتی چلی گئی۔

”مگر ہمیں۔۔۔ مجھے یا تمہیں یہ سب سوچنے اور کڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔“ میں نے کہا تو وہ تلملا اٹھی۔

”ضرورت کیوں نہیں؟ جو چیز میری ہے اس کے بارے میں سوچنا میرا حق ہے۔ یہ ملک میرا بھی ہے۔ میں اس کی شہری ہوں۔ میں اسے خوبصورت دیکھنا چاہتی ہوں اور ترقی کی بلندیوں پر۔“

”مگر جس چیز پر اختیار نہ ہو اسے سوچنے کا فائدہ“ میں نے دلیلاً کہا

”یہی تو افسوس ہے کہ ہم بے اختیار ہیں۔ ہمیں بے بس بنا دیا گیا ہے۔ ہماری آواز ہم سے چھین لی گئی ہے۔ مگر ہم سوچ تو سکتے ہیں، جدّ و جہد تو کر سکتے ہیں، چراغ سے چراغ جلانے کی کوشش تو کر سکتے ہیں“

”دیکھو! میری بات سنو۔۔۔!!“ میں نے اپنے تئیں متانت سے کہا۔

”جو لوگ سوچتے ہیں، کڑھتے ہیں وہ اپنا نقصان کرتے ہیں۔ آج کی دنیا کا چلن سیکھو۔ کھاؤ، پیو، لوٹ مار مچاؤ، جھوٹ بولو، اپنے ظاہر اور باطن میں تضاد پیدا کرو۔ بس زندگی انتہائی پُربہار، خوشگوار گزرے گی۔“

”نہیں۔۔۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا مائی ڈیئر فرینڈ“ اس نے دو ٹوک فیصلہ سنایا۔ سنو!

”پچھلے دنوں مجھے ایک یورپی ملک میں جانے کا اتفاق ہوا۔ جہاں حیرت انگیز عجائبات سے میرا سابقہ پڑا۔ جنگِ عظیم دوم میں یہ ملک تباہ ہو چکا تھا اور اب اس ملک کے شہر تہہ در تہہ آباد ہیں۔ تمام نظام گھڑی کی سوئیوں پر چلتا ہے۔ گویا گھڑی کی سوئیوں سے اس ملک کے باشندوں کی زندگی وابستہ ہے۔ وہ لوگ وقت کی اہمیت کو جانتے ہیں۔ وقت کی قدر کرتے ہیں، اسے پکڑ لیتے ہیں، ضائع نہیں ہوتے دیتے۔ وقت جو ٹھہرنا نہیں جانتا، چلتا چلا جاتا ہے بہتے پانی کے مانند۔ وقت واپسی کے رستے سے ناآشنا ہے اور ہم وقت کھو دینے کے عادی ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ بس لمحۂ موجود ہی تو ہمارا ہے۔ اور لمحہ۔۔۔ ہوتا ہی کتنا ہے۔ جسے ہم بے نیازی سے گنوا دیتے ہیں۔ ہم پانی کی طلب کے لیے زمین شگافتہ کرتے ہیں، ساٹھ فٹ، سو فٹ۔۔۔ پھر پانی نکل آتا ہے۔ انہوں نے زمین کے نیچے ایک اور شہر آباد کیا، سڑکیں بنائیں، پُل تعمیر کیے، ریلوے لائن بچھائی، بازار بنائے، ایک دنیا بسا ڈالی۔ اس کے نیچے پھر ایک اور شہر ویسا ہی یکساں نظام۔ تینوں جگہ گھڑی کی سوئیوں سے جڑا ہوا سلسلہ۔۔۔ تین تین منزل شہر اور ایک نظام۔۔۔ گھڑی کی سوئیوں کے پابند شہری۔ فرض شناس، محبِ وطن، بات کے پکے، قول کے سچے، تضادات سے دور۔ میں آج بھی سوچتی ہوں انہوں نے اتنے وسیع پیمانے پر یہ سب کیسے کیا۔ زمین کے نیچے پانی پر کیسے فتح پائی۔ کیسے یہ قدرت حاصل ہوئی۔ انہوں نے کیونکر وقت کی پابندی سیکھی۔ قومیت کا جذبہ کس طرح اپنے اندر پیدا کیا۔ تب بھی میں سوچتی رہی، یہ صفات تو ہمارا دینی منشور ہیں مگر انہوں نے اپنا لئے، کاربند ہو گئے اور ہم نے سب ہنسی ٹھٹھے میں اڑا دیا، بے راہ ہو گئے۔ پتہ نہیں دین کی کس رسّی کو پکڑ لیا۔ نظامِ کائنات پر غور کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ ورنہ اطاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے۔۔۔ سورج، چاند، ستارے کیسے وقت کے پابند ہیں ذرا فرق نہیں۔ سورج وقتِ معینہ پر مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور دن بھر خلق کو منوّر کر کے مغرب میں جا کر روپوش ہو جاتا ہے۔ چاند رات کی تاریکی کو روشنی اور حسن عطا کرتا ہے۔ ستارے فلک پر چمکتے ہیں میں سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر گھنٹوں سوچتی ہوں۔

”یہ بیکراں ٹھاٹھیں مارتا پانی اپنی حدود سے آگے کیوں نہیں بڑھتا۔۔۔ کیوں؟ آخر کیوں۔۔۔؟؟ یہی پانی تو تھا جس نے نوح کی قوم کو نافرمانیٔ قدرت پر ڈبو مارا تھا اور نوح کی کشتی کو پہاڑ کی چوٹی پر لا ٹھہرایا تھا۔ جانتی ہو کائنات بنانے والے کا حکم ماننے والے ہی فلاح پاتے ہیں۔ ظاہری حلیہ بدل لینے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ دل کی دنیا بدلنا ضروری ہے۔ روح کی کثافتیں دھونا لازمی ہیں۔ صرف اپنے ہی مفادات پر نظر مت رکھو خلقِ خدا کی بہتری کو، ان کے نفع نقصان کو بھی مدِ نظر رکھو۔ خود کو گھڑی کی سوئیوں کا پابند بنا لو۔۔۔ میں اگرچہ تہہ در تہہ شہر آباد کرنے سے قاصر ہوں۔ میری یہ بساط نہیں۔ مگر میں خود کو گھڑی کی سوئیوں کا پابند تو کر سکتی ہوں۔ اپنے من کے تضاد کو تو مٹا سکتی ہوں نا۔ خلقِ خدا سے محبت تو کر سکتی ہوں نا۔۔۔“

وہ اپنی رو میں بولتی چلی جاتی ہے اور میں۔۔۔ میں اس کی باتیں غور سے سنتی ہوں۔ جب وہ ملتی ہے ایسی ہی بہکی بہکی باتیں کرتی ہے۔ وہ دنیا داری اور دنیاوی فضول آسائشوں سے بے نیاز ہے۔ اکثر لوگ اس کی بیحد عزت کرتے ہیں اور کچھ اسے پیٹھ پیچھے پاگل قرار دیتے ہیں۔ ٹھٹھے اڑاتے، کچھ اسے مجذوب کہتے لیکن نہ وہ مجذوب ہے نہ پاگل۔ وہ اپنی روزی اپنے ہاتھ سے کماتی ہے۔ اس کی اعلیٰ تعلیم نے اسے بلند مرتبہ عہدے پر فائز کیا ہے۔ وقت کی پابندی اس کا موٹو ہے۔ شاید وہ ابراہیم ادھم کے نظریے کی پیروکار ہے۔ دولت جمع کرنا، بچا کے رکھنا اس کے نزدیک کفر ہے۔ شروع شروع میں جب وہ دفتر میں داخل ہوتی تھی تو دفتر کے کمرے کا بند دروازہ اس کا خیر مقدم کرتا تھا۔ جب تک چپراسی آتا وہ باہر کھڑی کمرہ کھلنے کا انتظار کرتی رہتی۔ وہ کسی سے باز پرس

بھی نہ کرتی لیکن اس کی پابندیٔ وقت کے لحاظ میں سارا عملہ وقت کا پابند ہو گیا۔ میں خود جو اسے احمقوں میں شمار کرتی تھی اب اسی کے نقشِ پا پر چلنے لگی ہوں۔ اسی کی طرح سوچتی ہوں اگر میں شہر تہہ بہ تہہ آباد کرنے کی استطاعت نہیں رکھتی تو اپنے محل کی چپّہ بھر زمین کسی بے گھر کے لیے مختص تو کر سکتی ہوں نا۔۔۔ نباتات، جمعدات اثرات قبول کرتے ہیں تو ہم انسان کیوں نہیں۔ جو شعور رکھتے ہیں اور اشرف الخلوقات ہیں۔ بہتر ترین مخلوق۔۔۔

میں نے اسے دیکھ کر۔۔۔ سمجھ کر خود کو بدلا ہے۔ کوئی ایک اور مجھے دیکھ کر بدلے گا۔ میرے بچے۔۔۔ میری نسل۔۔۔ اور پھر اور۔۔۔ آگے۔ یوں تبدیلی دھیرے دھیرے ہی سہی۔۔۔ آئے گی۔۔۔ زنجیر بنتی چلی جائے گی۔ میں جو کبھی اس پر ہنسا کرتی تھی اب اسی انداز سے سوچتی ہوں، سوچ بچار زندگی کا تسلسل ہے۔ زندگی ہے۔۔۔ کائنات پر غور و فکر عبادت ہے۔۔۔ مجھے نہیں معلوم میری وہ دمساز و ہمدم اب کہاں ہے۔ جانے کس ملک کے کسی شہر میں اپنے نظریات کی کھوج کر رہی ہوں گی۔ اس کی یادیں اور اس کا فلسفۂ حیات میرے پاس ہے۔ میرا رہنما ہے۔ میرے لیے یہ بہت بڑا، بہت عظیم سرمایہ ہے۔ اردگرد بسنے والے لوگوں کی مطلق پروا نہیں ہے۔ مادی وسائل میں حقداروں میں تقسیم کر دیتی ہوں۔ بانٹ دینے کا ہنر مجھے سکھ دیتا ہے۔ شانت کرتا ہے۔۔۔ ابھرتا ڈوبتا سورج۔۔۔ گھٹتا بڑھتا چاند۔۔۔ نیل گگن پر چمکتے ستارے سب مخلوق کو اپنے حصے سے فیضیاب کرتے ہیں۔ یہ کراں بے کراں وسعت۔۔۔ تہہ در تہہ زمین اور منزل بہ منزل آسمان۔۔۔ سب فیض رساں ہیں۔

ائیر پورٹ کے وسیع لاؤنج میں بیٹھی میں سوچ رہی تھی۔۔۔ دیکھ رہی تھی۔۔۔ بھانت بھانت کی مخلوق۔۔۔ خود نمائی کے دلدادہ لوگ اور لحہ لحہ گذرتا وقت۔۔۔ چند لمحے پہلے میں وہاں تھی۔ اس گذر میں جس کا مختصر لان پھولوں سے آراستہ ہے۔ جہاں میرے دل کے ٹکڑوں کی کلکاریاں ہیں، محبت کی مہکاریں ہیں اور اب میں فضا میں ہوں۔ وسیع قطع زمین اور لامحدود آسماں میری وسعتِ نگاہ میں ہے۔ پھر جہاز اتنا بلند ہوا کہ زمین جس سے میرا رابطہ کٹ چکا تھا اب نظر سے بھی اوجھل ہو گئی۔ میں دو آسمانوں کے درمیان محوِ پرواز ہوں۔ نیچے سفید بادلوں کے ٹکڑے ایک دوسرے کے تعاقب میں دوڑ رہے ہیں۔ جیسے آنکھ مچولی کھیل رہے ہوں۔ میں اس تماشے سے محظوظ ہو رہی ہوں۔ حیرتوں نے مجھے اپنے گرفت میں کیا ہوا ہے۔ جہاز کی یہ چھوٹی سی کھڑکی میری آنکھوں کے تل برابر عدسے پر خاصی وسیع کائنات کے مناظر کو میرے سامنے پھیلا رہی ہے۔ میں اوپر کی جانب دیکھتی ہوں نیلا بے داغ آسمان ہے۔ جس کے مغربی کنارے پر سورج تیزی سے رواں دواں ہے۔ یہ اس کے روپوش ہونے کی تیاری ہے۔ آفتاب کا وہ نور بھرا چہرہ جس سے گھڑی بھر پہلے آنکھ ملانا ممکن نہیں تھا اب سرخ نارنجی رنگ کے گولے میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اب میں اسے دیکھ سکتی ہوں اور اس کے حسن کے لطیف احساس کو سمیٹے سرشار ہو رہی ہوں۔ وہ غیر محسوس طریقے لیکن تیزی سے آگے بڑھتا جا رہا ہے کوئی رکاوٹ نظر نہیں آتی۔ وہ کسی شے کے پیچھے چھپ رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے میرا جہاز فضا میں معلق ہو گیا ہے۔ سورج کی شفق رنگ کرنوں نے سفید بادلوں کے کناروں پر سنہری گوٹا ٹانک دیا ہے۔ شفق کی سرخی سے مغرب میں ابھی اجالا ہے۔ جبکہ مشرقی سمت میں رات اتر چکی ہے۔ آسمان نے ستاروں بھری سیاہ چُنری اوڑھ لی ہے۔ وہ کون ہے جو لحہ لحہ منظر بدل رہا ہے؟ یہ مظاہرِ قدرت ہیں جو میرے احساس کو زیروزبر کر رہے ہیں۔ ہلچل مچا رہے ہیں۔ میں سوچتی ہوں کیا میں کسی دانش گاہ میں بیٹھی ہوں؟ سمجھنے والوں کے لیے یہ کائنات ایک درس گاہ ہی تو ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس بدلتے منظر کو کسی کے ساتھ شیئر کرنے کو جی بے اختیار مچلا۔ میں نے اپنی اجنبی ہمسفر کا شانہ ہلایا تھا۔

"دیکھیں کتنا حسین نظارہ ہے غروبِ آفتاب کا"

اُس نے کھڑکی سے ذرا سا بادلوں کے شنگرفی کناروں کو دیکھا اور ایک ہُنکارہ بھر کے اپنے ہاتھوں میں پہنی سونے کی چوڑیوں سے کھیلنے لگی اور میں پھر بدلتے منظر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ زمین پر جلتے بجھتے بجلی کے قمقمے شہر کی آمد کا پتہ دے رہے تھے۔ جہاز دھرتی سے بغلگیر ہونے جا رہا تھا۔ میرے دل کے کچھ ٹکڑے یہاں بھی میرے منتظر ہوں گے۔ میں تنہا۔۔۔ ایک اکیلا وجود۔۔۔ محبت کے ہزار رنگ، کروڑوں روپ لیے اس وسیع و عریض کائنات میں موجود ہوں۔۔۔ اور تہہ در تہہ آسماں مجھے حیرت میں غرق کر رہا ہے۔ افق کے اُس پار آسمان زمین میں مدغم ہو رہا ہے اور میرے کان میں جیسے کوئی کہہ رہا ہے۔

"پس ہماری کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے"

وہ کون ہے۔۔۔؟ کون ہے وہ انجانا محبوب۔۔۔ جس کی مجھے روزِ اوّل سے تلاش تھی اور لحہ آخر تک رہے گی۔۔۔!

خزاں کے ڈیرے

حافظ محمد احمد

(راولپنڈی)

مسلماں کو مسلماں کر خدایا
مسائل کو تُو آساں کر خدایا
خزاں نے ڈیرے ڈالے ہیں وطن میں
اِسے تُو پھر سے گلستاں کر خدایا

☆

تصوف کیا ہے گورکھ دھندہ ہے اہلِ طریقت کا
بہت آسان رستہ ہے محمدؐ کی شریعت کا

روح کا کینسر

ڈاکٹر احسان احمد شیخ
(راولپنڈی)

ڈاکٹر صفدر شاہ نے فائل سے نگاہ اوپر اٹھائی۔ عینک اتار کر میز پر رکھی اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے جوڑے کے چہروں پر نظر جمادی۔

''مسٹر اور مسز سلیم! میرے پاس آپ کے لیے اچھی خبر نہیں ہے''

نرگس نے ہاتھ بڑھا کر سلیم کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔

''جب میں نے پہلی بار مسز سلیم کا معائنہ کیا تھا تو آپ لوگوں کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ آپ نے آنے میں دیر کر دی ہے۔''

سلیم نے محسوس کیا کہ نرگس کا ہاتھ ٹھنڈا پڑ گیا ہے اُس نے ہمت بڑھانے کے لیے اپنی بیوی کا ہاتھ دبایا۔

''ڈاکٹر صاحب! میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا یہ کسی مرد ڈاکٹر سے معائنہ کرانے کے لیے تیار ہی نہیں تھیں اور آپ کی فیلڈ میں کوئی لیڈی ڈاکٹر نہیں ہے بس اسی بحث و مباحثہ میں کم از کم تین ماہ ضائع ہو گئے''

''بہر حال جو ہوا سو ہوا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ آپ کی بیگم کے دائیں پستان میں دو بڑی اور ایک چھوٹی گٹھلی ہے جو معائنے میں بھی محسوس ہو گئی تھیں اور میموگرام میں بھی نظر آ گئی تھیں۔ نیڈل بائیوپسی کی رپورٹ میں اُن تینوں میں کینسر ہے۔ دائیں بغل میں جو بڑھے ہوئے غدود ہیں امکان یہی ہے کہ کینسر وہاں تک پہنچ گیا ہے۔'' ڈاکٹر صفدر نے کچھ توقف کیا تا کہ میاں بیوی اس خبر کو ذہنی طور پر قبول کر سکیں۔ سلیم بُت کی طرح خاموش ٹکٹکی لگا کر ڈاکٹر صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ نرگس اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلایا اور اسے دو گلاس پانی لانے کو کہا جو وہ آناً فاناً لے آیا۔

''ڈاکٹر صاحب! اب کیا کرنا ہے''

سلیم نے پانی کا گھونٹ گلے سے اتار کر زبان کھولی۔

''دیکھئے کینسر کے کیس کا کوئی ایک ڈاکٹر علاج نہیں کرتا۔ ڈاکٹروں کی ایک ٹیم ہے جس میں میں یعنی چسٹ سرجن، کینسر اسپیشلسٹ اور ریڈیو تھراپسٹ شامل ہوتے ہیں اکثر اوقات ہم سی ٹی اسکین اور ایم آر آئی کرنے والے ڈاکٹرز کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ ہسپتال میں اتنا رش ہے کہ ہم یہ کانفرنس ہفتے میں ایک مرتبہ ہی کر پاتے ہیں۔ اتفاق سے یہ میٹنگ کل سہ پہر ہی ہے۔ میں مسز سلیم کا کیس اس میں شامل کرا دیتا ہوں مگر اس سے پہلے آپ کینسر اسپیشلسٹ ڈاکٹر علوی سے آج ہی مل لیجیے۔ میں اُنہیں ابھی فون کر دیتا ہوں۔''

ڈاکٹر علوی سے ملاقات اور معائنے کے بعد بات مزید بڑھ گئی انہوں نے ڈیپارٹمنٹ میں فون کر کے نرگس کے لیے ایم آر آئی کا وقت لے لیا جو شام چھ بجے تھا۔ جب نرگس اور سلیم کی گاڑی گھر کے پورچ میں رکی اور ڈرائیور نے کار کا دروازہ کھولا تو رات کے آٹھ بجے تھے۔

''میں بہت تھک گئی ہوں''

نرگس گھر میں آتے ہی بستر پر لیٹ گئی۔

سلیم اس کے پاس بیٹھ گیا اور اپنی بیوی کے بالوں میں پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا۔

''سلیم! جب آپ نے اپنے دوست ڈاکٹر عمران سے ڈاکٹر صفدر شاہ سے جلدی وقت لینے کی بات کی تھی تو اُس نے کیا بتایا تھا؟''

''ڈاکٹر عمران نے صرف ڈاکٹر صفدر شاہ سے ہی بات نہیں کی تھی بلکہ اس نے تمام متعلقہ ڈاکٹروں سے اور اُن کے ڈیپارٹمنٹ میں سب سے وقت لے رکھا تھا۔ جب ہی تو آج اتنے کام ہو گئے عمران بتا رہا تھا کہ یہ سب کام کرانے کے لیے کئی کئی دن لگ جاتے ہیں۔''

''اچھا یہ سب چھوڑیئے نا۔ مجھے بتایئے کہ ڈاکٹر میرے ساتھ کیا کریں گے؟''

سلیم نے اپنے ہاتھ نرگس کے بالوں سے ہٹائے اور اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ نرگس کی نظریں اپنے شوہر کے چہرے پر اس طرح ٹکیں تھیں جیسے کوئی قتل کا ملزم امید و بیم کی حالت میں جج کے چہرے پر نظریں جمائے فیصلے کا منتظر ہو۔

''نرگس! ڈاکٹر عمران نے کہا تھا ہم دونوں کو ہمّت سے کام لینا ہوگا''

''اور؟''

''اور یہ کہ تمہارا علاج مکمل ہونے کے بعد بھی ہماری زندگی پہلے کی طرح نہیں رہے گی''

''کیوں؟ کیسے؟ بتائیں نا!''

سلیم نے تھوک نگل کر اپنا گلا صاف کیا۔

''دیکھو۔ سب سے ضروری بات یہ ہے کہ تم زندہ رہو اور مکمل طور سے صحت یاب ہو جاؤ۔ مجھے اور ہمارے دونوں بچوں کو تمہاری ضرورت ہے اسی طرح جیسے ہماری شادی کے بعد سے اب تک رہی ہے۔''

نرگس خاموشی سے سلیم کا چہرہ دیکھتی رہی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اُس کا شوہر اتنی لمبی تمہید کیوں باندھ رہا ہے۔

''ڈاکٹر عمران نے مجھے بتایا ہے کہ سرجری کے ذریعہ وہ تمہارا دایاں بریسٹ پورے کا پورا کاٹ کر نکال دیں گے۔ اس کے علاوہ دائیں بغل کے

سارے غدود بھی نکالنے ہوں گے۔ یہ ایک لمبا کٹ ہوگا جو سینے کی ہڈی سے لے کر پورے دائیں بغل تک جائے گا۔''

نرگس نے خاموشی سے اپنا ہاتھ سلیم کے ہاتھوں سے چھڑا لیا۔ وہ چھت کی طرف نظریں جمائے خاموش لیٹی تھی۔ سلیم آہستہ سے اُٹھا اس وقت نرگس کو اکیلا چھوڑنا چاہتا تھا تا کہ وہ مزید سوالات نہ کرے۔ اُس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو نرگس کی آواز آئی۔

''تو کیا میں بقیہ زندگی اسی طرح گزاروں گی؟ ایک بریسٹ کے ساتھ؟ میں لوگوں کے سامنے کیسے جاؤں گی؟ اپنی سہیلیوں کے سامنے، تمہارے دوستوں کے سامنے، اُن کی بیویوں کے سامنے، تمہارے اور میرے رشتہ داروں کے سامنے، اپنے بچوں کے سامنے، بچوں کے دوستوں کے سامنے، نوکروں کے سامنے؟''

نرگس بولتی جا رہی تھی اُس کی آواز آہستہ آہستہ آنسوؤں اور سسکیوں میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ سلیم کو ہمّت نہیں ہوئی ایک گولا سا اُس کے گلے میں اٹک گیا۔

''یہ سب باتیں ہم ڈاکٹر صفدر شاہ سے اگلی ملاقات میں کر لیں گے''

سلیم نے بغیر مڑے ہوئے نرگس کو جواب دیا اور آہستہ سے دروازہ بند کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ نرگس کی ہچکیاں چیخوں میں بدل گئیں آنسو بہتے رہے اور اُس نے انہیں پونچھنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ آنسو بہتے بہتے خود ہی خشک ہو گئے۔ نرگس نے شعوری طور پر اپنے ذہن کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ نرگس اور سلیم کی محبت کی شادی کی تھی دونوں ہی امیر گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اٹھارہ سال یوں گزر گئے جیسے کل کی بات ہو۔ برجیس اور کلیم دونوں ہی بچے بہت سلجھے ہوئے اور پڑھائی کے شوقین تھے۔ خدا کا شکر کہ ہر سال کی طرح گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے چچا کے پاس لندن گئے ہوئے تھے۔ اُن کی واپسی تک شاید وہ اس سرجری وغیرہ سے فارغ ہو چکی ہوگی۔ سرجری کا سوچتے ہی نرگس کو پھر وہی خوف لاحق ہو گیا۔ ایک بریسٹ؟ یہ کیسی زندگی ہوگی؟ دراصل دونوں میاں بیوی اپنے بدن کو خوبصورت رکھنے کے دیوانگی کی حد تک شوقین تھے۔ جم، جوگنگ، ٹینس یہ سب اُن کی زندگی کا لازمی حصہ تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ اُن کی اٹھارہ سالہ خوشگوار ازدواجی زندگی کا سبب ذہنی ہم آہنگی سے زیادہ جسمانی ہم آہنگی پر تھا۔ یہاں تک کہ سلیم کو جب بھی بزنس کے لیے چند دنوں کے لیے بھی باہر جانا ہوتو نرگس ضد کر کے اُس کے ساتھ چلی جاتی تھی بلکہ اکثر اُسے ضد کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ اب کیا ہوگا؟ وہ سلیم کے سامنے کیسے جائے گی؟ اُس کے اس ادھڑے ہوئے جسم کو سلیم کیسے قبول کرے گا؟ ہوسکتا ہے وہ اپنے آپ کو بدل لے مگر خود وہ اپنے آپ کو کیسے بدل پائے گا اُسے خود بھی اپنی جنسی جبلتوں کا احساس تھا۔ نرگس گھبرا کر ایک جھٹکے سے بستر سے اُٹھی اور دروازہ کھول کر لابی میں آئی۔ گھر میں بالکل سناٹا تھا بلکہ کسی نے لائٹس بھی نہیں جلائی تھیں وہ آہستہ آہستہ باہر پورچ میں آئی صرف اس کی اپنی کار کھڑی تھی سلیم کی کار غائب تھی۔ یقیناً اپنی عادت کے مطابق لمبی ڈرائیو پر نکل گیا ہوگا اپنے ذہن کا بوجھ ہلکا کرنے۔ ''کیا سلیم بھی وہی کچھ سوچ رہا ہوگا جو میں سوچ رہی ہوں'' نرگس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ ''شاید ہاں۔ نہیں۔ بلکہ یقیناً ہاں۔ اُس کی اور سلیم کی سوچ، اُن کی چاہتیں اور اُن کی ضرورتیں ایک جیسی ہی تو ہیں''

جلد ہی صورت حال ڈاکٹروں نے واضح کر دی۔ نرگس کو فوراً ہی ہسپتال میں داخل ہونا ہوگا۔ سرجری اُس طرح ہوگی جیسے ڈاکٹر عمران نے بتائی تھی۔ سرجری سے جیسے ہی صحت یابی کا عمل مکمل ہوگا کیموتھراپی کی سترہ خوراکیں دی جائیں گی ہر ہفتے ایک ڈرپ کے ذریعے۔ اس کے بعد ریڈیوتھراپی کی سترہ خوراکیں روزانہ ایک خوراک۔ اس کے تین مہینے بعد مکمل چیک ہوگا۔

''ڈاکٹر صاحب۔ کینسر کس اسٹیج میں ہے۔''

سلیم نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

''اسٹیج کا صحیح پتہ جب چلے گا جب ہم سرجری کے ذریعے مکمل بریسٹ اور بغل کے غدود نکال کر لیبارٹری میں بھیجیں گے۔ رزلٹ آنے میں کم از کم تین سے چار ہفتے لگتے ہیں۔ ویسے میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ مسز سلیم ہمارے پاس دیر سے آئی ہیں۔''

اب ڈاکٹر صفدر شاہ نرگس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''مسز سلیم۔ آپ کچھ پوچھنا چاہیں گی؟''

''ڈاکٹر صاحب۔ میں ایک بریسٹ کے ساتھ کیسے۔۔۔''

نرگس آگے نہ بول سکی اور اپنی آنکھیں جھکا لیں۔

''دیکھئے اس کی دو صورتیں ہیں اگر سرجیکل فیلڈ بہت پھیلا نہیں تو ہم نقلی بریسٹ امپلانٹ کر دیں گے اگر یہ ممکن نہ ہوا تو صحت یابی کے بعد آپ ایک امپلانٹ جسم کے باہر بریزئیر کے اندر پہن سکتی ہیں یہ دونوں چیزیں ہم باہر سے امپورٹ کرتے ہیں اور ہسپتال میں قیمتاً مل جائیں گی''

''اس عمل میں کتنا عرصہ درکار ہوگا؟''

''سلیم صاحب۔ یہ مرض کے اسٹیج اور مریض کی قوتِ ارادی پر انحصار کرتا ہے۔ اوسطاً آٹھ سے دس مہینے۔ اور ہاں اس عرصے میں یہ وقتاً فوقتاً گھر جا سکیں گی۔ ہسپتال سے فارغ ہونے کے بعد انہیں گولی کھانا ہوگی دو سال سے پانچ سال کی مدت تک۔''

''ڈاکٹر صاحب! ایک آخری بات۔ ڈاکٹر عمران نے مجھے بتایا تھا کہ ہمیں لمبے عرصے کے لیے ایک پرائیویٹ نرس درکار ہوگی اس سلسلے میں آپ ہماری مدد کر سکتے ہیں۔''

''ظاہر ہے ہسپتال کی نرسیں تو صرف اس وقت ہی ہوں گی جب آپ کی مسز ہسپتال میں ہوں گی مگر آپ کو گھر میں بھی نرس کی ضرورت ہوگی۔ ہمارے پاس پرائیویٹ نرسوں کے کوائف موجود ہیں اور ہم اس سلسلے میں آپ

کی مدد ضرور کریں گے۔''

ہسپتال کے دن اور راتیں اور وقفے وقفے سے وہ وقت جب نرگس کو قلیل عرصے کے لیے گھر آنے کی اجازت مل جاتی تھی اس قدر مشکل، تکلیف دہ اور کربناک ثابت ہوئے کہ سلیم اور نرگس کی زندگی زلزلے میں کچی عمارت کی طرح ریزہ ریزہ ہو گئی۔ درد سے نرگس کو نہ دن میں چین تھا نہ راتوں کو قرار۔ اکثر اُس کی چیخیں سلیم اور دونوں بچوں کو ہلا کے رکھ دیتے۔ دل پہ پتھر رکھ کر سلیم اور نرگس نے فیصلہ کیا کہ دونوں بچوں کو ان کی خالہ کے گھر بھیج دیں جو اسی شہر میں رہتی تھیں۔ بچوں کے امتحان کی تیاری صرف اسی طرح ممکن تھی۔

پرائیویٹ نرس فوزیہ کو ہسپتال میں داخل ہونے کے دوسرے دن ہی سلیم اور نرگس نے منتخب کر لیا تھا۔ وہ ایک قبول صورت عورت تھی جو نرگس ہی کی ہم عمر تھی۔ اس کے سر ٹیفکیٹ اور ڈگری اس کی قابلیت کا ثبوت تھے۔ فر فر انگریزی بولتی تھی اور سلیم و نرگس کی طرح ورزش اور کھیل کی شوقین تھی۔ ہسپتال میں اور گھر پر وہ نرگس کی ہر ضرورت کا بے حد خیال رکھتی تھی۔

سرجری کے بعد جب کیموتھراپی شروع ہوئی تو نرگس کی حالت غیر ہو گئی۔ بے انتہا کمزوری اور بدن کی بوٹی بوٹی کے ہر ریشے سے درد کی ٹیسیں اُسے پاگل کر دیتی تھیں مگر جسمانی تکالیف سے زیادہ ذہنی اذیت تھی۔ سر کے تمام بال جھڑ گئے آنکھیں اندر دھنس گئیں۔ آنکھوں کے گرد پہلے تو سیاہ حلقے پڑے پھر پھیلتے پھیلتے انہوں نے تقریباً پورے چہرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہاتھ اور پیر سیاہ ہو گئے اور اُن کی جلد اس طرح جھڑنے لگی کہ فوزیہ انہیں قینچی سے کاٹ دیتی تو نرگس کو درد بھی محسوس نہ ہوتا۔ ناخن پہلے نیلے ہوئے پھر سیاہ اور پھر جھڑ گئے۔ بھوک ختم ہو گئی اور وزن تیزی سے گرنے لگا۔

سات ماہ کے بعد نرگس کو ہسپتال سے فراغت ملی تو اس نے سلیم سے کہا کہ جب تک وہ مکمل طور سے صحت یاب نہ ہو جائے سلیم علیحدہ کمرے میں سوئے۔ فوزیہ کے لیے گیسٹ روم تیار تھا گو کہ دن کا سارا دن وہ نرگس کے ہی ساتھ ہوتی تھی رات کو بھی وہ گھنٹی بجا کر اُسے بلا لیتی تھی۔ روزانہ فوزیہ اسے غسل کراتی تو کپڑے اترتے ہی نرگس واش روم میں لگے قدِ آدم آئینے میں اپنا جسم سر سے پیر تک غور سے دیکھتی تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا۔ فوزیہ اُسے ہمیشہ تسلی دیتی کہ ایک سال بعد وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔

وقت کی گھڑی ٹِک ٹِک کرتی دنوں کو ہفتوں اور ہفتوں کو مہینوں میں بدلتی گئی۔ سر کے گرے بال آہستہ آہستہ آنے شروع ہو گئے ۔جلد بہتر ہونے لگی اور بدن میں کچھ طاقت محسوس ہونے لگی۔ سرجیکل امپلانٹ تو نہ ہو سکا مگر فوزیہ نے اُسے بریزئیر کے اندر نقلی امپلانٹ رکھنا سکھا دیا سلیم نے لیپ ٹاپ پر نرگس سے کئی وگ پسند کروا کر منگوالیں۔

نرگس اب اس قابل ہو گئی کہ گھر میں چل پھر سکے مگر ابھی بھی اسے کبھی چکّر آ جاتے کبھی کمزوری سے ہاتھ پیر کانپنے لگتے اور اسے آواز دے کر یا گھنٹی بجا کر فوزیہ کو بُلانا پڑتا۔ فوزیہ ایک اچھی نرس اور اچھی ساتھی ہی نہیں بلکہ ایک سگھڑ خاتون بھی ثابت ہوئی اُس نے نرگس سے اجازت لے کر کچن اور گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی سنبھال لئے۔ وہ نرگس کو تیار کرا کر لابی میں ٹیلی وژن کے سامنے بٹھا کر پلک جھپکتے مختلف کام نمٹا دیتی۔ سلیم نے اس کی تنخواہ بھی بڑھا دی اور یہ بھی کہ اگر نرگس کو ضرورت ہو تو اس کا کنٹریکٹ بھی بڑھا دیں گے۔

''صاحب کا فون آیا ہے''

فوزیہ نے اپنا موبائل نرگس کی طرف بڑھایا۔

''تمہارے موبائل پر؟''

''کہہ رہے تھے کہ آپ کا نمبر نہیں مل رہا۔''

نرگس نے گردن گھما کر دیکھا۔ موبائل تو ساتھ ہی پڑا تھا۔

''نرگس اب تو تمہاری طبیعت بہتر ہے۔ عرصے سے باہر بھی نہیں نکلیں چلو سنے پیکس میں فلم دیکھتے ہیں۔''

''چلیں ٹھیک ہے۔ کتنے بجے؟''

''میں چھ بجے آ جاؤں گا۔ ساڑھے چھ کا شو ہے''

جب فوزیہ نرگس کو تیار ہونے میں مدد دے رہی تھی تو عرصے بعد نرگس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نظر آ رہی تھی۔ جب بھی ان دونوں کا فلم کا پروگرام بنتا تھا تو فلم بیشک ٹریجڈی پر ہی ختم ہو اس شام کا اختتام ان کے کمرے میں کامیڈی پر ہی ہوتا تھا۔

کار کا ہارن بجا تو نرگس اور فوزیہ باہر آئے نرگس کو کار کی اگلی سیٹ پر بٹھا کر فوزیہ واپس مڑی تو سلیم نے آواز لگائی۔

''فوزیہ! تم پیچھے بیٹھ جاؤ''

''اس کی کیا ضرورت ہے؛؛

نرگس نے سرگوشی میں پوچھا

''بھئی دو ڈھائی گھنٹے کا پروگرام ہے۔ تمہاری طبیعت خراب ہوئی تو اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔''

سلیم نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

سینما میں سیٹوں پر بیٹھنے لگے تو سلیم نے پہلے نرگس کو بٹھایا پھر خود بیٹھا پھر فوزیہ کو کہا ''تم اِدھر میرے دوسری طرف بیٹھ جاؤ''

نرگس نے سوچا ''لائے تو میرے لیے تھے اپنے پاس بٹھا لیا'' اِک عجیب سی بے چینی نے اُسے گھیر لیا۔

سلیم نے پاپ کارن کا جار نرگس کی طرف بڑھایا تو اُس نے بائیں طرف دیکھتے ہوئے پاپ کارن کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اچانک فلم میں بارش کے سین کے دوران زور کی بجلی چمکی اور پورا ہال روشن ہو گیا۔ نرگس کا بڑھا ہوا ہاتھ رک گیا۔ سلیم کا دوسرا ہاتھ فوزیہ کے ہاتھ میں تھا اور فوزیہ کا سر سلیم کے کاندھے پر۔

گھر پہنچ کر نرگس سو نہ سکی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ طبیعت بہتر ہونے

کے بعداُس نے سلیم سے کئی بار کہا کہ اب وہ اپنے بیڈروم میں آسکتا ہے مگر اُس نے ہمیشہ یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ تمہیں تکلیف ہوگی اور پھر فوزیہ کی ضرورت کسی بھی وقت پڑسکتی ہے۔

اگلے دن سلیم کا فون آیا کہ آج معظم صاحب کی بیٹی کی شادی ہے میں دفتر سے سیدھا وہیں چلا جاؤں گا۔

''تم تو شادی کا کھانا کھاتے نہیں۔کھانا گھر ہی کھاؤ گے نا؟''

''ہاں مگر شادی کے کارڈ پر برات کی آمد رات نو بجے لکھی ہے۔ گیارہ بجے بھی آجائے تو غنیمت ہے۔میں لڑکی والوں کی طرف سے شامل ہورہا ہوں۔ برات آنے سے پہلے تو لوٹ کر آ نہیں سکتا۔ بارہ تو بج ہی جائیں گے۔تم سوجانا۔ مجھے کھانا فوزیہ دے دے گی۔''

موبائل کے کلک کے ساتھ ہی نرگس کو محسوس ہوا کہ اُس کے جسم کا کینسر اُس کی روح میں سرایت کررہا ہے۔

رات گئے سلیم نے آہستہ سے دروازے میں چابی لگائی اور دروازہ اندر سے بند کر کے دبے پاؤں آگے بڑھا۔ لابی سے گزر کر اُس نے بہت آہستگی سے نرگس کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ کمرے میں گھُپ اندھیرا تھا۔ نرگس کو ہمگرین کا اٹیک ہو تو وہ کمرے میں اندھیرا کر کے سوتی ہے۔ سلیم نے آہستہ سے دروازہ بند کیا اور اپنے کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کئے۔ وہ آہستہ آہستہ چل کر گیسٹ روم پہنچا اور آہستہ سے دروازہ کھولا۔ نائٹ بلب واش روم میں جل رہا تھا اور واش روم کا دروازہ بہت تھوڑا سا کھلا تھا۔مشکل سے نظر آ رہا تھا کہ کوئی بستر پر سو رہا ہے۔سلیم نے آہستگی سے دروازہ بند کیا اور چپل اتار کر چادر کے اندر داخل ہو کر بستر پر دراز جسم کے ساتھ اپنے جسم کو چمٹا لیا۔

''سلیم! میں نے فوزیہ کو آج شام پوری تنخواہ دے کر فارغ کردیا''

نرگس کی رندھی ہوئی آواز سلیم کے کانوں سے ٹکرائی ہی تھی کہ بستر پر دراز برہنہ جسم نے کروٹ لی اور سلیم کے سُتے ہوئے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

''تم پریشان نہ ہو۔ مجھے بھی تمہاری اتنی ضرورت ہے جتنی تمہیں فوزیہ کی۔''

دیوانِ رُباعیاتِ انیسؔ۔۔۔۔۔مطالعہ دبیرؔ کی روایت

اردو ادب میں فی زمانہ تحقیق اور تنقید جیسے عرق ریز کام کرنے والے خال خال نظر آتے ہیں۔اوّل اس کام کو وہی لوگ اہمیت دیتے ہیں جو علم وادب کے ورثے کی افادیت اور آنے والی نسلوں کی ضرورت سے کما حقہٗ باخبر ہوتے ہیں۔ڈاکٹر سید تقی عابدی کا نام اردو ادب میں نہایت احترام اور ادب سے لیا جاتا ہے۔سبب اس کا یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی عمرِ عزیز کے ماہ وسال سے زیادہ اُن کی تحقیقی اور تنقیدی کتب عالمِ ادب کی خصوصی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہیں۔ ہر شخص جب ڈاکٹر صاحب کی کتب سے استفادہ کرتا ہے تو ایک مرتبہ کے لیے اُس کے اوسان ضرور خطا ہوجاتے ہیں اور یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ کیا کوئی خاکی انسان اس قدر علم اور توانائی کا حامل بھی ہوسکتا ہے۔تو ہمارا جواب اس حوالے سے یہ ہے کہ جی ہاں! ڈاکٹر سید تقی عابدی ہماری آپ کی توقع سے کہیں زیادہ علم، عمل اور عرق ریزی کے آدمی ہیں۔اُنہیں اردو ادب نے شاید وہ کچھ نہ دیا ہو جس کی ایک ادیب توقع رکھتا ہے مگر ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اردو ادب کو وہ کچھ دیا ہے جس کی اُن سے توقع کی جاسکتی تھی اور وہ کچھ بھی دیا ہے جس کی توقع کرنا انصاف کے زمرے میں نہیں آتا۔

سرِ دست ہمارے پیشِ نظر ڈاکٹر صاحب کی دو نہایت بامعنی وباوقار تصانیف ''دیوانِ رُباعیاتِ انیس'' اور ''مطالعہ دبیرؔ کی روایت'' پیشِ نظر ہیں۔اگر ہم مذکورہ بالا کتب کے حوالے سے خاص خاص اور چیدہ چیدہ عنوانات کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہیں تو نہ صرف ڈاکٹر سید تقی عابدی بلکہ ہر دو کتب کے ساتھ بھی زیادتی ہوگی۔ڈاکٹر صاحب نے ہر دو باکمال شعراء کی زندگی اور فن کے حوالے سے ہر ہر پہلو سے نئے زاویوں کو تلاشا اور تراشا ہے اور تلاش وجستجو کے حامل احباب کے لیے ایسا ذخیرۂ علم یکجا کردیا ہے کہ ہم ایک مدت تک انیسؔ ودبیرؔ کے حوالے سے ان کتب سے استفادہ کرتے رہیں گے اور آنے والے زمانوں کے لیے بھی ایسی مثال چھوڑ جائیں گے جو ہر لحاظ قابلِ فخر کہلائی جانے کی مستحق ہوں گی۔

مذکورہ بالا دونوں کتب سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور سے بآسانی حاصل کی جاسکتی ہیں۔کتاب اوّل کی قیمت مبلغ بارہ صد روپے اور کتاب دوم کی قیمت سات سو پچانوے روپے مقرر کی گئی ہے۔

"انسانیت کا جنازہ"

رونق جمال
(چھتیس گڑھ، بھارت)

بُوا مر چکی تھی۔ لیکن کتنی حیرت کی بات ہے کہ بُوا جو ساری زندگی ہماری بُوا تھی آج مرتے ہی پھوپھی ہو گئی ہے۔۔۔!! پھوپھی کا جنازہ تیار ہو چکا ہے کیونکہ پھوپھی زندگی کے اُنھتر سال کا مختصر سفر ختم کر کے طویل سفر پر جو جارہی ہے۔ ہم سب رو رہے ہیں۔ پھوپھی ہم سب کی سب کچھ تھی۔ پھوپھی کی شخصیت پر اسرار نہیں تھی لیکن ہمارے لیے حیرت انگیز ضرور تھی۔!! پھوپھی کی باتیں حیرت انگیز، پھوپھی کی حرکتیں حیرت انگیز، پھوپھی کی ہم سب سے بے لوث محبت وچاہت حیرت انگیز۔! یہ کیا کم حیرت انگیز بات ہے کہ آج ایک ہندو کے گھر سے مسلمان کا جنازہ اُٹھ رہا ہے! پھوپھی کا جنازہ اُٹھا تو پھوپھی کی پوشیدہ زندگی پر سے ایک ایک کر کے سارے پردے اُٹھتے چلے گئے اور پھوپھی کی جو کہانی سامنے آئی وہ بھی لوگوں کے لیے کم حیرت انگیز نہیں ہے۔ پھوپھی کی زندگی میری نظروں کے سامنے فلم کی طرح گھومنے لگی ہے۔

میں بیاہ کر سسرال گئی تھی اور چند سالوں میں بال بچوں اور گھر گرہستی میں اُلجھ کر رہ گئی۔ شادی کے بعد پہلے پہل سال چھ مہینے میں مائکے آ جایا کرتی تھی لیکن بچوں کی پڑھائی کا سلسلہ شروع ہوا تو دو دو تین تین سال بعد خاندان میں شادی بیاہ یا موت مٹی کے موقع پر آنا ہوتا ہے آج بھی بُوا کی موت کی خبر سن کر سالوں بعد مائکے آئی ہوں۔

پندرہ اگست یوم آزادی انگریزوں کی غلامی سے نجات کا دن۔ ۱۹۴۷ء سے ہم ہندوستانیوں کے لیے مخصوص تاریخ بن گئی ہے۔ پچھلے اڑسٹھ سالوں سے ہم اس تاریخ کو آزادی کا جشن جوش وخروش کے ساتھ مناتے چلے آ رہے ہیں۔۔!! لال قلعے پر ملک کے وزیر اعظم ترنگا لہراتے ہیں۔ ملک کے گلی کوچوں میں عوام ترنگا لہراتے ہیں۔ قومی ترانوں کو گنگناتے ہیں۔ یوم آزادی سارے ملک ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں جہاں جہاں بھی ہندوستانی بستے ہیں نہایت اہتمام کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ میں بھی اسکول کے ابتدائی دور سے لے کر اب تک ہر سال پندرہ اگست کو یومِ آزادی باقاعدہ مناتی آ رہی ہوں۔ مجھے ہاتھوں میں جھنڈا اُٹھانا انقلاب کا نعرہ لگانا ڈاکٹر علامہ اقبال کا ترانہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" گانا، گاندھی جی بھگت سنگھ اشفاق اللہ اور بسمل کی تصویروں پر پھول چڑھانا اپنے ملک اور اپنی آزادی پر اِترانا اچھا لگتا ہے!! آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے اور ہماری آزادی ہمارے بزرگوں کی قربانیوں کا نتیجہ ہے ہمیں یہ آزادی تحفے میں نہیں ملی ہے بلکہ ہماری یہ آزادی ہمارے بزرگوں کی تگ ودو جفاکش، محنت، خون پسینے، جانی و مالی قربانیوں کا صلہ ہے۔ ہماری اس خوبصورت پرسکون آزادی کے پیچھے ڈھیروں کہانیاں ہیں جو آج بھی رونگٹے کھڑے کر دیتی ہیں!! اُن ہی رونگٹے کھڑے کر دینے والی کہانیوں میں سے ایک کہانی پچھلے سالوں سے ہمارے گھر کی چادر دیواری میں پل رہی تھی۔ لیکن ہم میں سے کسی کو بھی اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ ہم اس کہانی کو کریدیں اُس کی تہہ تک جائیں۔ دادا کے بنائے ہوئے قانون اور اصولوں کو توڑنا خود اپنی کھال کھنچوانے سے کم نہیں تھا۔ اس لیے ایسی ویسی حرکت یا ہمت ہمارے گھر میں کوئی بھی نہیں کرتا تھا۔

ہمارے کوٹھی نما گھر میں سب کا اپنا اپنا کمرہ ہے۔ اس لیے بے مقصد کوئی بھی ایک دوسرے کے کمرے میں آتا جاتا نہیں ہے۔ بڑا سا باورچی خانہ ہے۔ باورچی خانے سے لگا ہوا ایک بڑا سا ہال ہے جس میں ایک بڑی سی میز ہے جس کے اردگرد سولہ کرسیاں ہیں جس پر بیٹھ کر سارا گھر ایک ساتھ کھانا کھاتا تھا۔ اب زندگی کی آپا دھاپی میں نہ جانے کب سے یہ کرسیاں سب کے ایک ساتھ کھانے کا انتظار کر رہی ہیں۔ گھر کی چار دیواری میں ایک بڑا سا باغیچہ ہے۔ باغیچے سے پہلے بڑا سا آنگن ہے۔ آنگن میں مخملی گھاس لگی ہے جس پر کھیل کود کر ہم جوان ہوئے ہیں آج بھی وہ گھاس ویسی ہی مخملی اور ہری ہری ہے۔ بُوا کی زندگی کی کہانی میں نے زندگی میں پہلی بار اکیس سال کی عمر میں خود اُن کی زبانی چودہ اگست کو سنی تھی۔

میں بی۔ اے کے آخری سال میں تھی۔ کالج میں آزادی سے متعلق تقریری مقابلہ رکھا گیا تھا جس میں میں نے بھی حصہ لیا تھا اور اوّل انعام حاصل کیا تھا۔ میں اُس انعام کو پا کر بے انتہا خوش تھی۔ گھر میں بُوا ہی اک ایسی فرد تھیں جو میری اس طرح کی کامیابیوں پر دل کی گہرائیوں سے خوش ہو کر مبارک باد دیا کرتی تھیں اور میری کامیابی کو سراہا کرتی تھیں۔ اس لیے میں کالج سے لوٹ کر سیدھا بُوا کے کمرے کے دروازے پر جا دھمکی۔ ہمیشہ کی طرح بُوا کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ بُوا دروازے پر دستک دینے پر دروازہ کھول دیا کرتی تھیں۔ میں نے حسبِ معمول دستک دی لیکن جب بُوا نے کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے ہلکی سی قوت لگا کر دروازے کو دھکا دیا۔ دروازہ کھل گیا تو کھلتا ہی چلا گیا۔ بُوا آنکھیں بند کیے ہاتھوں میں پاکستان کا جھنڈا اٹھائے پاکستان کا قومی ترانہ گنگنا رہی تھیں۔ ترانے کے اختتام پر بُوا نے پاکستان زندہ باد، قائد اعظم زندہ باد کا نعرہ لگایا اور آنکھیں کھول دیں۔ مجھے سامنے کھڑا دیکھ کر بُوا گھبرا گئیں تھی جیسے میں نے بُوا کی چوری پکڑ لی ہو۔!! میں حیران و ششدر تھی کہ آج چودہ اگست ہے پاکستان کا یوم آزادی اور بُوا ہاتھ میں پاکستان کا جھنڈا اٹھائے پاکستان کا قومی ترانہ گا رہی ہے اور پاکستان زندہ باد، قائد اعظم زندہ باد کا نعرہ لگا رہی ہے!! میں کوتوال کی طرح کمر پر ہاتھ رکھے بُوا کو سوالیہ نظروں سے گھور رہی تھی۔ بُوا کے چہرے اور نظروں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کچھ خوف زدہ سی ہو گئیں ہیں اور بات چیت کا کوئی خوبصورت بہانہ تلاش رہی ہیں۔۔۔!! میں نے ایک قدم بُوا کی جانب بڑھا کر خاموشی کو توڑ دیا۔

''بُوا۔۔۔ یہ اپنے ملک سے غداری ہے۔!!؟ آپ اور یہ پاکستان کا جھنڈا۔۔؟ پاکستان کا قومی ترانہ۔۔۔!!؟ پاکستان زندہ باد!! قائدِاعظم زندہ باد!! یہ سب کیا ہے بُوا۔۔!!؟؟ آج چودہ اگست ہے پاکستان کی آزادی کا دن!!!!اور ہم ہندوستانی ہیں۔۔۔!! ہم پندرہ اگست کو یوم آزادی مناتے ہیں۔ ترنگا لہراتے ہیں قومی ترانہ ''جن گن من'' گاتے ہیں ہندوستان زندہ باد۔۔۔ مہاتما گاندھی زندہ باد، پنڈت جواہر لال نہرو زندہ باد کا نعرہ لگاتے ہیں اور فخر کرتے ہیں۔۔۔!! لیکن آپ یہ کیا کر رہی ہیں بُوا۔۔!!؟ اور کیوں۔۔۔!؟''

میں نے حیرت کے دریا میں غرق ہو کر ایک ہی سانس میں بُوا سے کئی سوال کر ڈالے۔ بُوا نے آگے بڑھ کر مجھے پکڑ کر پلنگ پر بیٹھا دیا۔ کمرے کے دروازے کو اندر سے بند کیا اور میرے پہلو میں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں جیسے جب کوئی بچہ کھلونا چھن جانے پر روتا ہے۔ بُوا کو زاروقطار روتا دیکھ کر میں سہم گئی تھی اس لیے میں نے بُوا کو پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔

''بُوا کیا ہوا ہے آپ کو۔۔۔!؟ کیوں رو رہی ہیں آپ۔۔!؟ بتایئے نا پلیز۔۔۔ بُوا۔۔۔ رونا بند کیجیے۔۔۔!! میں ممی پاپا کو بلا کر لاتی ہوں۔۔۔!! کہہ کر میں جانے کے لیے اُٹھی تو بُوا نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ کر روک لیا اور مجھے کھینچ کر بٹھا لیا۔ میں نے بُوا کے آنسو پونچھے اور اُن کے چہرے کو ہاتھوں میں لے کر نہایت اپنائیت سے پوچھا۔

''کیا ہوا بُوا۔۔۔!؟ آپ اس طرح رو کیوں رہی ہیں۔۔۔!؟ مجھے بتایئے شاید میں آپ کے کچھ کام آسکوں۔۔۔ پلیز۔۔۔!! بُوا نے میری جانب غور سے دیکھا۔ میری محبت میرے خلوص کو محسوس کیا اور میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔۔۔'' آؤ آج میں تمہیں اپنی زندگی کے ایک اہم راز سے روشناس کراتی ہوں۔۔۔!! کہہ کر بُوا کمرے کی چھت کو گھورنے لگیں جیسے وہ ماضی کے اوراق پلٹ رہی ہوں۔ چند لمحوں بعد بُوا نے درد بھرے انداز میں کہنا شروع کیا۔

''میں تمہاری بُوا نہیں ہوں۔۔۔! میں تمہاری کچھ بھی نہیں ہوں۔۔!! میں رادھا بھی نہیں۔۔۔!! بلکہ رضیہ ہوں۔۔۔!!

''یہ کیا کہہ رہی ہیں بُوا۔۔۔!!؟؟''

''ہاں میرا تمہارا خون کا نہیں صرف انسانیت کا رشتہ ہے۔۔!! تمہارے دادا نے یہ رشتہ بنایا تھا اور میں نے اُسے ہر ممکن نبھایا ہے۔۔۔!! ہمیں فرنگیوں کی غلامی سے آزادی مل چکی تھی۔ ہندوستان کا بٹوارا ہو چکا تھا۔ پاکستان وجود میں آچکا تھا نفرت کی آگ بھڑک چکی تھی۔ ہندو مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا تھا۔ ہندو پاکستان اور مسلمان ہندوستان چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ سرحد پر حیوانیت شباب پر تھی۔۔۔! ہندو مسلمان ایک دوسرے کو مار کاٹ رہے تھے جوان بہو بیٹیوں کی عصمت کو تار تار کر رہے تھے۔ مال واسباب کو لوٹ رہے تھے۔ ملک کے بٹوارے سے پہلے میرا خاندان پنجاب صوبے کے سحرالہ قصبے سے دس کلومیٹر دور سرور پور میں آباد تھا جہاں مسلمانوں کی قابل لحاظ آبادی تھی۔ ہندو اور سکھوں کے ظلم و بربریت نے مسلمانوں کا جینا محال کر دیا تھا۔ مسلمان جان بچانے کے لیے سرور پور چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ جو مسلمان مال واسباب کی فکر میں وہیں ڈٹے ہوئے تھے ایک ایک کر کے مارے جا رہے تھے۔ اُس وقت میری عمر بارہ سال کی تھی۔ میرے ابو صغیر احمد خان ماسٹر تھے۔ ایک رات ابو نے تمام روپے اور زیورات کو کپڑے میں لپیٹ کر کمر میں باندھا امی نے ڈھیر سا کھانا بنا کر کئی دنوں کا توشہ تیار کیا اور رات کے اندھیرے میں گھر کو مقفل کے حوالے کر کے پاکستان میں کسی رشتہ دار کے یہاں جا کر پناہ لینے کی غرض سے نکل پڑے کہ حالات کے سازگار ہونے کے بعد لوٹ آئیں گے۔ سرحد پر پہنچے تو وہاں افراتفری کا عالم تھا دونوں طرف مار کاٹ اور لوٹ مار کا سلسلہ جاری تھا۔ کسی کا شوہر کسی کا بھائی کسی کا باپ بچھڑ گیا تھا یا مارا گیا تھا۔ چاروں طرف خون ہی خون بے بس اور ڈرے سہمے لٹے پٹے لوگ اپنی منزل کی جانب روانہ ہونے کے لیے اسٹیشن پر ریل میں سوار ہونے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ جو ریل میں سوار ہونے میں کامیاب ہو جاتے وہ ریل میں غیر محفوظ۔۔۔! جو اسٹیشن پر رہ جاتے وہ موت سے نبرد آزما ہو جاتے! ابو اسٹیشن پر ہم سب کو ایک جگہ بیٹھا کر ریل میں سوار ہونے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے تھے کہ ریل کے آتے ہی ہمیں محفوظ جگہ مل جائے۔ تمہارے دادا دادی اپنے بیٹے بیٹیوں کو لے کر ہمارے قریب ہی بیٹھے تھے۔ لاہور سے ریل آئی لوگ جانوروں کی طرح دوڑ پڑے اور ریل میں سوار ہونے کی جدوجہد کرنے لگے اُسی اثنا میں ہندوؤں کی ایک بڑی ٹولی نے پلیٹ فارم پر بیٹھے مسلمانوں پر حملہ کر دیا اور مسلمانوں کو مارنا کاٹنا اور لوٹنا شروع کر دیا اسٹیشن جنگ کا میدان بن گیا تھا۔ تمہارے دادا کا ایک بیٹا یعنی تمہارا بڑا باپ جو کڑیل جوان تھا عمر یہی کوئی اٹھارہ بیس سال کے قریب ہو گی مجھ پر نظریں گاڑے ہوئے تھا اور گندے گندے اشارے بھی کر رہا تھا۔ ایک بار میرے قریب آکر بدتمیزی کرنے کی کوشش بھی کر چکا تھا لیکن تمہارے دادا نے اُس کے گال پر طمانچہ رسید کر کے اُسے اُس کی غلط حرکتوں سے باز رہنے کا کہا تھا۔ وہ افراتفری کا فائدہ اٹھا کر میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچتا ہوا مال خانے میں لے گیا جہاں کوئی بندہ نہیں تھا۔ وہاں اُس نے میری آبرو لوٹ لی اُسی وقت تیرے دادا جی بھی ہمیں ڈھونڈتے ہوئے مال خانے میں آگئے اُن کے ہاتھ میں پستول تھی اُنہوں نے بیٹے کو گناہ کرتے دیکھا تو آپے سے باہر ہو گئے اور بیٹے کے سینے میں گولی اُتار دی اُس نے وہیں دم توڑ دیا۔ تیرے دادا نے سر سے پگڑی اُتاری اور کھول کر میرے جسم کو ڈھانک دیا۔ بیٹے کی لاش پر حقارت سے تھوک دیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر وہیں لائے جہاں میرا اور اُنکا کنبہ بیٹھا تھا۔ ہمارا سارا سامان غائب تھا اور ابو امی بھائی بہنوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ لاشوں کو دیکھ کر میں چکرا کر گر پڑی اور بیہوش ہو گئی۔ ہوش آیا تو میں ریل میں تھی تیرے دادا میرا سر گود میں لئے ہوئے بیٹھے تھے۔ تیری دادی بیٹے کی موت پر آنسو بہا رہی تھیں۔ تیرے ابو چچا اور پھوپھیاں ڈرے سہمے ہوئے تھے۔ آس پاس بیٹھے ہوئے مسافروں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ ڈبے میں سنّاٹے کا راج تھا۔ کھڑکی کے ذریعہ ہوا کے ساتھ ریل کی پٹڑی اور لوہے کے چاک کے سنگم کا نغمہ

سنائی دے رہا تھا۔ٹرین پوری قوت کے ساتھ دوڑ رہی تھی کبھی کبھی انجن کی چیخ سنائی دیتی یا دھویں کے بادل دکھائی دیتے اور کچھ کوئلے کے جلنے سے پیدا ہونے والی بو ناک میں گھس کر بے چین کر دیتی تھی۔تیرے دادا لاہور کے مشہور وکیلوں میں سے تھے۔تقسیم ہند کے بعد کسی دور کے رشتہ دار کے بلاوے پر لاہور کا گھر بار جائیداد فروخت کر کے الہ آباد جا رہے تھے۔

الہ آباد پہنچ کر بابا نے مجھے رضیہ سے رادھا بنا دیا تھا۔بابا یعنی تیرے دادا نے مجھے بیٹی بنا لیا تھا۔بالکل بیٹی کی طرح ہی مجھے پالا پوسا تیرے پتا جی کی شادی کے بعد میرے لیے بھی کئی رشتے آئے لیکن بابا نے لوٹا دیے کیونکہ وہ تمام رشتے ہندو برہمن لڑکوں کے تھے بابا چاہتے ہوئے بھی کسی مسلمان سے میری شادی نہیں کرا سکتے تھے۔وہ میرے ساتھ ہو رہی ناانصافی اور ظلم کی وجہ سے بے حد شرمندہ اور پریشان رہتے تھے۔ہندو لڑکے سے وہ مجھے بیاہنا نہیں چاہتے اور چاہ کر بھی میرے لیے مسلمان لڑکے کا رشتہ تلاش نہیں کر سکتے تھے کیونکہ بٹوارے کے بعد ملک میں دھرم و مذہب کا بازار بہت گرم چل رہا تھا۔بات بات پر شہر کا ماحول بگڑ جاتا تھا۔بابا نہیں چاہتے تھے کہ ان کی کسی حرکت کی وجہ سے ہم مصیبت میں گھِر جائیں۔۔۔!! آخر ایک ایک کر کے تیرے چاچا اور بواؤں کی شادیاں ہو گئیں۔چھوٹے کی شادی کے کچھ دنوں بعد بابا بھی اس دنیا کو چھوڑ کر چلے گئے۔سچ اُس روز میں بے انتہا روئی تھی۔اپنے ابو امی کی جدائی سے بھی زیادہ! کیونکہ ایک بار پھر میں باپ کی شفقت سے محروم ہو گئی تھی۔بابا نے مرنے سے پہلے یہ حویلی میرے نام کر دی تھی اور بیٹوں سے کہہ دیا تھا کہ جب تک رادھا زندہ ہے یہ گھر اس کا ہے۔اس کے مرنے کے بعد ہی تم سب اس کے مالک ہو گے۔میں چاہتا ہوں میرے مرنے کے بعد تم سب رادھا کو ایسی ہی عزت دو کیونکہ میں دنیا میں تاعمر شرمندہ رہا ہوں لیکن بھگوان کے سامنے مجھے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔۔۔!!
بابا سے کیے گئے وعدے کو سب نے نبھایا ہے اور نبھا رہے ہیں۔

میں بھلے ہی دنیا والوں کے لیے رادھا ہوں لیکن آج بھی میں دل سے مسلمان ہوں۔میرا نام رضیہ ہے۔مجھے اپنے مذہب سے پیار ہے۔پاکستان سے پیار ہے کیونکہ میرے ابو امی نے پاکستان کے سفر کے دوران اپنی جانیں گنوا دی تھیں۔یہ بھی صحیح ہے کہ اب تم لوگوں کے سوا میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے میری بچی!! میں آج بھی امی ابو،بہن بھائیوں کی لاوارث بکھری پڑی لاشوں کو بھولی نہیں ہوں۔ہندوؤں کے ظلم و ستم میرے دل میں پوشیدہ ہیں۔۔۔! تیرے بڑے باپ نے جوانی سے پہلے ہی میرے جسم کو داغدار کر دیا تھا۔بیٹی بنا کر بابا نے جسم کے درد کو دُور کر دیا تھا لیکن روح کا درد۔۔۔!!؟ وہ آج بھی ویسا کا ویسا ہی ہے میری بچی۔۔۔!! روح کے درد سے نجات پانے کے لیے ہی میں یہ سب کرتی ہوں۔۔۔یہی میری روح کے درد کا واحد علاج ہے۔۔۔!! کہہ کر بُوا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں اب بُوا کے ساتھ میں بھی رو رہی تھی۔بُوا کی کہانی سن کر بُوا کی روح کا درد میری روح میں شامل ہو گیا تھا۔۔۔آہ۔۔۔ اندر سے کتنی کھوکھلی کتنی ٹوٹی اور بکھری ہوئی تھی بُوا۔۔۔!!!؟ لیکن ہم سب کے لیے بُوا کتنی ایماندار اور دلدار تھی۔۔۔پتا جی اور چاچا۔۔۔بُوا کی کوئی بات ٹالتے نہیں تھے۔بُوا کا مان سمّان گھر کے ہر فرد کے لیے لازمی تھا۔جو بھی کرے گی رادھا بُوا کرے گی۔ہمارے لیے رادھا بُوا کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوتا تھا۔۔۔!بُوا کی کہانی سن کر میں بُوا کی غلام ہو گئی تھی۔اب ہر سال میں بھی بُوا کے ساتھ سب سے چھپ کر اُن کے کمرے میں چودہ اگست کو پاکستان کی آزادی کا جشن منانے لگی تھی۔کیونکہ بُوا کی روح کا درد میری روح میں جو اُتر گیا تھا۔پھر میری بھی شادی ہو گئی۔میں اپنی سسرال کی ہو گئی میرے بچے ہو گئے میں گھر گرہستی میں ڈوب گئی۔میں جب بھی مائکے آتی ہوں بُوا ماں سے زیادہ لاڈ مجھے میرے بچوں اور میرے پتی کو دیتی ہیں۔بُوا نے مرنے سے پہلے یہ گھر میرے پتا جی اور چاچاؤں کے نام کر دیا تھا اور ایک خواہش ظاہر کر دی تھی کہ کچھ بھی ہو اُن کی میت مسلم ریتی رواج کے مطابق کی جائے۔وہ مسلمان پیدا ہوئی تھیں ہندو بن کر جئیں لیکن مسلمان کی موت مرنا چاہتی تھیں۔

اب ہمیں آزادی ملے اڑسٹھ سال گذر چکے ہیں ہندوستان کے حالات بدل چکے ہیں۔سماج کی سوچ بدل چکی ہے۔وقت نے ہمیں جینا سکھا دیا ہے۔بُوا کی روح قبض ہوتے ہی پتا جی اور چاچاؤں نے محلے کی مسجد کے امام صاحب سے مل کر ساری حقیقت بیان کر دی۔امام صاحب نے بُوا کی میت کا ذمہ لے لیا ہے اور آج ایک ہندو کے گھر سے مسلمان کا جنازہ اُٹھایا جا رہا ہے تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے یہ رادھا بُوا کی ارتھی نہیں ہے۔۔۔! رضیہ پھوپھی کی میت بھی نہیں ہے بلکہ انسانیت کا جنازہ ہے!! پھوپھی کا جنازہ اُٹھتے ہی میرے دل سے پھوپھی کی دردناک کہانی کی چیخ بھی نکل پڑی ہے۔۔۔!!!

''دیکھو ہم نے کیسے بسر کی''

جتندر بلو اردو افسانے کا روشن نام اور معتبر حوالہ ہے۔اُن کے ہاں کہانی چلتی نہیں بلکہ صاف شفاف پانی پر بہتی نظر آتی ہے۔بلو جی اپنے گرد و پیش کو مشکِ قلم بنانے کے بجائے اپنی ذات اور اُس سے جڑے تجربات و مشاہدات کو کچھ اس انداز سے کہانی کی لڑی میں پروتے ہیں کہ قاری کو سب کچھ صاف صاف نظر آنے لگتا ہے۔''دیکھو ہم نے کیسے بسر کی'' اُن کی سوانحی کولاژ ہے جس میں اُنہوں نے دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے اور دیانت داری کی بات یہ ہے کہ وہ اپنی کوشش میں بہت حد تک کامیاب ٹھہرے ہیں۔ہمارے بیان کے بعد آپ یقیناً جناب جتندر بلو کی سوانحی کولاژ ''دیکھو ہم نے کیسے بسر کی'' کی نسبت اشتیاق رکھتے ہوں گے جس کو پیش نظر رکھتے ہوئے کتاب کی قیمت اور دستیابی کا حوالہ درج کیا جا رہا ہے۔

اشاعت:۲۰۱۴ء، قیمت:۲۰۰ روپے، دستیابی:قلم پبلی کیشنز،ممبئی،نئی کتاب پبلشرز، جامعہ نگر، نئی دہلی۔مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،ممبئی،دہلی،علی گڑھ، بھارت۔

سونامی

شکیل خان
(حیدرآباد)

''آپ کہاں رہ گئے تھے؟'' نسرین نے اپنے شوہر امجد کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر غصے سے کہا۔''آپ کو بتایا تھا ناں، مجھے اپنے ہیڈ ماسٹر کے پاس جانا ہے۔''

''ہاں ہاں...... مجھے یاد ہے، بچوں کو ٹیوشن پر چھوڑ کر جب میں واپس آرہا تھا تو راستے میں تمہاری خالہ زاد بہن شازیہ اور اس کا شوہر خالد مل گیا تھا۔''

''وہ دونوں یہاں......!'' نسرین نے تعجب سے پوچھا۔

''یہی پتا کرنے تو میں رُک گیا تھا، مارکیٹ کے سامنے جو بدنامِ زمانہ فلیٹس ہیں، خالد اپنی موٹر سائیکل کے ساتھ وہیں کھڑا تھا۔'' امجد دیوار کے ساتھ لگے بڑے کشن پر اپنی بیوی کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔ وہ وہیں بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھی۔

''مگر آپ تو کہہ رہے تھے، شازیہ بھی ملی تھی؟''

اس نے گھور کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔''تم عورتوں کو بھی ناں...... بیچ میں بولنے کی بیماری۔۔۔''

''اچھا اچھا...... آگے بولیں'' وہ امجد کی بات کاٹ کر فوراً بولی۔

''کیا بولوں، تم نے سارا ٹیمپو توڑ دیا''

''اچھا بابا معاف کر دیں'' اس نے چھری سمیت دونوں ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کر دیئے۔

''یہ ہوئی ناں بات.....'' اس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آ گئی '' ہاں تو میں...خالد کو دیکھ کر اس کے قریب چلا گیا۔ سلام دعا کے بعد میں نے اس سے وہاں کھڑے ہونے کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا، شازیہ بھی اس کے ساتھ ہے اور وہ اپنی کسی پرانی محلے دار بیوہ خاتون کی مدد کرنے اس کے فلیٹ میں گئی ہے۔ یہ سن کر تو مجھے غصہ آ گیا، میں نے کہا تمہیں پتا ہے یہ فلیٹس اچھی شہرت نہیں رکھتے اور اگر نہیں معلوم تو پھر بھی تمہیں اسے وہاں اکیلے نہیں بھیجنا چاہیے تھا....''

''آپ کا غصہ دیکھ کر تو وہ گھبرا گیا ہوگا...... وہ تو ہے بھی بے چارا معصوم سا۔'' وہ پھر درمیان میں بولی۔

''بات معصومیت کی نہیں بھروسے کی ہے یار....اور وہ بھی شازیہ پر...... ویسے مرد کو اتنا بھی زن مرید نہیں ہونا چاہیے۔ آج کل کے مردوں کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے، گھر کے کام کاج سے لے کر بچوں کی پوٹی دھلانے تک میں وہ بیویوں کے ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔''

''اس میں قصور کسی ایک کا نہیں بلکہ دونوں کا ہے۔ کیا میں نے آپ سے یہ کام کبھی کروائے؟'' نسرین نے اپنے شوہر کی طرف رُخ کر کے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''ابے تو ہم مرد ہیں... مرد، تم مجھ سے یہ کام کرواتیں تو کیا میں کر لیتا؟... عورت پاؤں کی جوتی ہوتی ہے ...اور وہ وہیں اچھی لگتی ہے'' اس نے گردن مٹکاتے ہوئے بیوی کو جواب دیا۔

''اچھا اور وہ جو سرِعام بازاروں میں مردوں کے سروں پر اکثر جوتیاں برستی رہتی ہیں، اس کے بارے میں جناب کا کیا خیال ہے؟'' نسرین نے بھی بھنویں نچاتے ہوئے جملہ کسا۔

''اس میں بھی عورتوں کا ہاتھ ہوتا ہے، وہ کیوں اتنی بن ٹھن کے شاپنگ کرنے جاتی ہیں؟'' وہ پھر مردوں کی حمایت میں بولا۔

''بنے ٹھنے تو مرد ناراض، برقعہ یا عبایا پہنے تو مرد خفا، آخر مردوں کی کوئی کل سیدھی بھی ہوتی ہے...... ویسے عورتیں کچھ بھی پہن لیں، مردوں کی نظریں ہوتی خراب ہیں۔ ایکسرے کی طرح اس کی ہر چیز دیکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔''

اس جواب پر امجد لاجواب ہو گیا اور وہ فوراً موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

''ارے یار، ہم بھی کس فضول بحث میں پڑ گئے...... تمہیں ہیڈ کے ہاں نہیں جانا''

''صرف چابی کی وجہ سے جانا پڑے گا، اے سی آر فائل تو میں بعد میں بھی دے دوں گی، کل اسد کے اسکول جانے کی وجہ سے یہ اچانک رخصت لینی پڑی ہے، ایسا کریں یہ دونوں چیزیں آپ دے آئیں...پلیز'' وہ التجا کرتے ہوئے بولی ''مجھے ابھی کھانا بھی بنانا ہے''

''ان کے پاس گئے، مجھے خاصا عرصہ ہو گیا ہے، فلیٹ کی لکیشن (location) بھی اب تو صحیح طرح سے یاد نہیں۔'' وہ ٹال مٹول کرنے لگا۔

''ارے بہت آسان ہے...... مین گیٹ کے دائیں طرف بلاک B ہے، بس اسی کے چوتھے فلور پر فلیٹ نمبر 402''

''یار سچی بات بتاؤں...... مجھے اس کھڑوس کے پاس جانا بالکل اچھا نہیں لگتا'' اس نے برا سا منہ بنایا۔''تم ہی یہ تھوڑی سی تکلیف کر لو اور ساتھ چلو''

''اچھا'' اس نے مایوسی سے اٹھتے ہوئے کہا ''عصر پڑھ لوں، پھر چلتے ہیں۔''

ابھی وہ دو قدم ہی چلی تھی کہ پھر پلٹی ''ارے ہاں یاد آیا...... وہ خالد اور شازیہ کی بات تو ادھوری ہی رہ گئی۔''

''بڑی جلدی خیال آ گیا۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

''نہیں...... وہ یہاں تو نہیں آئیں گے۔ میں اس لیے پوچھ رہی تھی۔''

''وہ دونوں تو چلے بھی گئے، آپ کی چھمک چھلو بہن، کچھ دیر بعد ہی بھر پور میک اپ میں، شوخ رنگ کا چست لباس پہنے اور دوپٹہ کاندھے پر لٹکائے اتراتی ہوئی آ گئیں تھیں، اب تم ہی بتاؤ کوئی اس حلیے میں اور وہ بھی ان فلیٹس میں کسی بیوہ کی مدد کرنے جاتا ہے یا.....'' اس نے کسی قدر تلخی کے ساتھ جملہ ادھورا چھوڑتے ہوئے کہا۔

''آپ خواہ مخواہ اس پر شک کرتے ہیں، وہ بچپن ہی سے فیشن کی شوقین رہی ہے مگر کردار کی خراب نہیں ہے۔ اچھا ایک بات بتائیں....'' نسرین کا لہجہ اچانک تبدیل ہو گیا اور اس نے ترش انداز میں پوچھا ''اگر وہ خراب ہے تو آپ اس سے فری ہونے کی کوشش کیوں کرتے ہیں؟''

''میں...... میں تو منہ نہیں لگاتا ایسی عورتوں کو'' یہ کہتے ہوئے اس کے منہ کا زاویہ بگڑ گیا۔

''ہاں......اگر موقع نہ ملے''

''کیا مطلب؟'' امجد کا پارہ چڑھ گیا۔

''ظفر چچا کے بیٹے کی شادی یاد ہے، جس میں، میں آپریشن کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکی تھی اور آپ اس کے ہر فنکشن میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔''

''ہاں تو پھر؟''

''پھر یہ کہ آپ میری غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، شازیہ سے خوب فری ہو رہے تھے، مذاق ہو رہا تھا، اس کی تعریفیں ہو رہی تھیں، یہاں تک کہ آپ نے اس کے ساتھ مہندی میں ڈانس بھی کیا تھا، میری بہن ایک ایک بات مجھے فون پر بتاتی تھی مگر میں بیماری کی وجہ سے خاموش رہی'' غصے کی وجہ سے نسرین کی سانسیں پھولنے لگیں۔

امجد نے چوری پکڑے جانے کے بعد وہاں سے کھسکنے میں ہی عافیت جانی اور وہ اٹھ کر واش روم کی طرف چل دیا، اس دوران نسرین اپنی سانسیں درست کرنے لگی، اور جیسے ہی دروازہ بند ہونے کی آواز آئی، اس کے منہ سے طنزیہ ''ہنہ'' کی آواز گردن کی حرکت کے ساتھ نکلی۔

امجد نہا دھو کر جب واش روم سے نکلا تو اس نے دیکھا نسرین ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے عبایا پہنے کھڑی سر پر اسکارف باندھ رہی ہے، اس کے چہرے کا تناؤ کچھ کم دیکھ کر اور ماحول کو بہتر کرنے کے لیے اس نے مذاقیہ انداز میں پوچھا ''ملانی صاحبہ......عبایا کے ساتھ اتنی سی دور کے لیے تم اسکارف بھی لوگی۔''

''مجھے ان کے بغیر گھر سے نکلنا عجیب لگتا ہے۔ مردوں کی نظریں جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں اور پھر میں ہیڈ کے پاس جا رہی ہوں، وہ پردے کے معاملے میں بہت سخت ہیں۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''اچھا بابا......جیسی تمہاری مرضی، اب دیر مت کرو اور چلو، مغرب کے بعد بچوں کو بھی ٹیوشن پر سے لینا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ٹیبل پر رکھی ہوئی اسکول کی چابی اور نسرین کی فائل اٹھائی اور باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے نسرین بھی چل دی۔

پلازہ کے گیٹ کے سامنے پہنچ کر دونوں موٹر سائیکل سے اترے، امجد نے پیٹرول کی ٹنکی پر بندھے بیلٹ سے فائل نکالی اور نسرین کو دیتے ہوئے اسے جلد آنے کی ہدایت کی، فائل لے کر اس نے ایک نظر اپنے عبایا پر ڈالی اور اسے درست کرتے ہوئے پلازہ کے اندر چلی گئی، اس کے جانے کے بعد امجد دائیں بائیں کے فلیٹوں میں نظریں دوڑانے لگا، مگر بالکونیوں کو خالی دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی اور وہ موٹر سائیکل کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اسی اثناء میں وہاں ایک رکشا آ کر رکا اور اس میں سے ایک خوش شکل اور خوش لباس عورت ہاتھوں میں شاپنگ بیگز اٹھائے اتری، وہ کچھ لمحوں کے لیے مبہوت ہو گیا، اس کی نادیدہ اور گڑھتی ہوئی نظریں اس کا سر سے پیر تک گہرائی کے ساتھ جائزہ لینے لگیں، وہ جب اس کے قریب سے گزری تو تیز خوش بو کے جھونکے نے اس کے اندر اٹھتے ہوئے طوفان میں مزید تلاطم پیدا کر دیا۔ مگر یہ تلاطم اس وقت جھاگ کی طرح بیٹھ گیا جب اس کی نظر عورت کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے مخالف سمت سے آنے والے مرد پر پڑی، وہ فوراً سیدھا کھڑا ہو گیا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا، اس دوران اسے سگریٹ کی شدید طلب محسوس ہوئی، اس نے پیکٹ نکالنے کے لیے جیسے ہی پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اسے پیکٹ کے ساتھ چابی کا بھی احساس ہوا ''اومائی گاڈ....اسکول کی چابی تو میری جیب میں ہی رہ گئی'' تاسف سے بھرا جملہ اس کے منہ سے نکلا۔ اور وہ گاڑی کو لاک کر کے تیزی سے اس بلاک کی جانب بڑھا جہاں نسرین گئی تھی، وہ دو دو اسٹیپ پھلانگتا ہوا زینہ چڑھنے لگا، فرسٹ فلور پر اسے وہ عورت پھر ملی مگر اب کی بار نسرین کے مل جانے کے خوف سے وہ اس پر توجہ دیئے بغیر آگے بڑھ گیا، چوتھے فلور پر پہنچ کر اسے مطلوبہ فلیٹ سامنے ہی نظر آ گیا۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑے رہ کر سانسیں درست کرنے لگا، اس کے بعد اس نے بیل بجانے کے لیے جیسے ہی ہاتھ آگے بڑھایا، اسے دروازے سے قریب ہوتی ہوئی نسرین کی مدھم آواز آئی:

''میں امجد کے ہاتھ چابیاں بھیجتی ہوں سر، مگر آپ کل گیارہ بجے یہاں پہنچ جایئے گا'' امجد نے فوراً اپنا ہاتھ یہ سوچ کر نیچے کر لیا کہ وہ باہر آ رہی ہے، مگر دوسرے ہی لمحے ہیڈ کی آواز ابھری ''پہنچ جاؤں گا میری جان'' ہیڈ کا جملہ سن کر امجد کو ایسا لگا جیسے انہوں نے نسرین کو اپنی بانہوں میں بھر لیا ہو، یہ سوچ کر اس کا سر چکرانے لگا، اس کے جسمانی نظام میں کہیں کوئی گڑبڑ پیدا ہو گئی تھی، دل کی دھڑکنیں تیز اور اس میں عجیب بے چینی اور ہلچل سی پیدا ہونے لگی، اسی دوران اس کی بیوی کی خوابیدہ آواز پھر اس کے کانوں سے ٹکرائی

''سر چھوڑیں پلیز......کیوں میری حالت خراب کر رہے ہیں، میں کل آؤں گی ناں''

یہ سننا تھا کہ امجد کے دل میں لہو کا ایک سونامی اٹھا اور اس کے تلاطم نے پلک جھپکتے میں، جسم کی شریانوں کو تہس نہس کر دیا اور وہ پسینے میں شرابور، ایک ہاتھ سے سینے کو پکڑے، دروازے کی چوکھٹ کے کنارے سے ٹکراتا ہوا زمین پر آ گرا۔

''روشنی کا اسیر''

منظر ایوبی
(کراچی)

یہ کرشمہ سازی عشق کی مری جان زندہ نظیر ہے
جو امیر تھا وہ امیر ہے، جو فقیر تھا وہ فقیر ہے

مری خواہشوں کی بساط پر یہ جو ایک سرخ لکیر ہے
یہی ایک سرخ لکیر تو نئے موسموں کی صفیر ہے

نہ وہ سرزمیں، نہ وہ آسماں مگر آج بھی سرِ دشتِ جاں
وہی مشک ہے، وہی پیاس ہے، وہی ہاتھ ہے وہی تیر ہے

مرے ہم سخن مرے ہم زباں، بڑے خوش بیاں، بڑے خوش گماں
کوئی ظلمتوں کا غلام ہے، کوئی روشنی کا اسیر ہے

کسی لب پہ حرفِ ستم تو ہو، کوئی دکھ سپردِ قلم تو ہو
یہ بجا کہ شہرِ ملال میں کوئی درد ہے کوئی میر ہے

جسے چاہا سر پہ بٹھا لیا ، جہاں چاہا حشر اٹھا دیا
نہ لحاظِ منصبِ عشق اسے، نہ خیالِ پاسِ ضمیر ہے

مرے حوصلوں کو نہ آزما، دکھا اپنے ہاتھ کا معجزہ
اگر اب بھی ترکشِ جبر میں مرے نام کا کوئی تیر ہے

ہوئے اب کے بار جو بے مکاں، نہیں مل سکے گی کہیں اماں
نہ کوئی زمین حفیظِ جاں، نہ فلک ہمارا نصیر ہے

کہیں خونچکیدہ ہے مامتا کہیں سرخمیدہ ہے باپ کا
ہے یہ عہدِ تازہ کا معجزہ کہ ہر ایک بچہ یسیر ہے

یہ عجیب رخ ہے حیات کا، نہیں منزلوں سے جو آشنا
وہی راستے کا چراغ ہے وہی قافلے کا امیر ہے

○

تفتہؔ زاری
(کروکھیشتر، بھارت)

کبھی نفرت پہ مبنی تجزیا اچھا نہیں ہوتا
شکستہ آئینے میں دیکھنا اچھا نہیں ہوتا

خود اپنی زندگی بھی تو مرکب خامیوں کا ہے
کسی کی زندگی میں جھانکنا اچھا نہیں ہوتا

کسی کو جتنا جانو گے محبت اُتنی کم ہوگی
کسی کو حد سے بڑھ کر جاننا اچھا نہیں ہوتا

بڑا تیراک ہی تو ڈوبتا ہے گہرے پانی میں
ضرورت سے زیادہ حوصلہ اچھا نہیں ہوتا

اگر میٹھا ہے، اُس کے ساتھ کھٹا بھی ضروری ہے
کہ اِک ہی زندگی میں ذائقہ اچھا نہیں ہوتا

کسی کے ڈوبنے کی بھی یہ کرسکتا ہے غمازی
کھڑے پانی میں اٹھتا بلبلہ اچھا نہیں ہوتا

عمل سے بھاگنے کی جو ہمیں ترغیب دیتا ہے
کسی پہلو سے بھی وہ فلسفہ اچھا نہیں ہوتا

اسے ہم کھینچ تو لیتے ہیں اپنے چار سو لیکن
کسی صورت انا کا دائرہ اچھا نہیں ہوتا

مصائب لاکھ ہوں تفتہؔ! مگر اپنا عقیدہ ہے
جہاں سے اور خود سے بھاگنا اچھا نہیں ہوتا

○

محمودالحسن

(راولپنڈی)

وارفتگیٔ شوق کا اظہار کریں ہم
دل کھول کراب کیوں نہ اُنھیں پیار کریں ہم

پہنائیں دل و جاں کو محبت کا لبادہ
پھر حوصلہِ تابِ رُخِ یار کریں ہم

اک عمر گذاری ہے رہِ راست پہ ہم نے
اب پیرویِ جُبّہ و دستار کریں ہم!

جس جُرم کی پاداش میں پہنچے ہیں سرِ دار
اے کاش وہی جُرم کئی بار کریں ہم

آسودگیِ جاں سے نہیں ہم کو سروکار
پیوست رگِ جاں میں کوئی خار کریں ہم

ہوں پیشِ نظر عارض و گیسوئے محمدؐ
دن رات ثنائے شہِ ابرارؐ کریں ہم

تسکینِ دل وجاں کی ضرورت ہےتو پھر کیوں
محمّود غمِ اندک وبسیار کریں ہم

○

مظفرحنفی

(دہلی، بھارت)

چراغ اپنے ہوا دینے سے پہلے
جلانے تھے بجھا دینے سے پہلے

میاں کیا لازمی تھا خاک اُڑانا
کسی کو راستا دینے سے پہلے

نسیمِ صبح کو آیا پسینہ
خزاں کو بدعا دینے سے پہلے

ملا سکتے ہو کیا ہم سے نگاہیں
بغاوت کی سزا دینے سے پہلے

مناسب ہے کہ پڑھ لی جائے تختی
کسی در پر صدا دینے سے پہلے

ہمارا ہارنا طے ہو چکا تھا
تمہارے ہاتھ اٹھا دینے سے پہلے

سخی مشہور تھے ہم بھی مظفّر
مگر سب کچھ لٹا دینے سے پہلے

○

سید مشکور حسین یاد

(لاہور)

صبح سے شام تک شعور شعور
نور سے نام تک شعور شعور

عام سے خاص تک خُمار خُمار
خاص سے عام تک شعور شعور

ایک مصروفیت ہمہ تحریک
کام سے کام تک شعور شعور

نشہ سے نشہ تک جہاد جہاد
جام سے جام تک شعور شعور

اک بلندی کہ سر بلندیٔ جاں
بام سے بام تک شعور شعور

ہے نشانہ سے تا نشانہ یادؔ
نام سے نام تک شعور شعور

○

مہندر پرتاپ چاند

(انبالہ، بھارت)

نہ جانے، شہرِ دل اب اور کتنا ترسے گا!
کب اُس کا ابرِ کرم اِس زمیں پہ برسے گا؟

بُجھا رہا ہے جو تُو آج بے کسوں کے چراغ
ترا مکان بھی کل روشنی کو ترسے گا!

عجیب دور ہے! لیکن وہ دن بھی آئیں گے
ہر ایک شخص خلوص و وفا کو ترسے گا

چلا ہے چھوڑ کے تُو آج جس خرابے کو
مِرا یقیں ہے اسی سر زمیں کو ترسے گا

سرُور بخش تھے کتنے وہ دن مُرادوں کے
مگر یہ دل اب اُسی سرخوشی کو ترسے گا

پُرانے وقتوں کی قدروں کی اُف یہ پامالی!
اِنہیں کو لازماً اِک دن زمانہ ترسے گا

جو کل کو ٹُوٹے گا تیری اِس آگہی کا غرور
بے اختیار مری گُم رہی کو ترسے گا

رفاقتوں کا سفر چاندؔ! کھو گیا یکسر
اب عمر بھر تُو اس اک رہ گذر کو ترسے گا!

○

سُرور انبالوی
(راولپنڈی)

تخیّل کے دریچوں سے وہ باہر ہی نہیں آیا
کہ دل کے آئینہ میں اُس کا جوہر ہی نہیں آیا

کبھی یہ گھٹ گیا قد سے کبھی یہ بڑھ گیا قد سے
مرا سایہ کبھی میرے برابر ہی نہیں آیا

جسے لیکر میں خاک وخون کے دریا سے گزرا تھا
اُٹھانے کے لیے مجھ کو وہ لشکر ہی نہیں آیا

مری غُربت کی بابت سُن لیا تھا میرے بھائی نے
مری آواز سُن کر گھر سے باہر ہی نہیں آیا

لہُو میں تر زباں جب پتہ پتہ کی نظر آئی
پرندہ آشیانہ میں پلٹ کر ہی نہیں آیا

چٹانوں میں تری صورت کے پیکر اب بھی خفتہ ہیں
ہماری کم نصیبی کوئی آذر ہی نہیں آیا

مری دیوانگی میں پختگی آئی نہیں شاید
کہ میرے سر پہ ابتک کوئی پتھر ہی نہیں آیا

اُترنا پڑتا ہے اس کے لیے گہرے سمندر میں
لبِ ساحل کسی کے ہاتھ گوہر ہی نہیں آیا

سرؔور انبالوی دستار کی تم بات کرتے ہو
سلامت لوٹ کر بازار سے سر ہی نہیں آیا

○

آصف ثاقب
(بوئی، ہزارہ)

دل کے ہاتھوں یہ آنکھ دریا ہے
جس میں اک اک سراب بہتا ہے

میرے سینے میں آگ ہے بھر دی
اُس نے "شبنم" سے مجھ کو پوچھا ہے

صحنِ گلشن میں شعر کہتا ہوں
داد دینے کو چاند اُترا ہے

ریزہ کاری ہے میرے سینے پر
کوئی کانٹا گلاب لکھتا ہے

شعر پڑھتے یہ حال ہے اپنا
ذہن جلتا ہے دل سسکتا ہے

دل کا ثاقبؔ معاملہ کچھ تھا
ہاتھ جانے کچھ اور لکھتا ہے

○

غالب عرفان

(کراچی)

چل پڑا ہے اب سفینہ دھار پر
بجھ گئی ہے روشنی مینار پر

وادیِ مغرب میں سورج خونچکاں
عکس اُس کا مشرقی دیوار پر

کٹ گیا ہے روشنی کا دائرہ
تیرگی ہے ذہن کے پرکار پر

سچ کی روشن صبح نو کے واسطے
جلوہ گر ہے زندگی پھر دار پر

لمحہ لمحہ ارتکازِ زندگی
مرتکز ہے منتشر افکار پر

چہرہ چہرہ آرزوؤں کی تھکن
تیز تیشہ رکھ گئی پندار پر

رہبرِ منزل ہے سوئے ارتقاء
آگہی کی روشنی کردار پر

ہر طرف کی ظلمتوں کو روکنے
مطمئن ہیں کانچ کی دیوار پر

ٹوٹ کر بکھرے خودی کے سوگ میں
مصلحت آمیز اک انکار پر

خونِ دل کی قدر عرفاںؔ دیکھئے!
چند سکّے فن کے اک شہکار پر

○

پرواز انبالوی

(بھارت)

چمن تو کیا مجھے اک ریگزار تک نہ مِلا
گلوں کی بات کیا دنیا میں خار تک نہ مِلا

میں جَل بُجھا تھا کبھی اپنے سوگ میں ایسے
مری چِتا کا کسی کو شرار تک نہ مِلا

قرار کیا مُجھے ملتا کہ اُس ستم گر سے
فرار مانگنا چاہا فرار تک نہ مِلا

سفر میں کوئی مجھے ہم وطن تو کیا مِلتا
سفر میں کوئی غریب الدّیار تک نہ مِلا

فنا کی جب چلی آندھی تو جسم کا کیا ذِکر
کہ دُور دُور دلِ بے قرار تک نہ مِلا

کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ مثالِ گم شُدگی
مرا ہُوں ایسے کہ میرا مزار تک نہ مِلا

لُٹا ہے قافلہ ہستی کا میری یُوں پرواز
کہ راستوں کا بھی گرد و غبار تک نہ مِلا

○

صفوت علی صفوت
(امریکہ)

برف ہلکی ہلکی ہے صبح کے اجالوں میں
شام بہکی بہکی ہے دُور تک ستاروں میں

زندگی کی آمد ہے پھر بہشت زادوں میں
منزلِ ملائک پر کوثری نظاروں میں

عرش سے اگر دیکھوں اک مزار ہے دنیا
دفن ہوتے رہتے ہیں روز ہی ہزاروں میں

نونہالِ نیو ٹاؤن، آج اُنکی ہے برسی
اب بھی ہے وہ بےچینی اُن سبھوں کی ماؤں میں

حکم ہے فرشتوں کو، پڑ گئے ہیں کم جھوٹے
اک نیا ہے بازیچہ، خُلد کے تماشوں میں

فلسفے کی باتوں میں کھو نہ جائیں پھر صفوتؔ
ختم کر رہے ہیں سو آپ کی دعاؤں میں

○

پہلی جماعت کے بیس (۲۰) بچوں کے قتل کی برسی پر

صدیق شاہد
(شیخوپورہ)

جلتا رہا ہے قلب کا گرچہ بہت لہو
روشن تو کر کے دیکھ تو، قندیلِ آرزو

سروِ رواں ہے وہ گل و نرگس بھی ہے مگر
انساں کے روپ میں کبھی آ بیٹھے رُوبرو

ہم لُٹ گئے سماج کے ہاتھوں وگرنہ آج
کھُلتی ہمارے دوش پہ وہ زلفِ مشک بو

لازم ہے اس افق سے وہ سورج نکل پڑے
جس کا فروغ لوٹ لے ظلمت کی آبرو

جو پتے برگ و ساز تھے اگلی بہار کا،
گلشن میں اڑتے پھرتے ہیں بےکل سے چارسُو

دشوار رہ گزار ہے اور دُھوپ بھی کڑی
اب اور کیا خیال ہے اے شوقِ جستجو

کیا قہر ہے کہ شعلہ کی طرح بھڑک اٹھے
جو شخص ہے ستارہ و شبنم کی آبرو

شاہدؔ وہ اپنی راہ کا کانٹا کہے مجھے
میرے لبوں پہ رہتی ہے اس کی ہی گفتگو

○

نسیم سحر
(راولپنڈی)

خواب سے عشق کبھی خواب کی تعبیر سے عشق
عمر بھر مَیں نے کیا حلقۂ زنجیر سے عشق

یوں تو مَیں معتقدِ غالبؔ و اقبالؔ بھی ہوں
درحقیقت ہے مجھے میر تقی میر سے عشق

اِک شہادت کی روایت کے تسلسل میں کیا
اپنے سینے کی طرف آتے ہوئے تیر سے عشق

جانتے ہیں وُہ مسافر ہے، گزر جائے گا
راستے کرتے نہیں ہیں کبھی رہگیر سے عشق

اور پھر ایسا ہؤا، مَیں ہی تھا سب سے آگے
گرچہ آغاز تو مَیں نے کیا تاخیر سے عشق

کاش رہنے لگوں بے چین میں پہلے کی طرح
کاش ہو جائے دوبارہ کسی تدبیر سے عشق

اِک فقط یار سے کیا، ہم کو تو کچھ اور بھی ہے
مدحتِ یار میں لکھی ہوئی تحریر سے عشق

آیتِ عشق کی تفہیم ہوئی جب، تو ہؤا
آیتِ عشق کی لکھی ہوئی تفسیر سے عشق

مُجھ سے وُہ اِتنا گریزاں تو نہ رہ سکتا تھا
شاید ایسا ہے کہ محروم ہے تاثیر سے عشق

وحشتِ عشق میں ممکن ہے کہ ہو جائے نسیمؔ
اپنے حلقوم پہ چلتی ہوئی شمشیر سے عشق

○

جاوید زیدی
(نیویارک)

خزاں میں کھلتا ہوا پھول خود سوال ہی تھا
کھلا یہ باغِ جہاں بھی عجب جمال ہی تھا

ترے جمال کا قصہ رہا نصابوں میں
یہ کائنات کی تخلیق بھی وصال ہی تھا

بچھڑ کے تجھ سے جو دنیا کو ڈھونڈنے نکلے
لگا کہ جشنِ بہاراں میں بھی ملال ہی تھا

منافقت کی فضاؤں میں معجزہ بھی ہوا
مِلا وہ شخص جزیرہ نما، مثال ہی تھا

چلتے تھے کوفۂ جاں پرچم قلم لے کر
ہنر یہ زیست کا زیدیؔ کھلا کمال ہی تھا

○

اشرف جاوید

(لاہور)

دل سمجھتا ہے کہ میں اُس کو بھُلا بیٹھا ہوں
بیٹھے بیٹھے ہی نیا روگ لگا بیٹھا ہوں

لطف تو جب تھا، اُسے جیت کے بیٹھا ہوتا
سارا کچھ ہار کے بیٹھا ہوں، تو کیا بیٹھا ہوں

وہ، اگر لوٹ کے آئے بھی، تو حاصل کیا ہے!
کوئی دم سائے میں، چلنے کو رُکا بیٹھا ہوں

زندگی روز تو رستہ نہیں دینے والی !
سارے پتے ہی مقابل کو دکھا بیٹھا ہوں

صف بہ صف یادوں کے پروانے اُمڈ آئے ہیں
خالی کمرے میں کوئی شمع جلا بیٹھا ہوں

کوئی کھوٹا ہی سہی، دید کا سکہ مِل جائے!
کاسۂ چشم لیے راہ میں آ بیٹھا ہوں

دستِ قاتل میں بھی دَم، خنجرِ قاتل میں بھی خم!
اور پھر میں ہوں کہ راضی بہ رضا بیٹھا ہوں

خواب و ناخواب میں تفریق مٹی جاتی ہے
نیند اُڑا بیٹھا ہوں، ہر طاق بجھا بیٹھا ہوں

عشق کرنے کا ہُنر بھی ہے، سلیقہ بھی ہے
صحبتِ میر میں کچھ روز اُٹھا بیٹھا ہوں

○

سلیم ناز

(کراچی)

تمہیں تو اضطرابِ دل تمہیں مرا قرار ہو
تمہیں سے بدگمانیاں تمہیں تو اعتبار ہو

تمہیں سکوتِ شامِ غم تمہیں نویدِ صبح دَم
تمہیں صدائے بازگشت تمہیں نئی پُکار ہو

تمہیں بہار و گل چمن تمہیں تو وادی و دَمن
تمہں تو موجِ بے نوا تمہیں تو آبشار ہو

تمہیں تو ایک رنگ و بُو تمہیں تو نورِ کُو بہ کُو
تمہیں تو ایک شخص ہو تمہیں تو بے شمار ہو

تمہیں تو تیرگی شب تمہیں سپیدیٔ سحر
تمہیں تو راز سر بہ سر تمہیں تو آشکار ہو

تمہیں تو لغزشِ حیات تمہیں متاعِ زندگی
تمہیں تو ایک بھول ہو تمہیں تو یادگار ہو

تمہیں خیال و واہمہ تمہیں یقینِ جسم و جاں
تمہیں تو نقشِ منتشر تمہیں تو شاہکار ہو

○

کامریڈ

نیّر اقبال علوی

(لاہور)

وہ بہت برے طریقے سے کھانس رہا تھا اور کھانسنے میں اسے سخت تکلیف کا سامنا تھا لیکن۔۔۔کوئی اس کی جانب توجہ مبذول نہ کر رہا تھا۔

کیونکہ۔۔۔کھانسی بھی اب آہوں، سسکیوں اور چیخوں کی مانند سماج میں قابلِ توجہ شے نہیں رہ گئی تھی، قریب آ کر اس نے ہانپتی سانس اور کانپتی ہوئی آواز سے اللہ نواز کو پکارا۔

سردی، تاریکی اور لوگوں میں قوتِ خرید نہ ہونے کی وجہ سے بازار سُونا سُونا لگتا تھا، اور دکانیں معمول سے قبل بند ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ سکوٹر اور موٹر سائیکل مرمت کرنے والی دکان کے برآمدے میں روزانہ محفل جمتی۔۔۔ یار دوست دائرے کی شکل بناتے، تسلے میں دہکتے کوئلے رکھے مایوس کن ملکی حالات اور متعفن سیاست پر بات چیت کر رہے تھے۔

غیر منصفانہ، غیر مساواتی اور ظالم سماج کی کوکھ سے سدا یاسیّت، غیر مہذب اور متشدّدانہ رجحانات ہی جنم لیا کرتے ہیں۔ ایسے میں ظاہر ہے کہ ان معاشروں کے باسیوں کو گفتگو کے لیے بھی ہی عنوانات میسر ہوتے ہیں۔

سروں پر لٹکے مغموم و بے نور قمقمے کی مدھم روشنی میں لٹھے کا کُرتا، میلی سی تہبند، تلے کی کڑھائی والا پرانا کھُسا، جو گرد و غبار میں اٹ کر اس کے پیروں جیسا ہو گیا تھا۔ رَلی کی واسکٹ جو شدید پالے کو اس کے کمزور و ناتواں جسم پر روکنے کے لیے سراسر ناکافی تھی۔ سر پر کروشیے سے بُنی ہوئی سفید ٹوپی، بیمار اور مضمحل سیاہ چہرے پر سرخ آنکھیں جن میں غالباً شکستہ ارمانوں اور بے خوابی کی لالی تھی، اور چھوٹی چھوٹی سفید داڑھی جو اس کے بے رونق پژمردہ چہرے کو بشاش و شاداب بنانے کی مقدور بھر سعی کر رہی تھی۔

گذرے ہوئے شب و روز کی بدحالیاں اور بے خوابیاں اس کے لباس پر عیاں سلوٹوں سے باہر جھانک رہی تھیں۔ ٹوپی سے باہر بکھرنے والے بالوں پر بازاروں کی اُڑتی ہوئی خاک کے ساتھ ساتھ بے چارگی اور ناداری کی دُھول بھی ڈیرے جمائے ہوئے تھی۔

اس کا بدن ایسے مسافر کا جثہ تھا جس نے زادِ راہ کی بغیر طویل اور صبر آزما سفر طے کیا ہو، فقط اُمید کے زور پر۔۔۔ خوبصورت آرزو کے پیشِ نظر۔۔۔ مگر۔۔۔ بے سُود۔۔۔ بے کار۔۔۔ سب رائیگاں۔۔۔ منزل جس کو پھر بھی نہ مل سکی ہو۔

وہ انتہائی تھکا تھکا، پشیمان اور کربِ دروں سے دو چار دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے۔۔۔ لامتناہی صحراؤں میں۔۔۔ بھٹکا ہوا مسافر۔۔۔ اور چاروں اطراف میں منڈلاتے ہوئے مُردار خور۔۔۔ گِدھ۔ وہ ابھی تک کھانس رہا تھا۔

اللہ نواز۔۔۔ ابھی آیا کہہ کر اُٹھ گیا۔

کھانسنے والا اس کو لے کر ایک نیم تاریک گوشے میں چلا گیا۔ چند منٹوں کی گفتگو کے بعد اُس نے اُبھری ہوئی نسوں والا بے جان سا ٹھنڈا ہاتھ مصافحے کے لیے اللہ نواز کے صحت مند، توانا اور گرم ہاتھ میں دیا اور۔۔۔ کھانستا ہوا آہستہ آہستہ سڑک کے ساتھ چلتے چلتے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ جس طرح ہلکی ہلکی، دبی دبی سسکیاں بے ہنگم شور کے چڑوں میں سرایت کر جائیں۔

محفل میں واپس آ کر اللہ نواز کوئلوں کے سینک پر دوبارہ اپنے ہاتھ تاپنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر تنی چُپ کی چادر نے اس کی قوتِ گویائی کو ڈھانپ رکھا تھا۔

یہ بزرگ کون تھے؟

میں نے اس کی افسردہ آنکھوں کو کھوجتے ہوئے دریافت کیا۔ اللہ نواز میرے سوال پر متعجب ہو کر بولا تم نے نہیں پہچانا۔۔۔ اسے؟

نفی میں سر ہلتے دیکھ کر جھٹ سے بولا۔

کامریڈ طفیل۔۔۔ یار وہی۔۔۔ طفیل بند مکھن!

اسحاق نے پوچھا وہ یہاں کس لیے آیا تھا؟

اللہ نواز نے بتایا چند ماہ قبل اس کی بیوی چل بسی۔ اُس وقت سے شدید علیل ہے۔ اس کی تپ دِق آخری اسٹیج پر ہے۔ مفلسی و عُسرت کی وجہ سے سودمند اور بہتر علاج نہ ہو سکا۔ بے چارہ بڑی انا اور غیرت والا ہے۔ دو روز سے فاقہ زدہ تھا، اس کو ادویہ کی اشد ضرورت ہے۔ آپ میں سے یا اگر آپ کا کوئی ملنے والا اس کی مالی اعانت کرنا چاہے تو۔۔۔

پر اس کا بیٹا تو خود اچھے عہدے پر فائز ہے۔ اس کو اپنے ضعیف و علیل باپ کا خیال رکھنا چاہیے۔ مولوی سلامت نے اللہ نواز کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

یار دوست اس کے بارے میں نہ جانے کیا کیا باتیں کرنے لگے مگر میں ان سے بے نیاز ہو کر عالمِ تصورات میں کئی برس پیچھے کی طرف لوٹ گیا۔

تب۔۔۔ میں پانچویں یا چھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔ بستی میں ابھی بجلی نہیں آئی تھی۔ گھُپ اندھیروں کے باوجود کبھی چوری یا ڈاکے کی وارداتیں نہ ہوتیں۔ غالباً لوگوں کو ابھی اچھی طرح دیکھنا نہ آیا تھا، یا شائد اُجلی اور چمکدار چیزوں کی ملمع کاری دیکھ کر ان کی رالیں ٹپکنا شروع نہ ہوئی تھیں۔ لہٰذا اہلِ بستی بڑے امن، شانتی اور بھائی چارے کی فضا میں رہتے تھے۔

علی الصبح چمکتی، لشکتی ہرکولیس سائیکل کے کیریئر پر جست کا مستطیل صندوق نما ڈبہ، جس کے دونوں اطراف میں شیشہ لگا ہوا تھا۔ اس شوکیس میں تازہ بند، ڈبل روٹیاں، لائل پور ڈیری فارم کے مکھن کی چھوٹی، بڑی ٹکیاں، دیسی

مرغیوں کے انڈے رکھے، سانولی رنگت، مضبوط پنڈے، کشادہ پیشانی، اونچے لمبا قد کاٹھ، بائیں گال پر موکا، موٹی موٹی سیاہ آنکھوں میں سرخ ڈورے، تازہ بند نما چہرے لیے۔۔۔محمد طفیل۔۔۔

''تازہ بند مکھن اے۔۔۔ڈبل روٹی۔۔۔دیسی مرغی کے انڈے'' کا زوردار اور با آوازِ بلند الاپ کرتا تازہ ہوا کے جھونکے کے مانند بستی کا چکر لگاتا۔ عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے حسبِ ضرورت ناشتے کی اشیا خریدتے۔ صبح صبح ہر ایک سے پیار واخلاق کا مظاہرہ کرتے کرتے چیتے کی سی پھرتی کے ساتھ ارد گرد کی بستیوں اور محلوں میں چلا جاتا اور یوں آہستہ آہستہ وہ۔۔۔محمد طفیل سے۔۔۔طفیل بند مکھن بن گیا۔

اللہ نواز نے میرا کاندھا دبایا تو میں ماضی سے حالی میں وارد ہوا۔

پہچان لیا۔۔۔یا نہیں؟ اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

چونکہ وطن چھوڑ کر میں یورپ میں جا بسا تھا اس لیے سالوں بعد جب چھٹی پر آنا ہوتا تو ارد گرد کے حالات و واقعات کو جاننا اور سمجھنا بالکل اُسی طرح ہوتا جیسے بچپن میں ماسٹر صاحب کہا کرتے، چلو بچو! خالی جگہ۔۔۔پُر کرو۔

حالات سے ناواقف جان کر میری معلومات میں اضافہ کرنے کی خاطر اللہ نواز کہنے لگا۔ وارث صاحب! روٹی، کپڑا اور مکان کی خاطر جب لوگ ہاتھوں میں سُرخ جھنڈے اٹھائے سمت کے تعین کے بغیر دوڑے تو محمد طفیل بھی ساتھ ہولیا۔ وہ اتنی مستعدی اور تیزی کے ساتھ دوڑا کہ پھر اس کو گھر بار کی فکر رہی، نہ کاروبار کا خیال۔۔۔نہ بال بچوں کی پرواہ۔ بس ایک اعلیٰ مقصد کے حصول کی خاطر آنکھیں بند کیے دوڑتا چلا گیا۔ اتنی دور۔۔۔اتنی دور۔۔۔کہ جہاں پہنچ کر وہ طفیل بند مکھن نہ رہا بلکہ طفیل کامریڈ بن گیا۔

روٹی، کپڑا اور مکان حاصل کرنے کے بجائے پولیس کی لاٹھیاں، ان کے ٹھڈے کھائے۔ آنسو گیس کے مرغولے نگلے، کئی کئی روز بھوک ہڑتالیں کیں اور سال ہا سال مکان کے بجائے جیل کی تنگ و تاریک بدبودار کوٹھریوں میں اپنے مقصد سے وابستگی کی خاطر بند رہا۔ ان صعوبتوں اور تکلیفوں نے اس کی ثابت قدمی اور پائے استقامت میں لغزش نہ آنے دی۔ بلکہ وہ ہمیشہ ایک سچا، پکا، مخلص اور ایماندار۔۔۔طفیل کامریڈ۔۔۔رہا۔

تسلے میں دہکتے ہوئے کوئلے کتنی دیر سے حرارت لٹا کر ٹھنڈی و بے جان سفید راکھ میں تبدیل ہو چکے تھے اور۔۔۔سردی نے اپنے زور پر محفل کو تتر بتر ہونے پر مجبور کر دیا۔

آئندہ شام کا موسم، شام گذشتہ کی مانند ہی تھا۔ سوگوار اور زندگی کی رمق سے خالی اور۔۔۔وہ بھی کل کی نسبت آج زیادہ ٹوٹا ہوا، مزید دل گرفتہ، کھانسی کے طویل دوروں میں گھرا ہوا دکھائی دیا۔ اُس وقت اللہ نواز، مولوی سلامت اور میرے سوا وہاں اور کوئی موجود نہ تھا۔

اپنے لہو کی تپش سے محروم، بدن کو گرمانے کے لیے وہ ہمارے قریب آن بیٹھا اور آگ تاپنے لگا۔ سانس لینے میں اُس کو اسی جدوجہد کا سامنا تھا جو کسی بھوکے کو پیٹ بھرنے کے لیے کرنی پڑے۔

مجھے اندازہ ہوا کہ زندگی کے نشیب و فراز پر وہ اتنا بھاگا ہے کہ اب تک اُس کا سانس نارمل نہیں ہو پا رہا۔۔۔پھر۔۔۔یک لخت مجھے خیال آیا کہ اسے سردی کی شدت سے نمونیا تو نہیں ہو گیا؟ لیکن میں خاموش رہا۔

حال احوال پوچھنے کے بعد اللہ نواز مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہنے لگا۔ یہ بڑے مخلص اور اچھے دوست ہیں، آج کل دگرگوں حالات سے دوچار ہیں۔ انہیں ادویہ کے لیے کچھ رقم کی ضرورت ہے۔

یہ بات سن کر کامریڈ بگڑ گیا۔ اپنی عزت وانا کو خاک میں ملتے ہوئے دیکھ کر اس نے اللہ نواز کو بے تحاشہ مغلظات سے نوازا۔ اکھڑے ہوئے سانس کے ساتھ اُس کی خوب سرزنش کی۔ اس سے پہلے کہ وہ وہاں سے اُٹھ کر چلا جاتا۔ اللہ نواز نے اس کی کمزور کلائی پکڑتے ہوئے لجاجت کے ساتھ شانت کیا اور پھر بتایا کہ کامریڈ، یہ کوئی غیر نہیں اپنا وارث ہے۔ وارث۔۔۔باؤ جی کا بڑا بیٹا۔۔۔یہ یورپ میں ہوتا ہے، تُو اس کو بھی اپنے بیٹے کی طرح سمجھ۔

اس اثنا میں میں نے اسے پانچ سو روپے جیب سے نکال کر دیے۔ جنہیں بڑی منت وسماجت کے بعد وہ قبول کرنے پر رضامند ہوا۔ بادلِ نخواستہ بہ حالت مجبوری نوٹ اسے نے بنڈی کی جیب میں رکھ لیے۔ آنسو بھری آنکھوں سے اس نے میرے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا، شائد اسے اپنا بیٹا یاد آ گیا۔

وہ میرا شانہ دباتے ہوئے بولا۔

بیٹا وارث! تیرا باپ بہت نیک اور خدا ترس انسان تھا۔ وہ بھی اپنے نظریے کا حامی تھا۔ بڑے پکے، سچے اور مضبوط کریکٹر کا مالک۔۔۔کَرا آدمی تھا۔ میں نے اس کے ساتھ کئی مرتبہ جیل کاٹی۔

کھانسی کی شدت بار بار اس کی بات کاٹ دیتی۔

ذرا بے حجاب ہو کر کہنے لگا۔ تمہارے باپ نے اچھا کیا جو تمہیں باہر بھیج دیا ورنہ میں نے، اُس نے اور ہمارے جیسے لاکھوں، کروڑوں ہم وطنوں نے سرابوں کے پیچھے بھاگ بھاگ کر خود کو بے دم کر لیا۔ اپنے پھیپھڑے بے کار کروا لیے۔ تپ دق و کینسر اور دیگر موذی بیماریوں کا شکار ہو کر بے علاج ایڑیاں رگڑ رگڑ مر گئے اور۔۔۔نتیجہ؟ صفر۔۔۔سب بے کار۔۔۔وقت کا زیاں۔۔۔

مولوی سلامت جو پیشے کے اعتبار سے کلرک، جبکہ دائیں بازو کے نظریات سے وابستہ تھا، کامریڈ کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

تم اپنی بات کرو۔ روٹی، کپڑا اور مکان کے لیے تم سرابوں کے پیچھے بھاگے ہو۔ سب کو اس فریب میں مت شامل کرو۔

کامریڈ زہریلی ہنسی ہنس کر گلے میں آئے بلغمی لوتھڑے کو نگلتے ہوئے کہنے لگا۔

مولوی! جس طرح سُرخوں نے اینگلز، مارکس اور لینن کے دلفریب

اور مساوات پرمبنی فلسفے کر فقط اپنی تحریروں اور تقریروں کو سجانے اور غریب ولاچار عوام کو پُر امید اور سنہرے خواب دکھانے کے لیے استعمال کیا، اُسی طریقے سے تیرے ناخداؤں نے بھی دین اور قرآن کے مسلمہ اصولوں کو صرف نعرہ بازیوں، معصوم وسادہ لوح لوگوں کے جذبات ابھارنے، ان کو اشتعال دلانے، انہیں اپنے مفادات کے حصول کے لیے بری طرح سے برتا بلکہ وہ تو ایک قدم اور آگے بڑھے اور بارہا اپنے دشمنوں کے آلہ کار بننے سے بھی باز نہ آئے۔

جس ہجوم میں میں بھاگ رہا تھا اس میں تم بھی میرے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ میں نے متعدد بار تمہیں اپنے ساتھ دیکھا۔ مفلوک الحالی میں، مالی پریشانی میں، روزگار کے مسئلے میں، بچوں کے مستقبل کی فکر میں، انصاف کے حصول میں، بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کی بپتا میں، جلتی دھوپ میں ادائیگی بل کی غیر انسانی لمبی لمبی قطاروں میں، لوٹنے والے ڈاکٹروں کے منہ چڑاتے کلینکوں میں، ہر جگہ۔۔۔تم میرے شانہ بشانہ دوڑ رہے تھے۔ فرق بس اس قدر تھا کہ تم سدا دائیں جانب رہ کر دوڑے، جبکہ میں بائیں حصے میں شامل ہو کر بھاگا۔

مولوی سلامت! مجھے کامل یقین ہے کہ تم نے اگر دوڑتے وقت آنکھیں کھول رکھی تھیں تو تم نے ضرور دیکھا ہوگا کہ بائیں حصے میں سُرخ جھنڈے والے شہسوار تھے جب کہ دائیں حصے کو کنٹرول کرنے کے لیے لمبے لمبے بوٹ اور سروں پر فلیٹ ہیٹ پہنے کاؤبوائے گھوڑوں پر بیٹھے تھے۔ اور درمیان میں۔۔۔ درمیان میں تیسری دنیا کے تیرے میرے جیسے کروڑوں، اربوں بھوکے، پیاسے، کمزور، لاغر، بیمار، بے حال، لٹے پٹے، تعلیم سے بے بہرہ انسان نما جانوروں کا سہا ہوا ہجوم روٹی، کپڑے اور مکان کی تلاش میں ننگے بدن اور برہنہ پا دوڑ رہا تھا۔ دائیں اور بائیں جانب کے شہسواران کو بھیڑ بکریوں کے مانند ہانکے جا رہے تھے۔ دوڑتے دوڑتے اگر کوئی گروہ اس ہجوم سے الگ ہونے کی جسارت کرتا تو ایک طرف سے جبر واستبداد کا زوردار کوڑا تڑاخ سے اس کی پیٹھ پر پڑتا، جبکہ ظلم اور استحصال کے تیل میں بھیگے ہوئے دُرّے سے کاؤبوائے اس کے سوکھے جسم کی کھال ادھیڑنے لگتے۔ اور اس کو پھر سے ہانک کر ریوڑ میں دوبارہ واپس لے آتے۔

بول بول کر وہ ہانپنے لگا تھا۔ سانس اکھڑ رہا تھا، جیسے ہوا پر بھی آہستہ آہستہ اس کا حق ختم ہوا جا رہا ہو۔ میں اس بوڑھے کی تجربہ کاری اور ژرف نگاہی پر دل ہی دل میں اسے داد دے رہا تھا۔ دھیمے لہجے میں وہ مولوی سلامت سے پوچھنے لگا۔

سچ بتا مولوی ڈنڈی مت مارنا تو نے پچپن برسوں میں دائیں طرف سے کیا حاصل کیا؟ وہی نا؟۔۔۔جو میں بائیں بازو سے پا سکا۔

تیرے چھ بچے زندہ ہیں اور ساتواں ہونے والا ہے۔ میرا ایک زندہ ہے جبکہ۔۔۔ چھ مر گئے۔ تیری گھر والی زندہ ہے اور میری۔۔۔ مجھے چھوڑ گئی اور جاتے ہوئے مرنے سے چند گھڑیاں قبل مجھے مخاطب کر کے کہنے لگی۔۔۔

''کامریڈ! میرا وقت آ گیا ہے۔۔۔ پر۔۔۔اُڑیا۔۔۔ مجھے اپنے جانے کا غم نہیں۔۔۔غم اور دُکھ تو صرف اس بات کا ہے کہ تیرے باجوں تیرے دانے رُل جان گے۔''

کامریڈ کی آواز رُندھ گئی۔ فضا پر سکوت طاری تھا اور میں نے دیکھا کہ آنسوؤں کے قطرے اس کی سفید دودھیا داڑھی میں موتیوں کی طرح جھلملا رہے تھے۔ ہم بھی اپنی آنکھیں خشک کرنے لگے۔ اس کے منہ سے بڑی حسرت ناک۔۔۔ہائے بلند ہوئی اور۔۔۔ پھر وہ کھانسنے لگا۔

سچ مانو تو ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اس کشتی کے جس کے چپوار ہوں نہ بادبان۔ ذرا ستانے کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

یار مولوی! تم نے دیکھا۔ بھاگتے بھاگتے تھکن، پیاس، بھوک، کمزوری یا زخموں سے چُور چُور کوئی گر جاتا تو بھاگنے والی ساری خلقت کس بے دردی اور لاپروائی سے اس کو اپنے پاؤں تلے کچلتی چلی جاتی تاوقت کہ گرنے والا اپنے خون میں نچڑے تڑپ تڑپ کر جان دے دیتا۔ عجیب بات ہے کہ سال ہا سال سے یہ خونی اور جابرانہ تماشاہ دیکھنے کے باوجود ہم جوق در جوق پھر بھی اس خونی دوڑ میں شامل ہوتے چلے جا رہے ہیں لیکن۔۔۔ یار سلامت! افسوس کی بات ہے کہ جب ریوڑ بڑھتا چلا گیا تو سارے مال کا اکیلا مالک رہنے کی خاطر کاؤبوائے نے عیارانہ چال چلی۔ اس کے من میں کھوٹ آ گیا۔ اس کی رگِ حرص پھڑکی ہمیشہ کی طرح کیے ہوئے عہد و پیمان کو بالائے طاق رکھا اور بڑی بزدلی کے ساتھ سرخ جھنڈے والے گھڑسوار کو پشت سے گولی مار کر ہلاک کر دیا اور اب پورے ریوڑ کا واحد تن تنہا مالک بن بیٹھا ہے۔ دائیں اور بائیں کا تصور اس نے عملاً ختم کر کے رکھ دیا ہے اور یوں میرے دوست ہم دونوں بے منزل۔۔۔ایک سے سراب میں گھرے کھڑے ہیں۔

بتا؟ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔

اپنے سر کو نا اُمیدی سے ہلاتے ہوئے ہم سب کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

یہ دایاں اور بایاں۔۔۔ مجھے تو بس فریب لگا۔ نری مکاری اور۔۔۔ریاکاری نظر آئی۔ رب سچے نے اپنی مخلوق کے واسطے ہر شے دل کھول کر وافر مقدار میں مہیا کر دی ہے۔ بات صرف دل کی ہے۔۔۔سوچنے اور سمجھنے کی ہے۔

مولوی تو ابھی وہیں کھڑا ہے جہاں میں پچپن سال پہلے کھڑا تھا۔ مجھے بتا! کیا ہم نے کوئی سفر طے بھی کیا ہے؟

اوئے ہم بھاگے بھی تھے۔۔۔ کہ نہیں؟ ہم نے قدم بھی اٹھائے یا یوں ہی کھڑے کھڑے اپنی سانسیں پھُلا بیٹھے ہیں۔۔۔ بتا مجھے۔۔۔ مجھے پتا نہیں چل رہا۔۔۔ اللہ نواز! تو ہی کچھ بول۔۔۔ بیٹا وارث! تم میرے سوال کا جواب دو۔ کیا ہم نے کچھ فاصلہ طے کیا؟ جواب دو۔۔۔ کچھ تو۔۔۔

کامریڈ بول بول کر بے دم ہوگیا۔اللہ نواز کہنے لگا چل میں تجھے گھر چھوڑ آؤں۔

کامریڈ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ نحیف آواز میں کہنے لگا۔

میری بہو میری کھانسی کی آواز سے بے سکون ہو جاتی ہے۔اس لیے گھر جا کر اس کے چین و استراحت میں خلل ڈالنا نہیں چاہتا ویسے بھی گھر اس وقت تک گھر تھا جب وہاں گھر والی تھی۔اب تو۔۔۔اپنا چہرہ اس نے ہاتھوں میں چھپا لیا، اور اس کی سوکھی شاخوں جیسی بے جان انگلیاں آنسوؤں سے نمناک ہونے لگیں۔

مولوی سلامت خاموشی سے اٹھ کر بوجھل دل کے ساتھ گھر کو چل دیا۔ٹھکانا نہ ہونے کی وجہ سے کامریڈ ہمارے پاس بیٹھا رہا۔ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔قریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ نقاہت کے ساتھ اٹھا اور میڈیکل سٹور کے بند ہونے سے قبل دوائی خریدنے کا کہہ کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا گہری تاریکی میں غائب ہوگیا۔

کافی انتظار کے بعد جب وہ واپس نہ لوٹا تو جسموں کو کاٹنے والی یخ بستہ ہوا کے جھونکوں میں ہم دونوں بھی اگلے روز ملنے کا وعدہ کر کے اپنے اپنے گھروں کی جانب سدھارے۔

اگلے روز نیند کھلی تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔گرم گرم چائے پینے کے دوران میں نے فیصلہ کیا کہ حمام پر چل کر شیو کروائی جائے اور گرم گرم غسل بھی لیا جائے۔

نگینہ ہیئر کٹنگ سیلون میں اللہ نواز مجھ سے پہلے بیٹھا ہوا دوسروں سے بات چیت کر رہا تھا۔اس کی زبانی یہ افسوسناک خبر سنی کہ نیازی میڈیکل سٹور کے تھڑے پر رات طفیل کامریڈ کا انتقال ہوگیا۔اس کے ہاتھ میں ادویہ کا نسخہ تھا اور ۔۔۔اللہ نواز کو مکمل یقین تھا کہ پانچ سو روپے کسی نے اس سے ہتھیا لیے۔

ہم دونوں افسردہ و غمگین ہو کر پانچ سو روپے کا معمّا حل کرتے ایماندار، محنتی، مخلص انسان، باحوصلہ اور پُرعزم سیاسی کارکن کے ایسے غیر انسانی اور غیر آبرومندانہ انتقال پر معاشرے اور حکومت کو کوستے ہوئے باہر نکل آئے۔

چند دنوں کی غیر حاضری کے بعد منہ لٹکائے، آنکھیں جھکائے مولوی سلامت علی محفل میں آیا اور خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔

اسحاق نے خاموشی کی وجہ دریافت کی؟ مولوی کیا بات ہے آج بڑے چُپ چُپ ہو۔اپنے نظریاتی دشمن کامریڈ کے مرنے پہ سوگوار ہو؟

یکا یک اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ڈبڈبائی آنکھوں سے کہنے لگا۔کامریڈ بہت بڑا انسان تھا۔وہ رُک رُک کر بتانے لگا۔جس رات کامریڈ فوت ہوا، میں یہاں سے اُٹھ کر پہلے گھر چلا گیا۔گھر میں بیوی دردِزہ میں مبتلا تھی۔میں جلدی سے دائی خورشید بیگم کو بلانے اس کے گھر گیا، لیکن اس نے ساتھ چلنے سے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ کیس کی فیس پہلے میرے ہاتھ پہ رکھو کیونکہ تم نے ابھی تک گذشتہ سال پیدا ہونے والی بچی کے بقایا جات ادا نہیں کیے۔

مایوس ہو کر میں وہاں سے پلٹ رہا تھا کہ گلی کی نکڑ پر نیازی میڈیکل سٹور کے بالمقابل ہاتھ میں نسخہ تھامے ہانپتے ہانپتے اور کھانستے ہوئے وہ۔۔۔مجھے ملا۔

مولوی کی آواز بتدریج ڈوبتی جا رہی تھی، جسے زیرِلب اعترافِ شکست کر رہا ہو۔اُس نے بتایا کہ کامریڈ نے میری پریشانی بھانپ کر مجھ سے پوچھا کیا بات ہے؟

حالانکہ اس وقت وہ خود شکستہ حال تھا۔میرا ماجرا سننے کے بعد اس کی بجھتی ہوئی آنکھوں میں یکا یک عزم اور امید کے چمکدار دیپ روشن ہونے لگے۔بنڈی کی اندرونی جیب سے سو سو کے پانچ نوٹ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

یار مولوی! میری بیوی نے سات بچے جنے اور مجھے بھی بار ہا اس صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا جس کا تم اس وقت سامنا کر رہے ہو۔اس لیے تو میں نے کہا تھا ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔

میں نے روپے لینے سے گریز کیا اور کہا یہ تمہیں اپنی دوائی کے لیے چاہئیں۔وہ ہنس کر بولا۔

بے وقوف نہ بنو۔میں نے جتنا جینا تھا۔۔۔جی چکا۔میری فکر مت کرو، بلکہ جسے زندگی کی ضرورت ہے اس کی جان بچانے کی دوڑ دھوپ کرو۔روپے میری جیب میں ٹھونستے ہوئے وہ مجھ سے بغلگیر ہوگیا۔مجھے زور سے اپنے نحیف بازوؤں میں دباتے ہوئے کہنے لگا۔

مولوی! میں سُرخا تُو ہرا۔۔۔دایاں بازو۔۔۔بایاں بازو؟ تو پھر جسم تو ایک ہی ہوا اور اگر ہم دونوں ایک جسم کے مالک ہیں تو ظاہر ہے ہمارا دل بھی ایک۔۔۔تو پھر جھلیا۔۔۔کس بات کی ناراضی؟ کیسا اختلاف؟ کس وجہ سے نفرت و کدورت؟

اوئے سن! چونکہ دل میں رب سچّا رہتا ہے اس لیے تیری میری کا جھگڑا ختم۔۔۔اور میں اپنے رب کی پیروی کر رہا ہوں۔

جا۔۔۔اب دیر نہ کر۔۔۔تیری خیر ہو۔۔۔جا۔۔۔جا جا۔۔۔میں اس سے جدا ہونے لگا تو آخر میں قریباً نہ سنائی دینے والی مریل سی آواز میں بولا۔

یار مولوی! اپنے بچوں کو۔۔۔دائیں بائیں کے چکروں سے بچا کر رکھنا۔

سلامت کی آنکھوں سے گرنے والے آنسو اپنے نظریاتی دشمن کو خراجِ عقیدت پیش کر رہے تھے اور۔۔۔میں بھیگی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ کامریڈ طفیل زمین پہ اوندھے منہ گرا پڑا ہے۔اس کا بدن خون میں لت پت ہو کر سرخ رنگت اختیار کر گیا ہے جیسے اشتراکیت کے سرخ جھنڈے میں ملفوف لاش۔۔۔اور لوگوں کا۔۔۔ایک نہ ختم ہونے والا انبوہِ کثیر روٹی، کپڑا اور مکان کے فلک شگاف نعرے بلند کرتا، اس کو پیروں تلے روندتا، کچلتا، ٹھوکریں مارتا، بڑھتا چلا جا رہا ہے۔۔۔بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

قبرستان کا بھوت

نصرت بخاری (اٹک)

انسان لاکھ انکار کرتا رہے لیکن دولت و دینار میں ایسی چمک ہے جو انسان کے قلب و ذہن سے مروت و محبت کا پانی نچوڑ لیتی ہے اور وہ اپنے عزیز ترین رشتوں سے منہ موڑ کے ہجر کی گٹھڑی اٹھائے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔اس کا ذہن یہ سوچتا ہی نہیں کہ وہ جب واپس آئے گا تو کیا اس کے والدین زندہ ہوں گے۔اگر نہیں ہوں گے تو کیا وہ اپنی ساری زندگی کی کمائی سے انھیں واپس لے آئے گا؟اسے اپنی ماں کی آنکھوں میں نمی اور باپ کے اترے ہوئے چہرے کا مفہوم سمجھ ہی نہیں آتا۔میں ایسی باتیں کیوں سوچنے لگا؟اس لیے کہ میرے سامنے ایک ماں کی میت پڑی ہے لیکن اس کا بیٹا اس سے ہزاروں میل دور بیٹھا ہے۔وہ آنا چاہتا ہو گا لیکن کئی ایسی مجبوریاں ہوں گی جو موئی ماں سے زیادہ عزیز ہوں گی۔وہ بھی ماں کے لیے تڑپا ہو گا،لیکن میں نے اس ماں کو اس کے لیے تڑپتے بلکتے دیکھا ہے۔نزع کے عالم میں بھی جب اس کے بیٹے کا فون آیا اور اس کے کان سے لگایا گیا تو میں نے اس کے پورے وجود کو بیدار ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔میں اس کے جنازے میں شریک تھا اور ایسی کمائی پر ہزار بار لعنت بھیج رہا تھا جو ماؤں سے بیٹے چھین لیتی ہے۔خود مجھے معاشی پریشانیوں نے دیارِ غیر میں پھینک دیا تھا اور میں ایک عرصے کے بعد پچھلے جمعے کو وطن واپس آیا تھا؛لیکن اب میں نے پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ میں ملک بدری کی سزا کا طوق ہر گز نہیں پہنوں گا۔یہ وہ سزا تھی جو پرانے بادشاہ اپنے بدترین مخالف کو دیا کرتے تھے اور ہم بخوشی یہ سزا قبول کر لیتے ہیں۔میت کو دفنا دیا گیا تھا اور تمام لوگ واپس جا رہے تھے۔میں نے بھی واپسی کا ارادہ کیا لیکن ابھی دو چار قدم ہی چل پایا تھا کہ کسی نے پیچھے سے مجھے آواز دی:

''ندیم''۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔بہت سے لوگ آ رہے تھے لیکن مجھے کوئی شناسا چہرہ نظر نہیں آیا؛آتا بھی کیسے درمیان میں دس بارہ سال کا فاصلہ تھا۔میں تو اپنے چچا زاد بھائیوں کو نہیں پہچان سکا تھا جو مجھے ائر پورٹ پر لینے آئے تھے،اس شخص کو کیسے پہچان لیتا؛پھر میں یہ سوچ کر چل پڑا کہ ممکن ہے کسی اور ندیم کو آواز دی گئی ہو۔

''رک جا میرے بھائی''۔میں نے پھر مڑ کر دیکھا تو ایک آدمی جس کی چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی تھی اور آدمی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی ڈاڑھی میں زیادہ بال کالے ہیں کہ سفید،مجھے ہاتھ کے اشارے سے رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔میں نے غور سے اسے دیکھا تو وہ میرا دیرینہ دوست رضی تھا۔سکول میں سب اسے رضی اللہ تعالیٰ کہتے تھے۔ہم پہلی جماعت سے میٹرک تک کلاس فیلو تھے۔جب میں سعودیہ گیا تھا تو اس وقت اس کی ڈاڑھی نہیں تھی۔ایک دو بار میں پاکستان واپس بھی آیا تھا لیکن اس سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔وہ میرے قریب آ چکا تھا،ہم دونوں آپس میں لپٹ گئے،ایک دوسرے کو خوب دبایا۔

''سناؤ بھئی رضی اللہ تعالیٰ کیسے ہو''میں نے اس سے جدا ہوتے ہوئے کہا

''بڑے عرصے بعد کسی نے اس نام سے پکارا ہے۔کہاں ہوتے ہو یار''اس نے اپنائیت سے کہا

''تو تو جانتا ہے نا،میں سعودیہ میں ہوتا ہوں''میرے لہجے میں تکبر کی کوئی لہر بھی شامل ہو گئی تھی

''اتنے عرصے کے بعد ملے ہو،آؤ اسی پرانے ہوٹل میں چائے پیتے ہیں''

''وہ ہوٹل ابھی تک چل رہا ہے''؟میں نے حیرت سے پوچھا

''بالکل چل رہا ہے اور اسی طرح چل رہا ہے۔زمانے نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا لیکن میں بھی وہاں کم ہی جاتا ہوں۔ہمارے گھر سے دور ہے اس لیے ادھر آنے کا کم ہی موقع ملتا ہے۔ادھر کسی کا جنازہ پڑھنا ہو تو تب ہی آتا ہوں لیکن ہوٹل میں کبھی نہیں گیا۔برسوں بعد تمھارے ساتھ وہاں جا رہا ہوں۔

واقعی زمانے نے اس ہوٹل کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔اسی انداز میں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔تنور اپنی جگہ پر قائم تھا۔البتہ ہوٹل کا چاچا اپنے خدو خال کو زمانے کی بے رحمی سے نہیں بچا سکا تھا۔میں نے تو اسے فوراً پہچان لیا لیکن مجھے پہچاننے کے لیے اسے کچھ لمحوں کا سہارا لینا پڑا۔وہ بڑی محبت سے پیش آیا۔

''کیا تم دونوں ایک ہی ملک میں ہوتے ہو''ہوٹل کے مالک نے پوچھا

''میں تو یہیں ہوتا ہوں''احمد نے جواب دیا

''نظر تو کبھی نہیں آئے''

ادھر آنا جانا کم ہی ہوتا ہے چاچا۔''

''بیٹا ایک ہی شہر ہے،پھر کبھی کبھی جنازہ پڑھنے تو آتے ہو گے''؟

''ہاں بس جنازہ پڑھنے تو کئی بار آیا ہوں''

''میں یہاں سب کے جنازے پڑھتا ہوں،اپنا پرایا،امیر غریب،چھوٹا بڑا سب کے؛لیکن میں نے تمھیں کبھی نہیں دیکھا۔یہ تو باہر ہوتا ہے تو تو کبھی کبھی آجایا کر''۔یہ کہ کر اس نے اپنی چادر سے چارپائی صاف کی اور ہمارے لیے اپنے ہاتھ سے چائے بنانے چلا گیا۔

''پیسے کما رہے ہو''؟بیٹھتے ہی احمد نے پوچھا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے طنز کر رہا ہو۔

''کیا کریں یار،اس کے بغیر بھی تو گزارا نہیں ہوتا''۔میں نے کم زور لہجے میں جواب دیا

''جانتا ہوں یار سب جانتا ہوں۔یہ جس مائی کا ہم جنازہ پڑھ کے آ

رہے ہیں نا؛اس کا بیٹا انگلینڈ میں ہوتا ہے، تجھے تو بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے، تیرے تو گھر کی کہانی ہے۔نوٹوں کی گڈیوں سے الماری بھری ہے مگر بیٹے کے لیے تڑپ تڑپ کر مرگئی ہے۔وہ پیسے بھیج کر سمجھتا تھا کہ شاید ماں ان سے بہل جائے گی مگر ایسا نہیں تھا وہ آسمان پر آتے جاتے جہاز دیکھ کر کہا کرتی تھی کہ جانے میرا بیٹا کس جہاز میں آئے گا۔وہ راہ تکتے تکتے مرگئی مگر بیٹا نہ آیا۔اب وہ اربوں روپے بھی لگالے تب بھی اپنی ماں کی صورت نہیں دیکھ سکے گا، قیامت تک نہیں دیکھ سکے گا۔''۔اس کی آواز دُکھنے لگی تھی۔میں بھی سر جھکائے دکھی دل کے ساتھ اس کی باتیں سن رہا تھا۔اپنوں سے دور نہ جانے کا ارادہ تو پہلے ہی کر چکا تھا،اس کی باتوں نے اس پر پکی مہر لگادی۔ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے موبائل نمبر کا تبادلہ ہوااور میں نے اس کا اور جب اٹھنے لگے تو میرا چچازاد بھائی جواد جو موٹر سائیکل پر قبرستان کی طرف جارہا تھا، مجھے دیکھ کر رک گیا۔

''کہاں جارہے ہو''میں نے اس سے پوچھا''

''آج جمعرات ہے نا،امی کی قبر پر حاضری دینے قبرستان جارہاہوں''۔

''چلو میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں''۔رضی سے اجازت لے کر میں بھی اس کے ساتھ ہولیا۔جب ہم قبرستان میں داخل ہوئے تو شام ہونے کو تھی۔تاریکی آہستہ آہستہ اجالے کو پیچھے دھکیل رہی تھی۔جواد اپنی امی کی قبر پر کھڑا دعا کرنے لگا،میں نے اس کا ساتھ دیا۔اچانک ساتھ والی قبر کی تختی نے میری آنکھیں جکڑ لیں یہ رضی اللہ کی قبر تھی۔وہی رضی اللہ جس نے ابھی کچھ دیر پہلے میرے ساتھ چائے پی تھی شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کیونکہ ساتھ ہی اس کے والد کا نام بھی درج تھا۔

''جواد!یہ قبر دیکھ رہے ہو۔یہ اس شخص کی ہے جو ابھی میرے ساتھ تھا''۔میری آواز کپکپارہی تھی

''کس وقت بھائی جان!''جواد نے حیرت سے کہا

''ابھی یار ابھی۔جب تم مجھے موٹر سائیکل پر بٹھا رہے تھے تو وہ میرے ساتھ تھا''

''لیکن اس وقت تو آپ کے ساتھ کوئی نہیں تھا''

میں اور بھی خوف زدہ ہو گیا۔میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔جواد سے اپنی اس کپکپاہٹ کو چھپانے کے لیے میں جلدی جلدی چلنے لگا۔جواد میرے پیچھے پیچھے بھاگا آرہا تھا۔قبرستان سے واپس آتے ہوئے جواد نے بہت باتیں کیں لیکن میری سوچ تو رضی اللہ کی قبر سے چپک گئی تھی۔اگر چہ میں نے زندگی میں کبھی بھوت نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے متعلق ہزاروں باتیں سنی تھیں،سیکڑوں کتابیں پڑھی تھی۔مجھے پورا یقین تھا کہ مجھ سے ملنے والا رضی اللہ کا بھوت تھا۔جب تک بھوت نہیں دیکھا تھا تو مجھے اس سے ملنے اور دیکھنے کا بہت شوق تھا اب دیکھا ہے تو ٹانگیں بدن کا بوجھ سنبھالنے سے قاصر تھیں۔گھر آکر میں بستر پر دراز ہوا تو بھوت کا خوف بھی پہلو میں لیٹ گیا۔رات کے کسی پہر کمرے میں کسی کی موجودگی سے میری آنکھ کھل گئی۔

''کون ہے''۔میرے الفاظ کو خوف نے منہ سے باہر نہیں آنے دیا

''بچاؤ،بچاؤ،بچاؤ''۔میری چیخ پکار سن کر تمام گھر والے دوڑے آئے۔وہ مجھ سے کچھ پوچھ رہے تھے لیکن کوئی بات مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی۔میرا سارا بدن بخار سے جلنے لگا۔اس کے بعد جو کچھ ہوا یا جو کچھ میں نے اس کیفیت میں کیا ،مجھے بالکل یاد نہیں۔صبح میری آنکھ کھلی تو میں ہسپتال میں تھا۔ڈاکٹر بھوت کی کہانی سے کسی طور پر متفق نہیں ہو رہا تھا جب کہ میں نے اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھ رکھا تھا۔

''اس نے مجھے اپنا فون نمبر بھی دیا تھا''۔میں نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا اور جب اس نمبر پر کال کی گئی تو اسے بند پایا گیا۔ڈاکٹر صاحب نے مجھے کسی ذہنی دباؤ یا خوف کے زیر اثر قرار دے کر گھر بھیج دیا۔کئی روز میری طبیعت ایسی ہی رہی ۔اس کے بعد بھی مجھے مختلف ڈاکٹروں کو دکھایا گیا سب کے سب بھوت پریت کے وجود سے انکاری تھے لیکن میں آنکھوں دیکھے کو کیسے جھٹلا سکتا تھا۔ایک دن ایک ڈاکٹر کے کلینک سے باہر نکلے ہی تھے کہ رضی کا بھوت موٹر سائیکل پر بیٹھا سامنے سے گزر گیا۔اس کی اور میری آنکھیں چار ہوئیں۔وہ مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا۔

''بھوت،بھوت،وہ رہا بھوت''۔میں نے اشارے سے بھائی کو بتایا او بے ہوش گیا۔ہوش آیا تو میں ایک بار پھر ہسپتال میں تھا۔میرا علاج مسلسل ہو رہا تھا۔چھ مہینے اس اذیت میں مبتلا رہنے کے بعد میری ذہنی وجسمانی صحت آہستہ آہستہ بحال رہنے لگی۔میرے گھر والے اسے ڈاکٹروں کی محنت بتاتے تھے تاہم میں جانتا تھا کہ چونکہ گذشتہ چھ مہینے سے مجھے رضی کا بھوت نظر نہیں آیا تھا،اس لیے وہ میرے ذہن سے آہستہ آہستہ محو ہوتا جا رہا تھا اور اسی وجہ سے میری ذہنی صحت بھی بہتر ہو رہی تھی۔

ایک دن کسی عزیز کی موت کی وجہ سے پھر اسی قبرستان جانا پڑ گیا۔رضی کی قبر کے قریب سے گزرا تو ذہن میں پھر خوابیدہ خوف آہستہ آہستہ سر اٹھانے لگا۔زمین نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔۔اپنی اس کیفیت کو چھپانے کے لیے میں نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا لیے۔

''کیا کر رہے ہیں صاحب''۔میں نے دیکھا مٹی میں لت پت ایک شخص میرے پاس کھڑا تھا

''یہ میرے دوست کی قبر ہے''۔میں نے اس کیفیت سے نکلنے کے لیے اس کا سہارا لیا

''لیکن یہاں تو کوئی دفن نہیں''

''پھر یہ کیا ہے؟''۔میں نے قبر کی طرف اشارہ کیا

''سر!میں گورکن ہوں۔بات یہ ہے کہ آبادی بڑھ جانے کی وجہ سے قبرستان میں قبروں کے لیے جگہ نہیں ملتی۔امیر لوگ دفتر والوں کو پیسے دے کر اپنی قبر کی بکنگ کروا لیتے ہیں۔یہ قبر بھی بک ہے۔آپ بھی مجھے روپے پیسے والے لگتے ہیں۔میری مانیں تو دو چار قبروں کی آپ بھی بکنگ کروالیں۔پھر جگہ نہیں رہے گی''۔اس کا لہجہ خالص کاروباری تھا۔

''اپنوں کے درمیاں''

رومانہ رومی
(کراچی)

وہ پلیٹ فارم پر بیٹھی اپنی ٹرین کا انتظار کر رہی تھی۔۔۔اُسے اپنے گھر سے نکلے کافی سمے ہو چکا تھا اور اب اُس کی طبعیت مسلسل سفر سے نڈھال ہو چکی تھی۔پتا نہیں کیوں اپنا ابتدائی افسانہ لکھنے سے لے کر آج تک اُس کا دل بہت بے چین اور بے قرار تھا سو اُس نے اس بے چینی اور بے قراری کو ختم کرنے کے لیے سفر کا ارادہ کیا اور کچھ عرصہ کے لیے خود کو ان سب معاملات سے دور رکھنے کا فیصلہ کرتے ہوئے گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔۔۔مگر اُس کے اندر کی بے قراری نے اُسے کہیں قرار نہ لینے دیا۔۔۔اِک عجیب سے دکھ کا احساس تھا جس نے اُسے چاروں طرف سے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔۔۔سو اُس نے واپس گھر جانے کا قصد کیا اور پہلی مطلوبہ ٹرین کا ٹکٹ حاصل کر کے اپنی ٹرین کا انتظار کرنے لگی۔۔۔پلیٹ فارم پر اس وقت ایک عجیب افراتفری تھی ہر مسافر اپنی مطلوبہ ٹرین میں جگہ حاصل کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا تھا اور قلی حضرات سر پر سامان اُٹھائے اِدھر سے اُدھر دوڑ رہے تھے۔اُس کی آنکھیں بظاہر تو اُس منظر پر ٹکی ہوئی تھیں مگر ذہن کہیں اور ہی تھا۔۔۔وہ زندگی کے اُس سفرِ مسلسل پر غور کر رہی تھی جو کہیں نہیں رُکتا۔۔۔زندگی کے سفر میں اگر آپ صحیح وقت پر صحیح ٹرین کا انتخاب نہ کر پائے یا آپ سے پرے اُسے جانے دیں تو بس پھر وقت ہاتھوں سے ریت کی مانند پھسلنے لگتا ہے اور آپ کی ساری زندگی پلیٹ فارم کی نذر ہو جاتی ہے۔۔۔اور اُس کے اندر کے اسی خوف نے اُسے ہمیشہ وقت کی قدر کرنا اور صحیح سمے پر کام کرنا سکھایا تھا۔۔۔اسی لیے وہ آج بھی ہمیشہ کی طرح وقت سے پہلے ہی اسٹیشن پر موجود اپنی گاڑی کے انتظار میں تھی جب کہ ابھی اُس کے آنے میں آدھے گھنٹے کا وقت باقی تھا۔۔۔اچانک وہ چونکی۔۔۔اُس کے مطلوبہ پلیٹ فارم کا سرخ سگنل سبز ہو گیا تھا۔۔۔اُس نے سوچا شاید ٹرین آج جلدی آ گئی ہے یا پھر اُس کی گھڑی بند ہے۔۔۔مگر پھر وہاں لگے ہوئے اسپیکر پر اعلان ہونا شروع ہو گیا۔۔۔وہ دھیان سے اعلان سننے لگی تا کہ جان سکے کہ آیا آنے والی ٹرین اُس کی مطلوبہ ٹرین ہے یا نہیں۔۔۔مگر نہیں یہ تو کوئی اور گاڑی تھی جو اس پلٹ فارم سے گزر کر اپنی منزل کو جانا چاہتی تھی۔۔۔اُس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور اپنی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھی گئی۔۔۔ٹرین کی تیز سیٹی پر اُس نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ دور سے ایک ٹرین تیزی سے پلیٹ فارم کی طرف بڑھ رہی تھی جیسے جیسے وہ قریب آتی جا رہی تھی ویسے ویسے پلیٹ فارم پر اُس کی دھمک محسوس ہونے لگی اور پھر وہ بڑی تیز رفتاری سے اُس کے سامنے سے گزرنے لگی۔۔۔اچانک اسٹیشن کی فضا گزرنے والی ٹرین کے خوفناک بریکوں سے چیخ اُٹھی اور اُس کے ساتھ ہی یک دم سناٹا چھا گیا۔۔۔ہر کوئی پریشان نظروں سے ٹرین کی جانب دیکھ رہا تھا۔۔۔کسی انہونی کے خوف کا سایہ ہر چہرے کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے محسوس ہو رہا تھا۔۔۔چند گھڑی کے سناٹے کے بعد اب دبی دبی آواز میں لوگوں کی چہ مگوئیاں شروع ہو چکی تھیں۔۔۔ہر کوئی ٹرین کے اچانک رکنے پر اپنی اپنی رائے دے رہا تھا پھر اسٹیشن ماسٹر کی قیادت میں عملے کے لوگ تیزی سے ٹرین کی جانب بڑھنے لگے۔۔رُکنے والی ٹرین کا عملہ کپڑے کے بنے ہوئے ڈاک کے بڑے بڑے تھیلے ٹرین سے اُتار کر پلیٹ فارم پر رکھ رہے تھے اسٹیشن پر موجود افراد اسٹیشن ماسٹر کے اردگرد جمع ہو گئے اور اُن سے ٹرین کے اچانک رکنے کا سبب دریافت کرنے لگے وہ بھی تجسس سے اُن سب کی طرف دیکھنے لگی کہ شاید کسی کی کوئی بات سن کر اس ناگہانی کا اندازہ لگا سکے۔۔۔مگر وہ سب اُن تھیلوں کو اُٹھائے تیزی اور خاموشی سے اُس کے قریب سے گزرتے چلے گئے۔۔۔اسٹیشن کی فضا شور سے بھر گئی۔۔۔ایسے میں اچانک پلیٹ فارم کا اسپیکر گونج اُٹھا۔۔۔''خواتین و حضرات توجہ فرمائیں۔۔۔ابھی ابھی پلیٹ فارم پر جو ٹرین بغیر کسی اطلاع کے رُکی ہے وہ دراصل ایک شخصیت کی تلاش میں ہے اور اُس کا دعویٰ ہے کہ وہ مطلوبہ شخصیت اس وقت اس اسٹیشن پر موجود ہے لہٰذا اُن سے گزارش ہے کہ وہ فوراً اسٹیشن ماسٹر صاحب کے کمرے میں تشریف لے آئیں''۔۔۔اور اس کے بعد اسپیکر سے اُس شخصیت کا نام پکارا جانے لگا۔وہ حیرانگی سے اپنے چاروں طرف دیکھنے لگی مگر اُسے وہاں پہنچاننے والا کوئی نہیں تھا تو پھر آخر یہ اُس کے نام کی پکار کیوں تھی؟۔۔۔نام کے اعلان کے بعد پلیٹ فارم پر موجود خواتین مسافروں میں افراتفری کا عالم تھا۔۔۔ہر کوئی دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔۔۔اتنے میں کسی کی نگاہ اُس پر جا ٹھہری اور پھر سب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے مشکوک ٹھہراتے ہوئے اُس کی جانب بڑھنا شروع کر دیا۔۔۔یہ صورتِ حال اُس کے حق میں کچھ اچھی نہ تھی۔۔۔اُس نے اپنے حواس یکجا کیے اور خود ہی اپنے آپ کو اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں جانے کے لیے تیار کرتے ہوئے اپنی سیٹ سے کھڑی ہو گئی۔۔۔اُس کی جانب بڑھنے والے لوگ اپنی اپنی جگہ رُک گئے اور اُسے دیکھنے لگے۔۔۔اُس نے اطمینان سے اپنا بیگ اُٹھایا اور کمرے کی جانب بڑھی۔۔۔جیسے ہی اُس نے کمرے میں قدم رکھا سب کی کھوجتی ہوئی نگاہیں اُس کا جائزہ لینے لگیں وہ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتی ہوئی اسٹیشن ماسٹر کی میز کے پاس پہنچی اور ہلکی سی آواز میں بولی۔''جی میں ہی آپ سب کی مطلوبہ شخصیت ہوں۔'' اُس کے اِس اعتراف کے بعد نہ صرف کمرے میں بلکہ کمرے سے باہر کھڑے ہوئے ہجوم میں بھی ایک ہلچل سی مچ گی۔۔۔اسٹیشن ماسٹر نے اُسے اپنے سامنے والی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے کہا۔۔۔وہ اپنے آپ کو آنے والے حالات کے لیے تیار کرتے ہوئے بیٹھ گئی۔۔۔سب لوگوں کی توجہ اب صرف اور صرف اُس کی اور

اسٹیشن ماسٹر کی طرف لگی تھی۔۔۔وہ بھی غور سے ان کی جانب ہی دیکھ رہی تھی تا کہ صورتِ حال کا کچھ اندازہ لگا سکے۔۔۔آخر اُس نے ہی اس خامشی کو توڑا اور ہمت کرتے ہوئے اُن سے ٹرین کے رُکنے اور اپنے طلب کیے جانے کی وجہ دریافت کی۔۔۔اسٹیشن ماسٹر نے حیرت بھرے لہجہ میں کہنا شروع کیا۔۔۔"بات کہاں سے شروع کروں کہ بات ہی کچھ عجیب ہے۔۔۔دراصل ٹرین میں سوار مسافروں اور عملے کے مطابق جیسے ہی یہ ٹرین پلیٹ فارم میں داخل ہوئی اور آپ کے سامنے سے گزری تو اچانک ٹرین میں ایک ناقابلِ یقین سا شور مچا اور ڈاک کے اِن تھیلوں نے اُچھل اُچھل کر شور مچانا شروع کیا کہ اس ٹرین کو فوراً یہاں روکا جائے۔۔۔جب اُن سے سوال کیا کہ یہاں کیوں؟۔۔۔تو سب نے ہم آواز ہو کر کہا کہ ہم جس کی تلاش میں ہیں وہ اس پلیٹ فارم پر موجود ہے اور ہم نے بڑی مشکلوں نے اُسے پایا ہے اور اس بار ہم اُنہیں کھونا نہیں چاہتے۔۔۔خدا کے لیے ہم سب پر رحم کرو اور ہمیں اُن تک پہنچا دو۔۔۔اس کے بعد اُنہوں نے ٹرین میں تہلکہ مچا دیا۔۔۔اور مجبوراً ٹرین کو یہاں روکنا پڑا۔۔۔یہ سامنے جو تھیلوں کا انبار لگا ہے دراصل یہ سب کے سب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" اُن کی بات ختم ہوتے ہی نہ صرف اُس کی بلکہ ہر شخص کی توجہ کا مرکز اب وہ لاتعداد تھیلے تھے۔۔۔وہ کرسی سے اُٹھی اور ہمت کر کے تھیلوں کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔۔۔اُسے اپنے روبرو دیکھ کر سب ہی اُچھلنا شروع ہو گئے وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی مگر پھر دل کو مضبوط کرتے ہوئے ایک کی جانب ہاتھ بڑھایا اور اُس کا منہ کھول دیا۔۔۔اچانک اُس میں سے ایک دیوانہ باہر آیا اور اُس کے ہاتھوں کو چومنے لگا وہ خوف زدہ سی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی کہ اچانک وہ بول اُٹھا مجھے سے ڈرو مت میں تمھارے افسانے کا وہ دیوانہ ہوں جس کے کردار کو لکھ کر تم نے مجھے امر کر دیا۔۔۔ابھی اُس کی بات پوری ہی ہوئی تھی کہ ایک اور شخص تھیلے سے برآمد ہوا اور اُس کے قدموں میں بیٹھتا چلا گیا۔۔۔اور گویا ہوا میں بھی ایک ایسا ہی کردار ہوں جس کا ضمیر اُس کے اپنے لیے وبالِ جان بن چکا تھا تم نے ہی مجھ سے اعتراف نامہ لکھوا کر مجھے اپنے ضمیر کی ملامت سے نجات دلائی تھی۔۔۔اتنے میں ایک نہایت مسکین قسم کا شخص آگے بڑھا اور شکر گزار نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔۔۔میں آپ کا تہہ دل سے ممنون ہوں اگر آپ اپنے افسانے میں میرا کردار نہ لکھتیں تو شاید میں آج تک شرافت اور بزدلی کے بیچ ہی کہیں ٹھہرا ہوا ہوتا۔۔۔پھر تو جیسے ایک کے بعد دوسرا کردار اُن تھیلوں سے نکلتا جا رہا تھا جن میں کوئی کوڑا چننے والا بچہ تھا تو کوئی مسافر۔۔۔کوئی دھوبی تھا تو کوئی پروفیسر۔۔۔کوئی ادیبہ تھی تو کوئی خوبصورت بنی سنوری سی عورت ۔۔۔کوئی پینٹر تھا تو کوئی رپورٹر۔۔۔کوئی مولوی تھا تو کوئی درویش۔۔۔کسی بچہ کے ہاتھ میں لکڑی کا ٹکڑا تھا تو کوئی خاتون اپنے تھپٹر لگے نشان زدہ گال کے ساتھ کھڑی تھی۔۔۔کوئی لیڈی ڈاکٹر تھی تو کوئی بھکارن۔۔۔ کوئی طبلہ کی تھاپ پر ناچنے والی رقاصہ تھی تو کوئی کاری کی جانے والی معصوم لڑکی۔۔۔وہ سب کے سب اُس کے چاروں طرف خوشی سے ناچتے ہوئے اپنی آزادی کا جشن منا رہے تھے۔۔۔وہ سب اُس کا شکریہ ادا کرنے آئے تھے کہ جن کو اُس نے صدیوں کی قید کے بعد اب آزاد کر دیا تھا۔۔۔اپنے اردگرد اپنے ہی تحریر کئے ہوئے کرداروں کو زندہ دیکھ کر اُس کے اندر اطمینان بھرنے لگا تھا۔۔۔کہ اچانک کمرے میں بھاری بوٹوں کی آواز گونج اُٹھی اُس نے اپنے پیچھے جو مڑ کر دیکھا تو حیران رہ گئی۔۔۔قیمتی سوٹ زیب تن کئے اُونچے قد کا ایک بھاری بھرکم آدمی، اُس کے پیچھے لمبی ڈاڑھی والا ہاتھوں میں تسبیح لیے موٹا سا ایک شخص، ساتھ ہی شلوار قمیض میں ملبوس ایک نہایت بارعب سا انسان۔۔۔وہ حیرت سے تینوں کو دیکھنے لگی۔۔۔ان میں سے ایک گویا ہوا 'پہچانا؟'۔۔۔اُس نے اپنی یاداشت پر زور دیتے ہوئے اُن پر نظریں ٹکا دیں۔۔۔اُسے اپنے وہ تینوں کردار یاد آ گئے۔۔۔اُس کی آنکھوں میں اپنے پہچانے جانے کی چمک دیکھ کر وہ تینوں خونخوار نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے اُس کی طرف بڑھنے لگے اور بولے 'تم نے ہمیں پہچان لیا۔۔۔ہم تمہارے لکھے ہوئے وہ کردار ہیں جن کو لکھ کر تم نے پوری دنیا کے سامنے ہمارا کردار بے نقاب کر دیا تھا۔۔۔ہم بھی تمہاری تلاش میں تھے۔۔۔آج ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے'۔۔۔اور پھر اُن تینوں نے اُس کی نازک سی گردن اپنی مضبوط گرفت میں لے لی۔

''آنگن میں روشنی''

نعیم الدین نظر (میر پور خاص)

چاند چہرے ہیں چاندنی کم ہے
میری قسمت میں روشنی کم ہے

جس کو آنکھیں تلاش کرتی ہیں
اتنے لوگوں میں بس وہی کم ہے

مفلسی کے ہزار رنگوں سے
اہل ثروت کو آگہی کم ہے

بات دل پر اثر نہیں کرتی
ان حوالوں میں معتبری کم ہے

کیا عداوت ہے مجھ سے سورج کو
میرے آنگن میں روشنی کم ہے

جو کہ غدارِ ملک و ملت ہیں
ایسے لوگوں سے دوستی کم ہے

سارے گلشن کو ناز تھا جس پر
شاخِ گل پر وہی کلی کم ہے

زندگی کی حقیقتیں ہیں نظرؔ
میری غزلوں میں شاعری کم ہے

○

سلیم انصاری (جبل پور بھارت)

مری انا کا اثاثہ ضرور خاک ہوا
مگر خوشی ہے کہ تیرے حضور خاک ہوا

مجھے بدن کے بکھرنے کا غم نہیں لیکن
ملال یہ ہے دلِ نا صبور خاک ہوا

میں اپنی خاک سے روشن ہوا جو صورتِ مشک
تمام موسمِ گل کا غرور خاک ہوا

بچھڑ کے تجھ سے یہ کم تو نہیں زیاں میرا
ہر ایک منظرِ نزدیک و دور خاک ہوا

میں حرف حرف تو روشن کیا گیا لیکن
لکھا ہوا تھا جو بین السطور خاک ہوا

یہ کیسا قحط مرے ذہن و دل پہ آیا ہے
سلیم میری غزل کا شعور خاک ہوا

○

شفیع ہمدم (فیصل آباد)

جو مطمئن ہیں خود کو صعوبت میں ڈال کے
ہنس کے گزار دیتے ہیں وہ دن زوال کے

نہ جانے میری فکر ہے کیوں انحطاط پر
اسباب کچھ نہ کچھ تو ہیں آخر زوال کے

خالق جو میرا ماں سے بھی بڑھ کر شفیق ہے
خوش ہوگا کیسے مجھ کو جہنم میں ڈال کے

دیکھا یہی ہے میں نے سرِ شہرِ آرزو
چرچے بہت ہیں آپ کے حسن و جمال کے

وہ ناؤ کس طرح سرِ ساحل پہنچ گئی
رکھا ہے لہر لہر نے جس کو اچھال کے

تازہ ہیں وہ ہنوز بھی ہمدمؔ سرِ خیال
لمحات جس قدر تھے کسی کے وصال کے

○

مالک سنگھ وفا

(جموں، بھارت)

ایسی صورت میں لوگ کم نکلے — اُن کی محفل سے جیسے ہم نکلے
زندگی بن گئی ہے اک آزار — دوستوں کے کئی کرم نکلے
ہم کہ سمجھا کئے اسے ہموار — راہِ ہستی میں پیچ و خم نکلے
اُس نے جس سے مجھے نوازا ہے — اُس کرم میں کئی ستم نکلے
ہم نہ سمجھے اُنہیں کسی صورت — وہ بھی ہم جیسے اہلِ غم نکلے
کچھ نہیں تھا سوائے تنہائی — بادہ خانے سے جب ہیں ہم نکلے
ہم نہ سمجھے ہے کس سے ربط اس کا — دل سے وابستہ اُس کے غم نکلے
اے وفا دل میں یہ تمنا ہے — رُو بہ رُو اُس کے اپنا دم نکلے

○

پرویز مظفر

(برمنگھم، یو کے)

غزل نہیں گانے کی خاطر — پُل اس تک جانے کی خاطر
کتنے ہی پاپڑ بیلے ہم نے — ایک تجھے پانے کی خاطر
آگ پیٹ کی یو کے لائی — کچھ پیسے پانے کی خاطر
چاند اُتر آیا آنگن میں — مجھ کو بہلانے کی خاطر
جھرنا دریا سے ملتا ہے — پانی پہچانے کی خاطر

○

نوید سروش

(میر پور خاص)

نذرِ سرشار صدیقی

دل و نظر کا شکوہ کیسا چہرے سبھی پرائے تھے — کپڑوں سے بچھڑے تن آخر کس گھر نے اپنائے تھے
جن کی خاطر ہم دنیا میں دیوانے کہلائے تھے — وہ جب سے ملنے آئے تھے ہاتھ میں پتھر لائے تھے
کس سے کہتے اپنے لہو سے دھرتی کی مانگ بھرو — ہم تو خود اس جرم کے کارن دار و رسن تک آئے تھے
جرمِ وفا پر جسم ہمارے اب تک داغے جاتے ہیں — کہاں گئے جو راہِ وفا تک ساتھ ہمارے آئے تھے
جس کرسی کی مدہوشی تھی وہ کرسی تو خواب ہوئی — اب تو وعدے یاد کرو بس! جو تم نے ٹھکرائے تھے
تب تم کیوں خاموش رہے کہہ دیتے نا دل کی بات سروش — پاس تمہارے چل کر خود جب تم سے ملنے آئے تھے

○

عرش صہبائی

(جموں، بھارت)

سَر بہ سَر وابستہ ہیں وہ بادہ پیمائی کے ساتھ
جن کو اک رغبت ہے اُن آنکھوں کی گہرائی کے ساتھ

زندگی الجھن ہے اُلجھن کے سوا کچھ بھی نہیں
جائزہ لیتے ہیں جب ہم اس کا گہرائی کے ساتھ

اُن کی قربت کا خیال آتا ہے دل میں جب کبھی
ہم لپٹ جاتے ہیں اس صورت میں تنہائی کے ساتھ

کوئی بھی صورت ہو سازِ دل کبھی مدھم نہیں
لازماً ہے ربط اس کو نغمہ آرائی کے ساتھ

بارہا شدّت سے ہوتا ہے مجھے احساس یہ
خود بھی جلوہ گر ہیں وہ یادوں کی پُروائی کے ساتھ

رہ گئی ہے ایک مرکز پہ سمٹ کر زندگی
کسقدر ہے گہرا رشتہ میرا تنہائی کے ساتھ

جس میں شامل ہو محبت جس میں شامل ہو خلوص
بات جو بھی ہو کریں وہ دل کی گہرائی کے ساتھ

زندگی کا کیا بھروسہ کب یہ تنہا چھوڑ دے
کیا بتائیں بندھ گئے ہم کیسے ہرجائی کے ساتھ

زندگی بھر ہم بھلا سکتے نہیں ہرگز اُنہیں
چند لمحے جو ہیں گزرے عرشؔ صہبائی کے ساتھ

دیوی ناگرانی

(ممبئی، بھارت)

ٹھہراؤ زندگی میں دوبارہ ملا نہ تھا
جس کی تلاش تھی وہ کنارہ ملا نہ تھا

ہرگز اتارتے نہ سمندر میں کشتیاں
طوفان آیا جب بھی اشارہ ملا نہ تھا

ہم نے تو خود کو آپ سنبھالا ہے آج تک
اچھا ہوا کسی کا سہارا ملا نہ تھا

بدنامیاں گھروں میں دبے پاؤں آ گئیں
شہرت کو گھر کبھی بھی ہمارا ملا نہ تھا

خوشبو ہوا اور دھوپ کی پرچھائیاں ملیں
حقیقتوں سے جن کا کوئی واسطہ نہ تھا

آغاز کرتی رات میں بھی سفر کا کیا
روشن کرے جو شام، ستارہ ملا نہ تھا

خاموشیاں بھی درد سے ’’دیوی‘‘ پکارتیں
ہم سا کوئی نصیب کا مارا ملا نہ تھا

شمیم اصغر

(کولکتہ، بھارت)

اڑتے اڑتے غبار آیا ہے
وہ جو ناقہ سوار آیا ہے

پھول دامن سے بھر لیا سب نے
میرے حصے میں خار آیا ہے

میں تو ہوں پیکرِ وفا لیکن
کب انھیں اعتبار آیا ہے

آئینہ دیکھ کر سنورنا کیا
دیکھ کر تم کو پیار آیا ہے

اس موبائل کے دور میں اصغؔر
آئی چٹھی نہ تار آیا ہے

○

مراق مرزا (ممبئی، بھارت)

جب سے فصیلِ جاں سے اُبھرنے لگا ہوں میں
وسعت میں آسماں کی بکھرنے لگا ہوں میں

اِس رات کی زمیں پہ اُگے گا ضرور چاند
کچھ رنگ شہرِ خواب میں بھرنے لگا ہوں میں

شیشے کا پیرہن ہے حفاظت ہے لازمی
سو، بات پتھروں سے بھی کرنے لگا ہوں میں

خواہش فلک کو چھونے کی کردے نہ بے شناخت
آدم تری اڑان سے ڈرنے لگا ہوں میں

عالم یہ کون سا ہے کہ سورج ہیں بے شمار
شاید کہ لامکاں میں اُترنے لگا ہوں میں

اک دن کسی ستارہ میں ڈھل جاؤں گا مراقؔ
دشتِ جنوں میں حد سے گزرنے لگا ہوں میں

تصور اقبال (اٹک)

محبت تو کی ہے عداوت نہ کی
کسی سے بھی ہم نے شکایت نہ کی

مرے پاس جس نے امانت رکھی
کبھی میں نے اُس میں خیانت نہ کی

سدا ساتھ سچے کا میں نے دیا
یہ جھوٹے کی میں نے حمایت نہ کی

بچائے ہیں آندھی سے اوروں کے گھر
کبھی اپنے گھر کی حفاظت نہ کی

سرِ عام جو جُرم کرتے رہے
قسم سے کبھی اُن کی عزت نہ کی

لبادہ شرافت کا اوڑھا تو پھر
کسی سے بھی ہم نے شرارت نہ کی

اذاں تو میں دیتا رہا عمر بھر
ولیکن امامت کی جرأت نہ کی

مرا دل امانت تری آج بھی
کبھی اس میں کوئی خیانت نہ کی

وہ جس پر نہ کر پائے ہم خود عمل
کسی کو بھی ایسی نصیحت نہ کی

کسی اور کی اُن کے دل پر رہی
یہ سچ ہے کہ ہم نے حکومت نہ کی

محبت خدا کی خدائی سے کی
تصورؔ کسی سے بھی نفرت نہ کی

اُسے تنگ دستی نے گھیرا ہے اب
وہ جس نے تصورؔ قناعت نہ کی

شگفتہ نازلی (لاہور)

باتوں میں بات آئی، تو منظر بدل گیا
سوغات ساتھ لائی، تو منظر بدل گیا

سارے مشاعرے پہ رنگ اِک ہی غزل کا تھا
پھر اُس پہ داد پائی، تو منظر بدل گیا

عادت تھی اپنی بات کو منواتے رہنے کی
جب ہاں میں ہاں ملائی، تو منظر بدل گیا

کیا کیا جتن کیے نہ تھے پر سُنتا کون تھا
بے پَر کی کیا اُڑائی، تو منظر بدل گیا

تھے اجنبی سے چہرے سارے گردوپیش میں
صورت اِک اُن میں بھائی، تو منظر بدل گیا

اُس کی کسی بھی بات پہ کِس کو تھا اعتبار
لیکن قسم جو کھائی، تو منظر بدل گیا

چہروں کو پڑھنا نازلیؔ آسان ہو گیا
شمعِ سُخن جلائی، تو منظر بدل گیا

○

حفیظ انجم کریم نگری (بھارت)

کیا خوب لگ رہی ہے مجھ کُنفکاں کی رات
سج دھج کے سامنے کھڑی کہکشاں کی رات
ہر رات چھیڑ دیتا ہے کیوں تلخ داستاں
ہر رات ہوگئی ہے مری داستاں کی رات
ہے روشنی ہی روشنی میرے مکان میں
بِٹیا جو آ گئی ہے مرے گھر کہاں کی رات
ہالا ایک نور کا گھیرے ہوئے اُسے!!
قرآن پڑھ رہی ہے مری ماں کہاں کی رات
خوش آمدید کہنے سے کرتا ہوں میں گریز
در پر کھڑی ہوئی ہے مرے امتحاں کی رات
سب میٹھی نیند میں ہیں یہاں چھت کو اوڑھ کر
دیکھی نہیں کسی نے کُھلے آسماں کی رات!!!
پھر اس نے دن کو رات کیا زُلف کھول کر
چھن چھن کے آ رہی ہے کہاں سے کہاں کی رات
انجم یہ لوگ سُننے کے عادی بھی تو نہیں
لا کر سُنا رہا ہے تو جانے کہاں کی رات!!!

زاہدہ عابد حنا (لاہور)

دل کو محوِ نیاز رہنے دو
ایک شوقِ مجاز رہنے دو
راکھ کب تک کرو گے اس دل کو
کچھ تو سوز و گداز رہنے دو
ہر قدم ڈگمگائے جاتا ہے
ہائے اس دل پہ ناز رہنے دو
دل جو بدلے تو رہ بدلتی ہے
اُلٹے سیدھے جواز رہنے دو
چل پڑے جب رہِ جنوں کی طرف
سب نشیب و فراز رہنے دو
کتنے اسرارِ کائنات کھلے
ایک اس دل کا راز رہنے دو
تم نے دیکھا ہے ان کی آنکھوں میں
ہاں، وہی پاکباز رہنے دو
جو حنا دور خلق سے کر دے
تم بھی ایسی نماز رہنے دو

شائستہ سحر (میر پور خاص، سندھ)

دھیمی دھیمی ، مدھم مدھم
پریتم تیری یاد کی سرگم
دل کی الجھن اور بڑھائیں
باتیں تیری مبہم مبہم
دل ہے اب خاموش جزیرہ
چاروں طرف ہے ہُو کا عالم
یہ تیری دلدار نگاہی
یاد دلائے کیا کیا موسم
اس نگری میں سب ہیں اکیلے
کون مسیحا، کیسا مرہم
الجھی الجھی سب تعبیریں
خواب کی زلفیں برہم برہم
آنکھ میسّر ہو تو دیکھو
میرے اندر کتنے عالم
تنہائی بے فیض مسافت
صبحِ گریہ، شامِ پرنم

○

ہواکےدوش پر

(ایک عام آدمی کی داستان حیات)

فیروزعالم

(کیلی فورنیا،امریکہ)

۔ آخری قسط ۔

زندگی کے مشکل دور سے گزر رہا تھا۔ یہ ۱۹۶۹ء تھا تیئس (۲۳) سال عمر تھی پھر بھی گذشتہ دو سال سے کسی نہ کسی طرح گھر کی مالی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھا رہا تھا۔ بس اب ایک خواب، ایک تمنا یہ تھی کہ میں کسی طرح ملک سے باہر اعلیٰ تعلیم کے لئے نکل جاؤں۔ صرف روپیہ کمانے کے لئے ملک سے باہر جانے کا ارادہ نہیں تھا اسلئے سعودی عرب یا مشرق وسطیٰ کے کسی ملک جانے کی تمنا نہیں تھی۔

میں ہمیشہ سے تخیلاتی انسان رہا ہوں جس کی زندگی خواب دیکھتے گذری۔ میں جب اپنی طالب علمی کے زمانے میں کورس کی وہ کتابیں پڑھتا تھا جو زیادہ تر انگلینڈ یا امریکہ کے عالمی طور پر مشہور ڈاکٹروں اور سائنسدانوں کی لکھی ہوتی تھیں یا جن میں انگلینڈ اور امریکہ کے ان ہسپتالوں کا ذکر ہوتا تھا جہاں موجودہ علم طب پر حیرت انگیز تحقیق اور تجربات ہوئے ہیں تو میرے دل میں یہ تڑپ جاگ اٹھتی تھی کہ میں بھی ایسی یونیورسٹیوں، ایسے میڈیکل سنٹروں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں جہاں سے ایسی کتابیں تصنیف ہوتی ہیں۔ اس زمانے میں میرا دوست چندر نیا نیا انگلینڈ گیا تھا اس نے بتایا کہ انگلینڈ کے حالات خراب ہیں اور جنوبی ایشیا کے ڈاکٹروں سے امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔

ادھر میں نے جب سے کراچی کے امریکی ہسپتال میں کام شروع کیا تھا میں اپنے امریکی سینئیر ڈاکٹروں میں بہت مقبول تھا اور وہ میری کارکردگی کو دیکھ کر ہمیشہ مجھے امریکہ جانے کی ترغیب دیتے تھے۔ ڈاکٹر ناظر خواجہ بھی مجھ پر بہت مہربان تھے۔ ان کے تو مجھ پر بہت اخلاقی احسان ہیں انہوں نے بھی مجھ سے کہا کہ میں امریکا ہی کی تیاری کروں۔ انہوں نے امریکہ کے مشہور شہر اور علم کے گہوارہ بوسٹن میں جہاں مشور زمانہ ہارورڈ یونیورسٹی ہے طب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اس لئے وہ امریکا کہ بہت مداح تھے۔ ان حالات کے پیش نظر میں نے امریکا کے امتحان کی تیاری شروع کردی۔ میرے ساتھ رشید بھی اس امتحان کی تیاری کرنے لگا۔ امتحان قریب تھا اور امریکی انداز کے امتحانوں کا ہمیں کوئی تجربہ نہ تھا پھر پاکستان میں امریکی امتحانوں میں مدد دینے کی کوئی کتابیں بھی نہیں تھیں اس سلسلے میں ڈاکٹر ناظر نے ہماری بڑی مدد کی ان کے پاس کچھ پرانے نوٹس اور امریکی امتحانوں کے نمونے تھے دن رات انکے چیمبر میں، میں اور رشید انکے ساتھ ان سوالوں کی مشق کرتے تھے۔

امتحان اکتوبر میں ہونا تھا اور پھر رزلٹ کا انتظار نہایت صبر آزما تھا کہ اس میں تین ماہ تک لگ سکتے تھے مگر عام طور سے نتیجہ چھ ہفتے میں آجاتا تھا۔ ایک سخت آزمائش اور کٹھن محنت کے بعد وہ دن آپہنچا جب دوسرے دن امتحان تھا میں اوّل رات اپنی تیاری پر آخری نظر ڈال کر ہر چیز کو فائنل کر رہا تھا کہ نیچے سے انصار بھائی جان کی آواز آئی کہ جلدی نیچے آ۔ میں کچھ ناگواری سے نیچے اترا تو دیکھا کہ میرے کزن انصار بھائی جان کا سارا کنبہ انکی سفید اور لال رنگ کی واکس ہال کار میں ٹھنسا ہوا ہے اور مجھ سے بھی اصرار ہے کہ میں بھی کچھ کہے بنا ان کے ساتھ بیٹھ جاؤں معلوم ہوا کہ سب لوگ شبنم اور وحید مراد کی نئی فلم عندلیب دیکھنے جا رہے ہیں میں نے لاکھ معذرت چاہی کہ کل میری زندگی کا بڑا امتحان ہے۔ مستقبل کا سوال ہے مگر کسی نے ایک نہ سنی امّاں بھی ڈانٹنے لگیں کہ کیوں ان لوگوں کا دل توڑ رہے ہو جو پڑھ لیا سو پڑھ لیا اب ایک رات کی پڑھائی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مجبوراً میں کتابوں کو کھلا چھوڑ کر ان لوگوں کے ساتھ فلم دیکھنے گیا۔ سچ ہے بڑا مزہ آیا اور دماغ تازہ دم ہوگیا۔ کیا محبتیں اور خلوص تھے بہر حال وہ اہم دن۔ میری زندگی کا ایک بہت اہم دن بھی آپہنچا۔

کراچی میں فریئر ہال کے لان پر بڑا سا خیمہ لگا دیا گیا اور ہم تمام امیدوار خیمہ کے نیچے جمع ہو گئے ایک لال بھبوکا امریکی نے اپنے انتہائی بگڑے لہجے میں ہمیں امتحان کے رولز اور ریگولیشن بتائے اور پرچہ شروع ہوا۔ انتہائی صبر آزما امتحان تھا دو گھنٹے بعد تو ہر شخص کو چکر آرہے تھے آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ صبح کا سیشن جو چار گھنٹے کا تھا اسکے آخیر میں تو ایسا لگتا تھا کہ سوالی پرچہ کے سارے حروف گڈمڈ ہو گئے ہیں اور بس کالی کالی لائینیں ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہی ہیں امتحان کے درمیان وقفہ اس قدر کم وقت کا تھا کہ کہیں اچھا کھانا کھانے جانا ممکن نہیں تھا دوسرا سیشن بھی کچھ مختلف نہیں تھا۔ شام کوئی پانچ بجے امتحان ختم ہوا ایک تو کمزوری دوسرے بھوک کی وجہ سے جان نکلی ہوئی تھی پھر چونکہ ناظم آباد کے لئے سواری ملنا ناممکن تھی اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ میں کچھ وقت گذاری کے لئے ظفر عباس چچا میاں کے یہاں جو وہیں صدر میں رہتے تھے چلا جاؤں ویسے بھی اپنی چچازاد بہنوں خاص طور پر نزہت اور مہتابی سے باتیں کرنے میں مجھے بڑا مزہ آتا تھا مگر وہ دونوں وہاں نہیں تھیں رفعت آپا نے چائے اور کچھ لوازمات سے میری تواضع کی۔ میں تازہ دم ہوا اور گھر کی راہ لی۔

اس امتحان کا نتیجہ تین ماہ میں آتا تھا ہم اس زمانے میں ناظم آباد ''ٹال والے گھر'' میں رہتے تھے اور گھر میں فون نہیں تھا۔ مگر ہسپتال والوں کو میں نے ایمرجنسی کے لئے ذوالفقار بھائی جان کے گھر کا نمبر دیا ہوا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا کوئی ایک بجا ہوگا میں پوری رات کی ڈیوٹی دے کر تھوڑی دیر پہلے سویا تھا جب ذوالفقار بھائی جان کا نوکر سعید آیا کہ آپ کا ضروری فون ہے آپ ابھی ہمارے یہاں چل کر ہسپتال فون کریں میں ذرا جھنجلا کر اسکے ساتھ رکشا میں ذوالفقار

بھائی جان کے یہاں روانہ ہوا۔ان کے یہاں مجھے بتایا گیا کہ ڈاکٹر ناظر کا فون تھا اور مجھے فوراً ہسپتال پہنچنے کو کہا گیا ہے۔ مجھ سے یہ بھی کہا گیا کہ انہوں نے کہا ہے کہ بس میں آنے میں دیر ہوجائیگی اس لئے رکشہ یا ٹیکسی میں آؤں۔۔۔ٹیکسی اف اللہ۔۔۔میں ٹیکسی کا کہاں متحمل ہوسکتا تھا بہرحال پٹرول پمپ تک پیدل جا کر میں نے ایک موٹر رکشہ پکڑی اور یہ سوچتا ہوا کہ ایسی کیا آفت آگئی کہ پوری رات ڈیوٹی دے نے کے بعد بھی جب کہ میں سخت تھکا ہوا ہوں ہسپتال والوں نے مجھے طلب کرلیا ہے میں سیونتھ ڈے ہسپتال پہنچا۔

سہ پہر میں کلنک کا بڑا کاریڈور مریضوں سے بھرا ہوتا تھا اور چلنے کی بھی جگہ مشکل سے ملتی تھی میں جیسے ہی اس میں داخل ہوا سامنے ہی ڈاکٹر ناظر اپنے ہاتھ میں ایک کاغذ پکڑے کھڑے تھے مجھے دیکھ کر لپک کر میری طرف آئے اور فرط جذبات سے مجھے گلے لگا کر اتنی زور سے مجھے بھینچا کہ مجھ سے سانس لینا مشکل ہوگیا اور کہنے لگے بس فیروز صاحب (وہ کبھی کبھی خاص موقع پر مجھے فیروز صاحب کہتے تھے) اب آپکے سارے مسئلے حل ہوگئے اب آپکی ایک نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔۔انہوں نے مجھے وہ پرچہ پکڑایا اور کہا:

''مبارک۔۔۔صاحب آپ پاس ہو گئے ہیں کب روانگی ہے امریکہ؟؟؟'' مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا اور مجھے شدت جذبات سے چکر سا آگیا۔

یقیناً میری زندگی کی ایک نئی صبح طلوع ہوئی تھی۔ یہ لمحہ میرے ہی لئے نہیں بلکہ مجھ سے وابستہ میرے کنبے کے سب ہی لوگوں کے لئے ایک انتہائی اہم، انتہائی مبارک لمحہ تھا میری والدہ جب فجر کے وقت جھوم جھوم کر ایک مناجات:

میری بار کیوں دیر اتنی کری

پڑھتی تھیں اس کی قبولیت کی گھڑی آپہنچی تھی۔ ہسپتال میں جیسے ایک جشن کا سماں تھا۔ڈاکٹر چیپ مین جو ہمارا میڈیکل ڈائرکٹر تھا اپنے کمرے سے باہر نکل آیا تھا مگر مجھے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔میں نے لوگوں کا شکریہ ادا کیا اور بھاگتا ہوا باہر آیا میں جلد سے جلد اپنے گھر پہنچ کر پنی ماں جنہیں میں امّاں کہتا تھا کے گلے لگنا چاہتا تھا۔گھر پہنچا،تقریباً دوڑتا ہوا گھر کا زینہ طے کیا اور کمرے میں گھس کر امّاں کے گلے لگ گیا اسکے بعد مجھے صرف یہ یاد ہے کہ میں اس قدر رویا اس قدر رویا کہ مجھے کچھ ہوش نہیں رہا روتو وہ بھی رہی تھیں مگر میری حالت دیکھ کروہ پریشان ہو گئیں مجھے دلاسہ دیتی رہیں اپنے مخصوص انداز میں کہتی رہیں'' پگلے۔۔اب رونے کی کیا بات ہے اب تو ساری تکلیفیں ساری مشکلیں ختم ہوئیں اللہ نے تمہاری محنت اور تمہارے حوصلے کا تمہیں انعام دیا۔''

میں نے اپنے چاروں طرف نظر ڈالی۔ایک کمرہ تھا جسکی دیواروں کا روغن اُدھڑا ہوا تھا فرش سلیٹی رنگ کے عام سیمنٹ کا تھا اسی کمرے میں امّاں اور ابّا کی دو چار پائیاں اور دردانہ کا ایک کھٹولہ تھا۔کمرے کی مغربی دیوار میں ایک بغیر دروازے کا موکلہ سا کھلا تھا جو فرش سے ڈھائی فٹ اونچا تھا اور اس میں داخل ہونے کے لئے اچھل کر جانا پڑتا تھا۔یہ کسی قسم کا اسٹور یا دوچھتی تھی یہ میری کوٹھری تھی جہاں ایک چار پائی جو اتنی چھوٹی تھی کہ میرے پاؤں کی ایڑیاں اسکی پائینتی کے ڈنڈے سے ٹکراتی رہتی تھیں پڑی تھی اسی کے ساتھ دو پرانے لوہے کے صندوق تھے۔گھر میں باورچی خانہ نہیں تھا اس لئے امّاں نے اسی کمرے میں ایک کونے میں انگیٹھی رکھ کر کھانا پکانے کا انتظام کرلیا تھا۔کمرے کے باہر ایک بہت مختصر صحن تھا۔ یہ تھی ہماری کل کائنات اور وہ بھی کرائے کی جسکا کرایہ بھی میں اپنی چھوٹی سی تنخواہ میں مشکل سے ہی ادا کرپاتا تھا۔

کیا واقعی ہماری زندگی میں انقلاب آسکتا ہے۔کیا یہ سچ ہے۔کیا میں واقعی چند ماہ میں امریکہ کی کسی بہت بڑی یونیورسٹی کے اسکالرشپ پر عازم پرواز ہونگا۔میرا ایک ہم جماعت ڈاکٹر سرفراز مرزا مجھ سے پہلے یہی امتحان پاس کر کے شکاگو جا چکا تھا اور اسکے خطوط میں اس جادونگری کی ناقابل یقین باتیں ہوتی تھیں اس نے مجھے اپنے اسپتال اور اسکے اطراف شکاگو شہر کی کچھ تصویریں بھیجی تھیں۔اس پوری رات میں سونہ سکا رات بھر میرے تصور میں وہ تصویریں گردش کرتی رہیں اسکا اسپتال کئی منزلہ تھا اور جدید فن تعمیر کا مرقعہ،تصویر کشی کا ایک نادر نمونہ ہسپتال کی کھڑکیوں میں روشنیاں جگمگا رہی تھیں اور پوری عمارت کا عکس پاس ہی بہتی جھیل کے پانی میں ہلکورے لے رہا تھا جھیل کے کنارے کنارے بنی ہوئی بل کھاتی سڑک پر ہزاروں کاریں قطار اندر قطار ایک چراغاں کا سماں پیش کر رہی تھیں۔میں ایک احساس تشکر ایک غیر یقینی اور ایک ممکنہ فریب کی سی کیفیت میں مبتلا تھا صبح ہونے والی تھی فجر کا وقت تھا جب اماں کی مترنم آواز۔۔۔وہی مناجات

تجھے زیب ہے اکبری سروری

میری بار کیوں دیر اتنی کری

میرے کانوں میں پڑی۔مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے آج اس آواز اور لہجے میں شکوہ نہیں اظہار تشکر تھا اس رب کا شکر تھا جس کے یہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں۔شاید مجھے انکی میٹھی میٹھی آواز ہی نے تھپکی دے کر سلا دیا کل ایک نیا دن تھا اور میری زندگی کا ایک نیا دور۔۔

امریکا میں ٹریننگ کی تلاش

میں نے یہ سن رکھا تھا کہ اس امتحان کے پاس کرنے کے بعد نہ صرف امریکا کی کسی اچھی یونیورسٹی میں پوسٹ گریجویٹ ٹریننگ کے لئے داخلہ مل جاتا ہے بلکہ وہاں سے ٹکٹ بھی آتا ہے اس لئے اب میری تمام توجہ ایسی ہی کسی یونیورسٹی سے رابطہ کرنے پر مبذول تھی۔اس کام کے لئے ایک موٹی سی ہرے رنگ کی کتاب تھی جس میں امریکی یونیورسٹیوں اور ہسپتالوں کی تفصیلات تھیں۔میں نے ان میں چن کر کچھ ہسپتالوں کو درخواستیں دیں۔میرے دو ہم جماعت سرفراز مرزا اور رفیق سیٹھی ایک سال پہلے امریکا جا چکے تھے۔وہ دونوں شکاگو میں تھے۔سرفراز سے میری خط کتابت تھی اور اسنے مجھے فوراً اپنے ہسپتال

''سینٹ جوزیف ہسپتال'' سے تعیناتی کے کاغذات بھجوادئے جس میں ٹکٹ کی بھی پیشکش تھی۔ یہ وہی ہسپتال تھا جو جھیل مشیگن کے کنارے تھا اور اسکی کئی منزلہ عمارت تصویر میں بیحد دلکش لگتی تھی۔ امریکا میں یونیورسٹی ہسپتالوں کے علاوہ بڑے بڑے پرائیویٹ ہسپتال بھی ٹریننگ کے مجاز ہوتے ہیں اور انکی پیشکشیں عام طور سے مالی لحاظ سے بہتر ہوتی ہیں مگر مجھ پر یونیورسٹی کا بھوت سوار تھا۔ شروع میں تو ارادے بہت بلند تھے کہ میں چاہتا تھا کہ جان ہاپکنز یا ہاورڈ میڈیکل سکول میں ٹریننگ کا موقعہ مل جائے مگر پھر معلوم ہوا کہ ان جگہوں پر تو امریکی میڈیکل کالج کے فارغ التحصیل طلبہ کو بھی مشکل سے ہی جگہ ملتی ہے اس لئے میں نے دوسری سطح کی یونیورسٹیوں میں قسمت آزمائی کی۔ امریکی دارلحکومت واشنگٹن سے مجھے فوراً ایک پیش کش ہاورڈ یونیورسٹی HOWARD UNIVERSITY سے مل گئی میں تو بہت خوش ہوا مگر ڈاکٹر ناظر نے جو امریکا میں کئی سال رہ کر آئے تھے مجھے بتایا کہ واشنگٹن کی زیادہ آبادی سیاہ فام لوگوں پر مشتمل ہے اور یہ یونیورسٹی بھی سیاہ فام عوام کے لئے مختص ہے۔ میں تو اس زمانے میں ''افروایشیائی'' اتحاد اور یگانگت کے جذبے سے بھرپور تھا اور اس بات پر ایک حد تک خوش تھا کہ چلو امریکا میں بھی ایک طرح سے ''اپنوں'' میں رہونگا مگر ڈاکٹر نذیر نے مجھے سمجھایا کہ ہوسکتا ہے اس فیصلے کے میرے مستقبل پر دوررس نتائج ہوں اس لئے میں نے شکریہ کے ساتھ اس یونیورسٹی سے معذرت کر لی۔ اس کے فوراً ہی بعد ڈیٹرائٹ سے ''گریس ہسپتال'' جو وین اسٹیٹ یونیورسٹی کا ٹیچنگ ہسپتال تھا مجھے آٹھ سو ڈالر ماہانہ، مفت رہائش اور مفت کھانے کی پیشکش آئی جو میں نے بغیر کسی حیل وحجت کے قبول کی۔ میرے ریفرنس کے طور پر ڈاکٹر چیپ مین اور ڈاکٹر جونز نے بہت اچھے خطوط لکھے اور چند ہی دن میں میرا اپکا کانٹریکٹ میرے ہاتھوں میں تھا۔

امریکا کی تیاری

میرے ڈیٹرائٹ جانے کے فیصلے پر ڈاکٹر ناظر نے مجھے بتایا کہ ڈیٹرائٹ کو ''موٹرسٹی'' کہا جاتا ہے اسلئے کہ تمام دنیا میں سب سے زیادہ کاریں یہاں تیار ہوتی ہیں اور کاروں کے دنیا کے چار بڑے کارخانے بھی اسی شہر میں ہیں پھر ہنس کر کہنے لگے گرم کپڑوں کی تیاری کرلیں اس لئے کہ وہاں سخت برفباری ہوتی ہے اور ہڈی کا گودہ جمانے والی سردی پڑتی ہے۔ سردی اور برفباری سے ڈرنے کے بجائے میں تو اسے سن کر مزید خوش ہوا کہ میں نے کہانیوں میں تو برفباری کے مناظر پڑھے تھے مگر کبھی برفباری نہیں دیکھی تھی۔ اب مشکل یہ تھی کہ میرے پاس گرم کپڑے نہیں تھے اور نہ ہی میرے پاس کوئی جمع شدہ پونجی جس سے میں کپڑے خرید سکتا۔ رشید حالانکہ امتحان میں کامیاب نہیں ہوا تھا مگر اس کا دل بڑا تھا اور میری تیاریوں میں قدم قدم میرے ساتھ تھا۔ اس نے کہا کہ وہ ہسپتال سے اڈوانس پانچ سو روپے لیکر مجھے دیگا تاکہ میں اپنی تیاری کرسکوں۔ اس کے پانچ سو روپوں سے میں نے ایک گرم سوٹ سلوایا اور چونکہ میں بہت ہی کٹر پاکستانی تھا (اور ہوں) اس لئے میں نے اپنے کلچر کی نمائندگی کرنے کے لئے ایک شیروانی بھی سلوائی ادھر حمیدہ فہمیدہ خالہ نے بھی ایک بہت اچھا سوئٹر بن کر مجھے تحفے میں دیا۔ اسی دوران میرے بچپن کے دوست اشفاق نے جو نیوی میں ابھی ابتدائی درجوں پر تھا اور کوئی بڑا آدمی نہیں تھا مجھے پیش کش کی کہ وہ اپنے چھوٹے سے گریجوٹی فنڈ سے دو ہزار روپے نکال کر ٹکٹ خریدنے میں میری مدد کرسکتا ہے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ میرا ٹکٹ امریکا سے آرہا ہے۔ میں نے اسکا شکریہ ادا کیا مگر تمام لوگوں کی یہ سب نیکیاں میرے دل پر نقش ہیں اور رہینگی۔

امریکا کا ویزا

سب سے پہلے تو پاسپورٹ کی ضرورت تھی کہ میرے پاس پاسپورٹ ہی نہیں تھا۔ اس زمانے میں پاسپورٹ ملنا ایک کار دارد تھا۔ کئی مہینوں کے چکروں اور رشوتوں کے بعد پاسپورٹ دستیاب ہوتا تھا۔ میرے دوست چندر نوتانی کو بھی بڑے پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔ اس نے اسکا ذکر اپنی آپ بیتی میں بڑے تلخ انداز سے کیا ہے۔ میں بھی ڈرا ہوا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ گریس ہسپتال میں رپورٹ کرنے کی تاریخ ہی نکل جائے۔ اس سلسلے میں صفات ماموں جو پولس کے ایک اعلی عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے نے میری مدد کی اور ایک ہفتے میں میرا پاسپورٹ میرے حوالے کردیا۔

اب امریکی ویزا کا مرحلہ تھا۔۔ کیا زمانہ تھا!! آج سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ دنیا کتنی بدل گئی ہے۔ کراچی ایک نہایت خوبصورت اور صاف ستھرا شہر تھا۔ امریکی ایمبیسی (جو بعد میں کونسلیٹ بن گئی) کراچی کے سب سے اچھے علاقے فریرہال کے سامنے تھی۔ فریرہال کے چہار طرف خوبصورت سبزہ زار ہیں اور اس سے ذرا پہلے ریکس سنیما کے سامنے کراچی کا مشہور چوراہا جس کے درمیان سنگ مرمر کا فواہ تھا جس کی شکل ایک ستار کی طرح تھی اور رات کو اس پر رنگ برنگی روشنیاں پڑتیں تھیں اس میں پانی کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ موسیقی بجتی تھی۔ اسے musical fountain کہتے تھے۔ نہ کہیں رکاوٹیں تھیں نہ ہی چیک پوسٹ۔ ایمبیسی کے سامنے کسی قسم کی رکاوٹ نہ تھی اور نہ ہی مشین گن سے لیس گارڈز۔ امریکا کا ویزا ملنا اس قدر آسان تھا کہ اگر آپ کے پاس کسی بھی قسم کی اعلی ڈگری ہے تو اندر گھس کر ایک درخواست دینے کی ضرورت ہے۔ میرے ایک ماموں نفاست حسین اس ایمبیسی میں کام کرتے تھے اور میں کبھی کبھی وہاں کی کیفیٹیریا میں ان کے ساتھ اناناس کا جوس پینے چلا جاتا تھا۔ میرے پاس ڈیٹرائٹ سے آئے ہوئے تمام کاغذات تھے اس لئے میں تو ایمبیسی کے اندر بڑے فخر سے داخل ہوا کیونکہ مجھے اسکا احساس تھا کہ میں ان سے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے تو خود تمہارے ملک والوں نے مدعو کیا ہے۔ میں نے صبح کوئی دس بجے اپنے کاغذات جمع کروائے اور مجھے دوپہر دو بجے ویزا مل گیا۔

کامیابی کی خوشی میں میری دعوت

میرے گھر سمیت تمام خاندان میں میری کامیابی کی بہت خوشی

تھی۔لوگ خلوص ومحبت سے کہتے بھی تھے کہ بھئی دعوت کھائیں گے۔اس موقع پر میرے بہنوئی اظہار بھائی کو اس بات کا خیال آیا کہ اس خوشی میں فیروز کی دعوت ہونی چاہئے اور خاص طور سے اسکے ساتھ کام کرنے والے سیونتھ ڈے کے تمام ڈاکٹروں کو مدعو کرنا چاہئے اس کے لئے انہوں نے اظہر بھائی جان کی کوٹھی کا انتخاب کیا۔اظہر بھائی جان میرے ماموں زاد بھائی تھے۔ان پر اللہ نے بڑا کرم کیا تھا اور اپنی رحمت کے دروازے وا کردئے تھے اس میں بلاشبہ انکی اپنی صلاحیتوں کا بھی بڑا عمل دخل تھا۔انکی تجارت امریکا سمیت تمام دنیا میں پھیلی تھی۔میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ اس دور میں ناظم آباد کا بلاک چار کراچی کی ایک اعلیٰ ترین بستی تھی یہاں کئی مشہور ہستیاں اور فلمسٹار رہتے تھے۔اظہر بھائی جان کی کوٹھی یہاں کی سب سے بڑی اور حسین ترین کوٹھی تھی۔اسکا ڈیزائین بڑا انوکھا تھا۔خوبصورتی سے تراشے ہوئے لان کے بعد ایک بہت بڑا ڈرائنگ روم تھا۔ اس میں داخلے کے لئے چار چوڑی چوڑی سیڑھیاں تھیں جو ایک نیلگوں پانی کے حوض کے اوپر سے گذرتی تھیں۔ڈرائنگ روم کا اگلا حصہ اس حوض کے اوپر جھکا تھا اور اس پر رنگین روشنیاں لگی تھیں جن کا عکس حوض کے پانی میں جھلکتا تھا۔حوض میں سیڑھیوں کے دونوں جانب فوارے تھے۔جس شام میری دعوت ہوئی اس دن تمام روشنیاں اور فوارے اپنی پوری آب وتاب دکھا رہے تھے۔کھانا لمبی لمبی میزوں پر بٹھا کر کھلایا گیا اور باوردی بیرے گردش میں تھے۔سیونتھ ڈے ہسپتال کے نہ صرف پاکستانی ڈاکٹر بلکہ سارے غیر ملکی اور سفید فام ڈاکٹر بھی اس میں شریک ہوئے۔دیر تک محفل گرم رہی اور میں سب کی توجہ کا مرکز رہا۔میرے گلے میں اس قدر ہار ڈالے گئے کہ میرا دم گھٹنے لگا۔یہ سب کچھ اس لئے بھی تھا کہ میں خاندان کا پہلا شخص تھا جو اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکا جا رہا تھا۔میرا دل اللہ کے شکرانوں سے بوجھل تھا کہ میں جو صرف چوبیس سال کا نوجوان، میرپور خاص کا پروردہ اور نسبتاً مفلس گھرانے کا فرد تھا اللہ نے اسکو اس عزت اور اعزاز سے نوازا۔شکر ہے میرے مالک، میں آج بھی اپنی حقیقت نہیں بھولا ہوں اور ہر گھڑی تیری ان نوازشوں کا شکر گذار رہتا ہوں۔

ایک غیر متوقع مشکل

یہ واقعہ تحریر کرتے ہوئے میں نے پھر کئی بار سوچا ہے کہ مبادہ اس میں کسی کی تحقیر ہو مگر چونکہ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ ہر قابل ذکر واقعہ تحریر کرونگا اس لئے اسے بھی تحریر کرنا ضروری ہے اس لئے کہ مجھے اس وقت ایسا جھٹکا لگا تھا کہ میں اسے آج تک نہیں بھولا ہوں۔میرے کانٹریکٹ کے تحت ڈیٹرائٹ سے میرا ٹکٹ آنا تھا۔اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ اس ٹکٹ کی رقم میرے وظیفے سے نہایت آسان قسطوں میں جو شاید بیس ڈالر مہینہ ہوتی کٹ جائیگی۔میں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ اگر آپکی کارکردگی بہت اچھی ہو تو چند قسطوں کے بعد باقی رقم معاف ہو جاتی ہے۔مجھے اس کا یقین تھا کہ میری بھی یہ رقم معاف ہو جائیگی۔میں نے اپنے طور پر طے کیا تھا کہ میں بائیس جون ۱۹۷۰ء کو کراچی سے لندن کے لئے پرواز کرونگا اور وہاں پانچ دن رہ کر (کہ لندن دیکھنے کی خواہش تو بچپن سے دل میں ایک آگ کی طرح روشن تھی) ستائیس جون کو ڈیٹرائٹ کے لئے نکلونگا۔مجھے ہسپتال میں یکم جولائی کو رپورٹ کرنا تھی۔روانگی میں ابھی کئی ماہ تھے۔میں ابھی ہسپتال کو اپنے ٹکٹ کے لئے لکھنے ہی والا تھا کہ ایک دن ڈاکٹر ناظر میرے پاس آئے اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپکو امریکی ہسپتال کو بھی ٹکٹ کے پیسے واپس کرنے تو ہونگے تو ایسا کیوں نہیں کرتے کہ میں آپ کو ٹکٹ خرید دونگا اور جب میں بھی واپس امریکا پہنچ جاؤں تو آپ مجھے یہ روپئے ڈالرز کی شکل میں واپس کردیں انہوں نے مزید کہا کہ آپ کہاں اس الجھن میں پڑینگے کہ ڈیٹرائٹ خط لکھیں اور وہاں سے ٹکٹ منگوائیں۔ایک تو میں ڈاکٹر ناظر کا اخلاقی طور پر بہت احسان مند تھا دوسرے مجھے اس میں کوئی قباحت نہ نظر آئی میں نے کہا یہ تو کوئی بڑی بات نہیں ہم ایسا ہی کرلینگے۔ڈاکٹر ناظر کے ایک رشتہ دار جاپان ائرلائنز میں کام کرتے تھے جو ان سے دن رات ملنے آتے رہتے تھے۔انہوں نے تاریخیں لیکر میرے ٹکٹ کا وعدہ کرلیا۔کراچی ،لندن، نیو یارک ، کا ٹکٹ ساڑھے تین ہزار روپئے کا تھا جو میرے لئے بہت بڑی رقم تھی (اس زمانے میں ٹویوٹا کی بڑی کار، کورونا اٹھارہ ہزار روپئے کی آتی تھی)

وقت تیزی سے گذرا۔میں سفر کے مسرت آگیں تصور سے سرشار تھا اور اب جانے میں صرف دس دن باقی تھے۔ایک سہ پہر میں اس کمرے میں بیٹھا تھا جو رشید اور مجھے ملا ہوا تھا اور میں اپنے مستقبل کے ہسپتال کی بھیجی ہوئی ڈیٹرائٹ شہر کی تصویریں دیکھ رہا تھا کہ ڈاکٹر ناظر میرے کمرے میں آئے اور مجھ سے نہایت سپاٹ اور غیر جذباتی لہجے میں کہا ڈاکٹر فیروز آپ اپنے ٹکٹ کا خود ہی بندوبست کرلیجئے گا میں آپ کا ٹکٹ نہیں خرید پاؤنگا۔وہ لمحہ مجھ پر کتنا بھاری تھا اور ان چند جملوں نے مجھ پر کیا اثر کیا اسکا بیان مشکل ہے۔میرے جانے میں صرف دس دن باقی تھے ڈیٹرائٹ میں اپنے ہسپتال کو میں منع کرچکا تھا اور اب اس قلیل مدت میں ان سے رابطہ یا کسی قسم کی مدد ممکن نہیں تھی۔ماضی میں مجھے خاندان سے جس قسم کی مایوسی ہوئی تھی اسکی وجہ سے میں ایک ایسی خودی بلکہ ''انا'' میں مبتلا ہو گیا تھا کہ مرجاتا مگر خاندان کے کسی فرد کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔مجھے اس کے علاوہ کچھ نظر نہیں آرہا تھا کہ میں امریکا نہیں جا پاؤنگا۔اگلے سال کیا ہوگا یہ کون جانے۔مجھے اپنے سارے خواب ٹوٹتے بکھرتے نظر آئے۔ڈاکٹر ناظر تو یہ کہہ کر چلے گئے مگر مجھ پر تو جیسے غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ایسا لگا کہ کنارہ ہاتھوں میں آتے آتے چھوٹ گیا ہو۔میرے دوستوں کے حلقے میں کوئی ایسا نہیں تھا کہ وہ اتنی بڑی رقم کا بندوبست کرسکے۔میں ہچکیوں سے میز پر سر رکھ کر خوب رویا۔

ڈاکٹر محسن احمد۔۔ایک حقیقی محسن

میری داستان حیات میں میں نے کئی فرشتوں کا ذکر کیا ہے بلکہ یہ سرگزشت لکھنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ قارئین کو یہ باور کراؤں کہ دنیا میں بے لوث اور نیک لوگوں کی کمی نہیں۔

میں نے گزشتہ ابواب میں ڈاکٹر محسن احمد کا تزکرہ بڑی محبت اور عزت سے کیا ہے۔ یہ ہمارے یہاں پارٹ ٹائم بچوں کے اسپیشلسٹ تھے۔ چونکہ کم کم آتے تھے اس لئے اگر چہ ان سے بھی تعلقات تو تھے مگر ڈاکٹر ناظر جیسی قربت نہ تھی۔ وہ سیونتھ ڈے ہسپتال میں شام کی کلنک کیا کرتے تھے۔ میں رو رو کر تھک گیا تھا اور وہیں میز پر سر رکھ کر سوچوں میں گم تھا کہ دروازہ کھلا اور ڈاکٹر محسن احمد اپنے پورے چھ فٹ متاثر کن قد اور دائمی دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ مجھ سے کہنے لگے ''بھئی فیروز کب روانگی ہے؟'' میں نے اپنا آنسوؤں بھرا چہرہ اٹھایا اور ان سے کہا خیال تھا کہ بائیس جون کو روانہ ہو جاؤنگا مگر لگتا ہے اس سال نہ جاسکوں اور پھر اگلے سال کس نے دیکھا ہے؟؟ کہنے لگے بھئی کیوں؟ تمہاری تو تیاری مکمل تھی۔ میں نے اپنی دکھی آواز میں انکو سارا قصہ سنایا اور کہا ڈاکٹر ناظر نے آخری وقت میں ٹکٹ خریدنے سے انکار کر دیا ہے۔ تھوڑی دیر ''چک چک'' کرتے رہے پھر پوچھا کتنے کا ٹکٹ ہے میں نے بتایا۔ بس کچھ ہی لمحے سوچا، پھر کہنے لگے کل صبح دس بجے مجھ سے یہیں ملنا۔ یہاں میں یہ وضاحت کر دوں کہ انہیں خود انگلینڈ سے آئے چند ہی مہینے ہوئے تھے اور ابھی وہ اپنی پریکٹس جمانے کی جدو جہد کر رہے تھے۔ انکے دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے اور یہ سب کو معلوم تھا کہ انگلینڈ سے آنے والے ڈاکٹروں کے پاس بہت زیادہ سرمایہ نہیں ہوتا کیونکہ وہاں تنخواہیں بہت کم تھیں اور آتے ہوئے کار اور گھر کی دوسری اشیا خریدنے کے بعد بہت کم رقم بچتی تھی مگر ڈاکٹر احمد جو مجھ سے بہت قریب بھی نہیں تھے میرے لئے یہ نیکی کرنے کو تیار تھے۔ دوسرے دن وہ مجھ سے حسب وعدہ ملے اور مجھے لیکر وکٹوریا روڈ پر اپنی بنک گئے۔ وہاں سے انہوں نے ڈاکٹر ناظر کے کزن کے حوالے سے ساڑھے تین ہزار روپے کا جاپان ائر لائن کے نام بنک ڈرافٹ کٹوایا، اس کے علاوہ انہیں اسٹیٹ بنک کے لئے کسی قسم کا مچلکہ بھی بھرنا پڑا اور پھر وہ ہی مجھے جاپان ائر لائن کے دفتر چھوڑ گئے میں کیسے ایسے فرشتہ خصلت انسان کے اس احسان کو بھول سکتا ہوں۔ میں نے اگر چہ امریکا آکر انکی رقم جلد ہی واپس کی مگر میری زندگی کے اس مقام پر انکی بے لوث مدد حقیقت میں ''انمول'' تھی۔ آج وہ کراچی کے سب سے برے بچوں کے اسپیشلسٹ ہیں کراچی کی تمام بڑی بڑی اور مشہور فیملیز کے بچے انکے ہاتھوں پل کر جوان ہوئے ہیں۔ انہیں اتنا بڑا مقام شاید اللہ نے انکی نیک فطرت کے صلے ہی میں عطا کیا ہے۔ میں نے زندگی بھر انکی احسان مندی کے ساتھ عزت کی ہم آج بھی ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں میں کراچی جا کر انہی کے یہاں ٹھہرتا ہوں۔ اگر چہ وہ مجھے اپنا دوست کہتے ہیں مگر میں اب بھی خود کو انکا شاگرد سمجھتا ہوں کہ ۱۹۶۹ میں جب میں ''نیم لفٹین'' قسم کا ڈاکٹر تھا وہ سیونتھ ڈے ہسپتال کے بچوں کے وارڈ میں میرے استاد تھا۔

روانگی، الوداع پاکستان

اب میرے روانہ ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ ٹکٹ اور ویزا لگا پاسپورٹ میرے پاس تھا۔ ایک ایک دن گنا جارہا تھا۔ میں نے ہسپتال سے فراغت حاصل کر لی تھی اور زیادہ تر دن میں گھر ہی پر رہتا تھا رشید ہسپتال سے فارغ ہو کر ہمارے یہاں آجاتا تھا۔ میں اب بھی اسی ''ٹال والا گھر'' میں رہ رہا تھا۔ امّاں ابّا پر عجب جذبات طاری تھے۔ دونوں میری جدائی سے بہت غم زدہ تھے۔ انہیں ایک انجانا خوف تھا کہ انگلینڈ تو جانا پہچانا تھا پھر وہ پاکستان سے قریب تھا سب سے بڑی بات یہ تھی کہ انگلینڈ تو ہمارے خاندان کے کئی افراد جاچکے تھے اور اب بھی وہاں کچھ لوگ رہ رہے تھے مگر امریکا کوئی نہیں گیا تھا۔ امّاں تو میر پور خاص سے میرے جام شورو جانے پر اداس ہو جاتی تھیں اب تو میں بہت دور، بہت دور جارہا تھا۔ اسی کے ساتھ میرے ابّا اور امّاں کو اس بات کی بھی خوشی تھی کہ میں ایک اعلیٰ مقصد کے لئے اور کامرانی سے دنیا کے سب سے ترقی یافتہ ملک جارہا ہوں پھر بھی میری امّاں مجھ سے چھپ چھپ کر کبھی کبھی کسی کونے میں رو لیتی تھیں۔ ابّا کے چہرے پر بھی کبھی کبھی اداسی کے سائے لہراتے نظر آتے تھے۔ میری امّاں ہر روز میری پسند کا کھانا پکاتیں اور مجھے کھلاتے ہوئے ضرور کہتیں اب کہاں تمہیں ایسے کھانے ملیں گے معلوم نہیں کون پکائیگا کون کھلائیگا؟

ملک سے باہر جانے کے لئے غیر ملکی کرنسی کی ضرورت تھی اس زمانے میں غیر ملکی کرنسی پر سخت پابندی تھی۔ میں اسٹیٹ بنک گیا جہاں ایک افسر نے مجھے رکھائی سے بتایا کہ مجھے ایک ڈالر یا پاؤنڈ بھی نہیں مل سکتا۔ میں نے اپ سیٹ ہو کر کہا کہ آپ میرے لئے دو ہی راستے چھوڑ رہے ہیں یا تو میں بلیک مارکیٹ سے پاؤنڈ خریدوں یا لندن اتر کر ائر پورٹ پر بھیک مانگوں اس لئے کہ میں جاؤنگا تو ضرور اور مجھے کم از کم لندن میں بس کے کرایہ کے لئے ایک دو پاؤنڈ کی ضرورت تو ہوگی۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ میں پریشان تھا کیونکہ مجھے معلوم نہ تھا کہ بلیک مارکیٹ سے پاؤنڈ کیسے خریدے جاسکتے ہیں۔ دوسرے دن شام کو اظہر بھائی جان مجھے خدا حافظ کہنے آئے اور جاتے ہوئے انہوں نے مجھے ایک لفافہ دیا اور کہا اس میں پانچ پاؤنڈ کا نوٹ ہے تمہارے کام آئیگا اور اس کے ساتھ ہی ایک رقعہ اپنی کمپنی کی لندن برانچ کے نام دیا کہ وہ مجھے پچیس پاؤنڈ دے دیں۔ اس سے مجھے بڑی تقویت ملی۔

بائیس جون ۱۹۷۰ بروز پیر شام نو بجے میں کراچی ائر پورٹ پر تھا۔ اس ائر پورٹ پر میں ماضی میں کتنی بار آیا تھا، کیسی حسرت آتی تھی جب پی آئی اے کی پرواز ''پی کے'' لندن کے لئے تیار ہے کا اعلان سنا کرتا تھا۔ آج میں بھی اسی ائر پورٹ پر تھا اور لندن کے لئے عازم پرواز تھا۔ خاندان کے لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو مجھے الوداع اور خدا حافظ کہنے آیا تھا۔ دور دور کے رشتہ دار پیار اور خلوص سے میرے گرد جمع تھے۔ سخت گرمی کے باوجود میں اپنے نئے نئے سلے ہوئے سرمئی سوٹ میں پسینے میں شرابور تھا۔ ایک بار پھر میں ہاروں میں لدا تھا۔ اتنے لوگ امام ضامن لیکر آئے تھے کہ میرا سیدھا بازو ان سے ڈھک گیا تھا اور چونکہ انہیں کوٹ کی آستین کے اوپر باندھا گیا تھا میری حالت عجب مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ ائر

پورٹ کے جنرل ہال میں دوسرے مسافروں کی وجہ سے بہت کھچ پچ تھی اس لئے اظہار بھائی نے جو کسٹم کے بااختیار افسر تھے میرے قریبی خاندان کے افراد کے لئے اسپیشل لاؤنج کھلوا دیا اور ہم وہاں چلے گئے۔ میرے چچا ظفر عباس، میری پھپّی قمر بانو جو اپنی تعلیمی معیار کی وجہ سے ہمارے لئے روشنی کا مینار تھیں، صفات ماموں اور ذوالفقار بھائی جان کے کنبے، سب ہی موجود تھے۔ میری امّاں خاموشی سے آنسو بہا رہی تھیں اور منہ ہی منہ میں مستقل دعائیں پڑھ رہی تھیں۔ جہاز میں سوار ہونے کے لئے بس میں بورڈ ہونے کا اعلان ہوا سب لوگ گلے ملے، امّاں نے گلے لگتے ہوئے رندھی آواز میں کہا ''اتنے دور جا رہے ہو، اب پتہ نہیں کب تمہیں دیکھونگی۔'' میرے دل پر چوٹ لگی۔ میں اپنی امّاں کو کبھی اداس نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے انکے گلے لگ کر وعدہ کیا کہ امّاں ایک سال نہیں گزرے گا کہ میں انشاللہ ملنے واپس اسی ائر پورٹ پر کھڑا ہونگا (میں نے نہ صرف اس سال اُن سے کیا ہوا یہ وعدہ پورا کیا بلکہ جب تک وہ حیات رہیں میں ہر سال ان کی قدم بوسی اور ماما کو ٹھنڈک پہنچانے کے لئے پاکستان آتا رہا) میرے ابّا بڑے مضبوط دل کے مالک تھے۔ مگر جب وہ رخصت کے وقت مجھ سے گلے ملے تو وہ بھی سسکیاں لینے لگے اور انہوں نے بے ساختہ مجھے لپٹا کر میری گردن پر پیار کر کیا۔ میں سب کو ہاتھ ہلاتا ہوا بس کی جانب بڑھا۔ تھوڑی دور چل کر بس ایک بہت بڑے ہوائی جہاز، جس پر پاکستان انٹرنیشنل ائرلائنس لکھا تھا اور جسکے دونوں پروں پر سرخ بتیاں جل بجھ رہی تھیں کھڑی ہو گئی۔ مسافروں کی ایک قطار کے ساتھ میں بھی اس لمبی اور اونچی سیڑھی کی جانب چل دیا جو جہاز کے دروازے تک جاتی تھی۔ میری باری آئی، میں نے پہلے پلٹ کر ہوائی اڈے کی عمارت کی طرف دیکھا اور پھر اللہ کا نام لیکر جہاز کی پہلی سیڑھی پر اپنا قدم رکھ دیا۔ یہ پہلا قدم تھا میرے مستقبل کی جانب، جس کے لئے میں پر امید تھا کہ اللہ اسکو کامیابی، سربلندی اور سرفرازی عطا فرمائیگا۔۔

قارئین کرام

یہاں میں اپنی سرگزشت کا اختتام کرتا ہوں۔ یہ میری زندگی کے پہلے اور انتہائی اہم دور کی کہانی تھی۔ یوں تو ابھی بہت کچھ باقی ہے مگر مختصراً اس لمحے، جب میں نے ۲۲ جون ۱۹۷۰ء کو کراچی سے لندن جانے والی پرواز کے لئے پہلا قدم اٹھایا تھا، آج تک مجھے اللہ تعالیٰ نے اتنا نوازا، ایسی عزت دی اسقدر مالی فراوانی عطا کی اور ایسے مرتبے سے نوازا کے اسکا ذکر صرف خود ستائی سمجھا جائیگا۔ ان عنایات کے لئے میں باری تعالیٰ کے شکرانے ادا نہیں کر سکتا۔ مجھ پر آپ کا شکریہ بھی واجب ہے کہ آپ نے اس گمنام شخصیت کی داستان حیات کو قبولیت بخشی۔ زندگی کے متعلق اس شعر پر اجازت چاہتا ہوں

نہ ہوئی یہ زندگانی کسی دور میں مکمل
یہی ایسی داستاں ہے جسے نا تمام دیکھا

''گم شدہ شناخت''

تخلیقی وصف خدائے بزرگ و برتر کا ایسا نادر و نایاب عطیہ ہے کہ جو انسان کو اُس کے نائب کے رتبے پر فائز کرتا ہے اور جب اوپر والا اپنے کسی خاص بندے پر مہربان ہوتا ہے تو اُسے ایک سے زائد اوصاف سے نواز دیتا ہے۔ جناب انل ٹھکر رب کے اُنہی خاص بندوں میں شمار ہوتے ہیں جنہیں قدرت نے افسانہ، ناول، ڈرامہ اور فلم پر بیک وقت کمال اور کمانڈ عطا کیے۔ اُن کا قلم جس صنف کا رُخ کرتا ہے وہ صنف منہ سے بول کر قاری کو اپنی جانب نہ صرف متوجہ کرتی ہے بلکہ اُس کی ایسی گرفت بھی کرتی ہے کہ دنوں، ہفتوں اور مہینوں قاری اُس کے سحر سے نکل نہیں پاتا۔ کئی مواقع ایسے بھی آتے ہیں جب انل صاحب کا قلم بے باک ہونے کے لیے بے چین ہو جاتا ہے مگر اُن کے ارادے کی مضبوطی اور پاکیزہ خیالات قاری کو سب کچھ دکھانے اور بتلانے کے باوجود کسی طرح کے ہیجان اور وقتی لذت سے دوچار نہیں کرتے۔ اُن کا منشائے مقصود معاشرے کے سدھار کے ساتھ قاری کے ذہن و قلوب کی تہذیب و تطہیر ہوتی ہے اور جس میں وہ ہمیشہ کی مانند اس بار بھی کامیاب و کامران ٹھہرے ہیں۔ انل ٹھکر صاحب کا کمال یہ ہے کہ مسلسل ناول کا ہر باب اپنے اندر ایک مکمل کہانی لیے ہوئے ہے جسے پڑھ کر قاری کی تسکین بھی ہوتی ہے اور تہذیب بھی۔ اب یہ قاری پر منحصر ہے کہ وہ ایک کاش پر تکیہ کرتا ہے یا پورے پھل سے سیر ہونا چاہتا ہے۔ جیت ہر صورت میں مصنف کی ہوتی ہے کیونکہ ہر باب ایک نئے جہانِ معنیٰ کے ساتھ ساتھ معاشرے کی اُن تمام ناپسندیدہ تصاویر کا احاطہ کیے ہوئے ہے جو تیزی سے ہمیں اندر سے کھوکھلا کیے جا رہی ہیں۔

اشاعت: ۲۰۱۴ء، قیمت: ۳۵۰ روپے، دستیابی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، دہلی، بھارت۔

چند سیپیاں سمندروں سے

(سفرنامۂ جنوبی افریقہ سے انتخاب)

پروین شیر (کینیڈا)

قسط......۲

سوال

اُس کے ہم سفر، امریکی سیاح۔۔۔سب بے نیازی سے اُس گھر کے رہنے والوں کی کٹھن زندگی کو تفریحی نظروں سے دیکھ کر باہر نکل گئے تھے۔ کچھ پیسے دے کر۔ جو ایک رسم تھی۔۔۔زندگی کے تضادات پروین کے لیے ایک معمہ تھے۔ اُس گھر سے باہر آ کر گرد آلود تنگ گلیوں میں سب کینن کے ساتھ ساتھ اس علاقے کا معائنہ کر رہے تھے۔ ہر طرف بدرنگ چھوٹے چھوٹے مکانات اور خستہ حال مکیں تھے۔ سب سیاح اُس گھر سے یوں باہر نکل آئے تھے جیسے بچے دلچسپ، انوکھی فلم دیکھ کر سینما ہال سے نکلتے ہیں۔ زندگی کا یہ بھی ایک عجیب پہلو ہے۔ خوفناک قصے کہانیاں اور ڈراؤنی فلمیں بھی تفریحات میں شامل ہیں۔ سوئیٹو Soweto کا یہ علاقہ۔۔۔یہ کچی گلیاں دیکھ کر وطن کی یاد آ رہی تھی۔ ننگے پاؤں کھیلتے ہوئے پھٹے کپڑوں میں معصوم بچے جو سیاحوں کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ شاید ان کے لیے یہ لوگ عجوبہ تھے۔ ایک بچہ۔۔۔تقریباً سات سال کا۔۔۔فراز کے قریب آ گیا تھا۔ اس نے اپنا نام سلیمان بتایا تھا۔۔۔اُس ذہین بچے نے بلا جھجک باتیں شروع کر دی تھیں وہ فراز کا پروفیشن پوچھ رہا تھا۔ کچے ذہن کے پختہ سوال نے حیران کر دیا تھا۔۔۔پھر اس نے کہا تھا وہ ایک بڑا وکیل بننا چاہتا ہے۔ وہ اُس معصوم ننھے سے دل کی اونچی اڑان کے خواب کے متعلق سن کر حیرت زدہ تھی کچھ اداس بھی۔ اس کو ایک سوال نے بے چین کر دیا تھا کہ کیا یہ معصوم اپنا خوبصورت خواب پورا کر سکے گا؟ اب تقریباً بیس بچوں کا جھنڈ سیاحوں کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ کچھ دور پر ایک چھوٹی سی دوکان تھی جہاں چوکلیٹ اور کھلونے برائے فروخت تھے۔ کینن سے اجازت لے کر پروین نے اُن بچوں کے لیے چوکلیٹ اور کھلونے خریدے تھے۔ کینن نے ان بچوں کو ایک لمبی قطار میں کھڑا کر دیا تھا اور پروین باری باری انہیں یہ سوغات بانٹ رہی تھی۔ ان کی آنکھوں کی چمک میں ڈوب رہی تھی۔ انہیں خوشی مل رہی تھی اور اُسے زندگی کے معنی، انہیں چوکلیٹ کی مٹھاس کی لذت اور اُسے زندگی کے مقصد کی آگہی کی لذت، ان کی آنکھوں کی چمک اور اُس کی روح کو طمانیت، انہیں کھلونوں اور چوکلیٹ کی دولت اور اسے اپنی بیکار زندگی کے کارآمد ہو جانے کی دولت۔۔۔پل بھر کے لیے ہی سہی۔۔۔ان کی نامکمل خواہشات کچھ دیر کے لیے پایہ تکمیل تک تو پہنچی تھیں۔

فراز نے ان بچوں سے باتیں کیں تو ایک جھنڈ چلا آیا تھا اس کے اردگرد۔۔۔جیسے وہ ان کا پرانا دوست ہو۔ پروین کی آنکھیں فراز کی نرمی، رحمدلی اور انسانیت دیکھ کر نم ہو گئی تھیں۔ سب بچوں کو فراز بھی کھلونے اور بسکٹ خرید کر دے رہا تھا۔ وہ ان کا ہیرو بن گیا تھا۔ وارث اپنے بیٹے کو فخر کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔۔۔پروین کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔

گروپ کے باقی سیاح دور کھڑے۔۔۔حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ شاید ان کا وقت ضائع ہو رہا تھا لیکن وہ لمحہ پروین کے لیے بے حد اہم تھا جو معصوم لبوں پر مسکراہٹ لایا تھا۔ وہ ان کے چہروں پر کھلے ہوئے پھول دیکھ رہی تھی۔ سوچ رہی تھی، خوش ہو رہی تھی، اُداس ہو رہی تھی، الجھ رہی تھی، بے بسی محسوس کر رہی تھی نہ جانے کیوں۔ بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے وہ وین میں آ کر بیٹھ گئی تھی جہاں اس کے گروپ کے سیاح پہلے ہی بیٹھ چکے تھے۔ وہ وہاں سے واپس جانا نہیں چاہتی تھی۔۔۔کچھ دیر اور ان گلیوں میں گزارنا چاہتی تھی۔۔۔لیکن۔۔۔وہاں ہر لمحہ، ہر منٹ کا حساب تھا۔ ہر جگہ جانے کا وقت مقرر تھا سو وہ لوٹ آئی تھی۔ اس دنیا میں بھی تو زندگی کی سیاحت مقرر ہے۔ نہ ایک منٹ آگے نہ پیچھے۔ وہ بچے دیر تک جاتی ہوئی سیاحوں کی وین کو دیکھتے رہے جب تک وہ انہیں نظر آتی رہی تھی۔ وہ بھی وین کی کھڑکی سے انہیں دور ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ وین ٹاؤن شپ کے علاقے سے گزر رہی تھی۔ تنگ گلیاں، ان پر پڑے ہوئے خاشاک، چھوٹے چھوٹے بوسیدہ گھروں کے باہر بے فکری سے بیٹھے ہوئے لوگ ایک دوسرے کا دل بہلاتے ہوئے گپوں میں مصروف۔۔تاروں پر سکھانے کے لیے پھیلائے ہوئے رنگ برنگے کپڑے دھوپ کے قطرے اپنی رگوں میں جذب کر رہے تھے۔ ہر گلی میں ہنستے ہوئے بچے گرد سے لپٹے ہوئے ٹھیکروں سے کھیل رہے تھے۔ یہی ان کی تفریح تھی۔ ان کے چہروں پر سکون تھا، قناعت تھی، آسودگی تھی۔ کیونکہ وہ صرف اپنی محدود دنیا کو جانتے تھے۔ جہاں چار گھروں کے بیچ ایک نل کا پانی نصیب تھا۔ اس سے باہر کیا ہے انہیں معلوم نہ تھا۔ ان کے لیے غیر ملکی سیاح شاید کسی اور سیارے کے باشندے تھے۔ وہ اس دنیا سے دور اس دنیا کے متعلق سوچ رہی تھی جہاں بچوں کو قیمتی پوشاک نصیب ہے۔ ٹینس، بیڈمنٹن، سنوکر، آئس ہاکی، اور باسکٹ بال جیسے کھیل انہیں ڈھیروں تفریح کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ جو ٹھیکرے اور پتھر اس سرزمین کے بچوں کے کھیل کا سامان ہیں وہاں یہ کوڑا کرکٹ ہیں جو ان کے قدموں سے ہٹا کر صاف کر دیے جاتے ہیں۔

ایک بدرنگ خستہ حال چھوٹے سے گھر کے باہر زنگ آلودہ مڑا ہوا ٹین کا بورڈ تھا۔ جس پر ڈے کیئر Day Care لکھا ہوا تھا۔ بے ساختہ اُسے وہ ڈے کیئر یاد آ گیا تھا جس کی عمارت خوبصورت اور عالی شان ہے۔ جہاں خوش لباس بچے چمچماتی رولس، پورش اور بی۔ایم۔ڈبلیو جیسی کاروں میں آتے ہیں۔

یہاں اپنی پیٹھ پر مائیں بچوں کو اس ڈے کیئر تک لا رہی تھیں۔۔۔ان کچی گلیوں نے اس کا ہاتھ اس مضبوطی سے تھام لیا تھا کہ وہ وہاں کچھ اور رکنا چاہتی تھی لیکن واپس ہموار پختہ سڑکوں پر آنا ہی تھا۔۔۔اونچے نیچے راستے دور ہو رہے تھے۔ وین پختہ سڑک پر پھسل رہی تھی۔ زندگی اپنی تہیں کھول رہی تھی۔ سوچ کے دروازے وا ہو رہے تھے۔ کھڑکی کے باہر مکئی کے کھیت لہرا رہے تھے یو پا خاموشی سے وین چلا رہا تھا۔ کینن نے اپنے ہاتھوں میں مائک تھام لیا تھا۔ اپنی کومینٹری شروع کر دی تھی۔ کچھ لوگ اسے سن رہے تھے۔ کچھ ان گلیوں کی گندگی، گردوغبار اور گھٹے ہوئے ماحول سے تھک کر اونگھ رہے تھے۔ لیکن کینن کو بولنا تھا اور وہ بول رہا تھا۔ وہ انسائیکلوپیڈیا جیسا تھا۔ ہر سوال کا جواب اس کے پاس موجود تھا۔ وہ بھی اس سے سوال کرتی جاتی تھی۔ افریقن ادب پر سوالات کے جواب میں کینن نے کہا تھا۔۔۔''وہاں کے صحافی اپاٹ ہائیڈ کے دوران Band کر دیے گئے تھے۔ کئی مصنف ملک چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ لیکن ادبی دنیا وہاں ہمیشہ زندہ تھی۔ عمدہ ادب تخلیق ہوتا رہا تھا۔ ۱۹۷۴ء میں Andre Brink نے انگلش اور افریقان میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام تھا Looking on Darkness لیکن یہ Band کر دی گئی تھی کیونکہ اس کتاب نے دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ ساؤتھ افریقہ کا سب سے پہلا کالا ناولسٹ، جس نے انگلش میں ناول لکھا تھا Sol T.Pleatje تھا جو ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوا تھا اور ۱۹۳۲ء میں اس نے دنیا چھوڑ دی تھی۔ یہ سیاسی Activist تھا اور صحافی بھی۔ اپارٹ ہائیڈ کے دوران کالے لوگوں کو تعلیم سے بھی محروم رکھنے کی کوشش کی گئی تھی اور ان کے ادب پر بھی پابندیاں تھیں۔

Alan Paton بھی مشہور ادیب تھا جس نے نسلی تعصب پر کتاب لکھی تھی ''Cry the Beloved Country'' جو پوری دنیا میں مقبول ہوئی تھی۔ یہ ناول ذولو خاندان کے متعلق تھی۔ لوگ سوال کر رہے تھے اور کینن جواب دیتا جا رہا تھا۔ اب وہ سویٹو کے متعلق باتیں کر رہا تھا۔ پروین ہمہ تن گوش تھی۔۔۔''سویٹو میں سات ہزار لوگ کانوں میں کام کرتے ہیں۔ یہ شہر ایک سو پانچ سال پرانا ہے۔ یہاں کی آبادی چار ملین ہے۔ پانچ فیصد لوگ بے روزگار ہیں۔ بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو ایک ہی کمرے میں پندرہ پندرہ کی تعداد میں رہتے ہیں۔ جہاں بجلی نہیں ہے۔ جرم بہت زیادہ ہے۔ ان کے خستہ گھروں کے بالمقابل امیروں کے عالی شان مکانات ہیں۔ وہاں سے بجلی کے تار کاٹ کر۔۔۔ زمین کے اندر سے اپنے گھروں تک لا کر یہ بجلی چراتے ہیں تا کہ ان کے یہاں بھی اجالا ہو۔ یہ کام رات کے اندھیروں میں کرتے ہیں۔ یہ لوگ مکئی اگا کر پیسے کماتے ہیں۔ لوگوں نے اپنی تعلیم کی قربانی دے کر ملک آزاد کیا تھا اس لیے جہالت بہت ہے۔ گورنمنٹ ان کی بہت مدد کرتی ہے کیونکہ یہی لوگ ملک کے آزاد ہونے کی وجہ ہیں۔''

سویٹو کا ڈاؤن ٹاؤن قریب آ رہا تھا۔ جہاں Pieterson Memorial ہے۔ وہی جگہ جو اُس نے تصویروں میں دیکھی تھی۔ جہاں بارہ سال کا نازک سینہ گولیوں سے چھلنی ہوا تھا۔ جہاں آ گہی کی چنگاری نے بغاوت کے شعلے لہرا دیے تھے۔ جہاں ظلم کے خلاف طالب علموں کے گرم خون میں ابال آیا تھا۔ جہاں انسانی حقوق پانے کی بصیرت جاگ اٹھی تھی۔ جہاں بے رحمی کی انتہا ہو گئی تھی۔ آج تصویروں والی جگہ زندہ ہو رہی تھی۔

وقت سے پرے

یہ ۱۶/جون ۱۹۷۶ء کی صبح ہے پروین Soweto میں Moema & Vilakazi اسٹریٹ پر ایک گوشے میں کھڑی ہوئی ہے۔ صبح کی نرم دھوپ نے شہر کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا ہے۔ شہر جاگ اٹھا ہے۔ نیند میں ڈوبی ہوئی بند پلکیں وا ہو گئی ہیں۔ وہ دیکھ رہی ہے۔ دس ہزار اسکول کے بچوں نے بغاوت کر دی ہے کیونکہ ۱۹۵۰ء میں اپارٹ ہائیڈ گورنمنٹ نے کالوں کے اسکولوں میں صرف افریقان زبان میں تعلیم دینے کا قانون بنا دیا تھا۔ تا کہ یہ کامیابی حاصل کرنے سے محروم ہی رہیں۔ اس لیے انگلش میں صرف گوروں کو تعلیم دی جا رہی ہے۔ افریقان میں تعلیم حاصل کرنے کے خلاف طالب علموں نے بغاوت کی ٹھان لی ہے۔ آج صبح وہ بچے کلاس میں جانے کی جگہ سڑکوں پر مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ہاتھوں میں Palacards تھامے ہوئے۔ جس پر درج ہے۔۔۔ ''Amandla Awehtu'' (لوگوں کو اُن کا حق دو) اور۔۔۔''Nkosi Sikelel Afrika'' (افریقہ پر اللہ مہربان ہو) وہ دیکھ رہی ہے۔۔۔معصوم طالب علموں کو جو بغیر کوئی ہتھیار اُٹھائے پُرامن طریقے سے بغاوت پر آمادہ ہیں۔ اپنا حق بغیر کسی تشدّد Violence کے مانگ رہے ہیں۔ وہ انہیں گاتے ہوئے بھی سن رہی ہے۔۔۔ "Morena Bloka Sechaba Saheso"۔۔۔ وہ بے بس کھڑی ہوئی دیکھ رہی ہے۔ پولیس ہتھیاروں کے ساتھ اُن بچوں کی طرف دوڑ رہی ہے۔ بچوں نے خوف زدہ ہو کر پتھراؤ شروع کر دیا ہے۔ پولیس نے آنسو گیس سے فضا کو غبار آلود کر دیا ہے۔۔۔دھماکے۔۔۔ آگ۔۔۔ بھاگتے ہوئے خوف زدہ بچے۔۔۔ پروین رنج و غم سے کانپ رہی ہے یہ سب کچھ دیکھ کر۔ مجبور بچوں کو جہاں بھی راستہ مل رہا ہے وہ بھاگ رہے ہیں۔ کچھ بچے زمین پر زخمی پڑے ہیں۔ وہ دوڑ کر انہیں بانہوں میں اٹھا لینا چاہتی ہے لیکن۔۔۔ اُس کے پاؤں منجمد ہو گئے ہیں۔ ایک لڑکی Antoinette Sithole (اینٹونیٹ سیتھول) پولیس سے خوف زدہ ہو کر جھاڑیوں میں چھپ کر دوڑ رہی ہے۔ اُس کا چھوٹا بھائی۔۔۔ بارہ سال کا Hector Pieterson (ہیکٹر پی ایٹرسن) بھی بھاگ رہا ہے لیکن بہت خطرناک راستے پر۔۔۔جس طرف پولیس ہے۔ ہیکٹر کی سانسیں پھول رہی ہیں۔ وہ ہانپ رہا ہے۔۔۔گھبرایا ہوا ہے۔ اس کی بہن دور جھاڑیوں سے اُسے دیکھ رہی ہے۔ بے چین ہو کر ہاتھ ہلا کر اپنے چھوٹے سے معصوم بھائی کو آواز دے رہی ہے۔ کہہ رہی ہے۔''اس راستے پر نہ جاؤ۔۔۔ وہاں خطرہ ہے۔'' لیکن ہیکٹر اپنی بہن کی

آوازنہیں سن پارہاہے۔کیونکہ ہرطرف چیخ وپکار ہے۔شور ہے۔۔۔اور پھر۔۔۔ دھماکے کی پرزور آواز۔۔۔ بارہ سال کے ہیکٹر کا نازک سینہ پولیس کی گولیوں سے چھلنی ہوگیا ہے۔۔۔!

وہ زخمی ہوکر گیا ہے۔پروین بے بس کھڑی ہوئی ہے اور۔۔۔اُس کی آنکھیں بھیگتی جارہی ہیں۔۔۔اٹھارہ سال کے ایک لڑکے Makhubo (مخوبو) نے بڑھ کر ہیکٹر کو گود میں اٹھالیا ہے۔ہیکٹر کی بہن گولی کی آواز سے گھبرا کر جھاڑیوں سے باہر نکل آئی ہے اور دیکھ رہی ہے کہ اس کا بھائی کسی کی بانہوں میں بے ہوش ہے۔زخمی ہے۔منہ سے خون بہہ رہا ہے۔ایک ہی پاؤں میں جوتا ہے۔مخوبو زخمی،خون سے لت پت ہیکٹر کو اٹھائے ہوئے دوڑ رہا ہے۔اینٹونیٹ کسی گاڑی کی تلاش میں ہے تاکہ اسپتال جاسکے۔لیکن۔۔۔ہیکٹر تو دم توڑ چکا ہے۔۔۔بے رحم پولیس نے اس کی جان لے لی ہے۔ہیکٹر کی بہن اپنے مردہ بھائی کے ساتھ ساتھ ایک کار کی طرف دوڑ رہی ہے۔مدد کے لیے چیخ رہی ہے۔روتی جارہی ہے۔پروین بھی رو رہی ہے انہیں دیکھ کر۔۔۔انسانیت کی پستی دیکھ کر۔۔۔بربریت دیکھ کر۔۔۔اور پھر یکا یک۔۔۔کیپٹن کی آواز نے پروین کو جگا دیا تھا۔ ماضی کی طرف وا دروازے بند ہوگئے تھے۔کیپٹن کہہ رہا تھا ''اب واپس جانا ہے'' وہ چونک اٹھی تھی۔۔۔کہاں تھی وہ؟ وہ تو ہیکٹر میموریل کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔تصورات کی بانہوں میں تھی۔سنگ مرمر پر بنی ہوئی زخمی ہیکٹر کو بانہوں میں اٹھائے ہوئے مخوبو،اینٹونیٹ اور ہیکٹر کی تصویریں دیکھ رہی تھی۔یہ تو ۱۵؍مارچ ۲۰۱۱ء کی دوپہر تھی اور وہ ۱۶؍جون ۱۹۷۶ء کی صبح دیکھ رہی تھی۔کیپٹن کی آواز اُسے وہاں سے واپس لے آئی تھی جہاں جا کر اس نے وہ سب دیکھ لیا تھا،محسوس کرلیا تھا،دل کو دکھا لیا تھا،پلکیں نم کرلی تھیں۔وہ اپنے ساتھی سیاحوں سے چھپ کر اپنی بھیگی پلکیں خشک کرنے لگی تھی۔دل کے پنجرے میں محسوسات کے طائر کے پھڑ پھڑانے کی آوازیں سن رہی تھی۔یہ آوازیں تیز تر ہوتی جارہی تھیں۔۔۔اتنی تیز جیسے سماعت کو پوری طرح زخمی کردینا چاہتی ہوں۔۔۔آخر وہ محسوسات اس نظم کی صورت میں باہر نکل آئے تھے۔۔۔

قوت

چمچماتی،دور تک جاتی ہوئی پختہ سڑک اور
اس کے وزنی پاؤں کے نیچے دبی
روئیدگی کی بے بسی
بے حد گھٹن،تاریکیاں،رستے معطل
رک نہیں سکتے مگر یہ حوصلے اب
درد آگیں قوتوں کی دھار نے چیرا ہے پتھر!
ہر طرف پھیلیں دراڑیں
پتھروں کے ہر شگاف رگ سے
رستا جارہا ہے بھربھری مٹی کا تازہ خون

جیسے پھوٹ کر
پھر سے نکل آئے ہوں
پچھلے دور کے زخموں کے انکر۔۔۔!

شام ہورہی تھی۔۔۔ہلکی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔سیاحوں کو لیے ہوئے وین واپس ہوٹل کی طرف جارہی تھی۔کیپٹن بول رہا تھا۔۔۔''اپارٹ ہائیڈ پوری طرح بے نقاب تب ہوا تھا جب بارہ سالہ ہیکٹر کی جان پولیس نے لے لی تھی۔۱۶؍جون ۱۹۷۶ء کے شعلوں نے دنیا کو اس طرف متوجہ کیا تھا۔ ۱۶؍جون ساؤتھ افریقہ کا یادگار دن ہے اور Public Holiday کا دن ہے۔ اڑسٹھ سالہ ہیکٹر کی ماں جس کا نام ڈروتھی مولیفی Drothy Molefi ہے ہر ۱۶؍جون کو اپنے بیٹے کی یاد میں خاص اہتمام کرتی ہے اپنے خاندان کے ساتھ۔ جب ۱۹۴۸ء میں اپارٹ ہائیڈ شروع ہوا تو نسلی تشدد کی انتہا نہ تھی۔مختلف نسلوں اور رنگوں کو الگ کردیا گیا تھا کہ وہ آپس میں دوستی قائم نہیں رکھ سکتے تھے۔ شادیاں بھی نہیں ہوسکتی تھیں۔سب کے علاقے الگ کردیے گئے تھے۔اسکول، اسپتال،قبرستان،اسٹیشن،ریستوران،باتھ روم،پارک اور پبلک ٹرانسپورٹ سب الگ تھے۔کالوں کے پاس ہمیشہ پاس بک ہوتی تھی جو درحقیقت گوروں کے علاقوں میں داخل ہونے کا اجازت نامہ (پاس) تھا،وہ بھی صرف کام کرنے کے لیے۔پورے ملک سے نسل کی بنیاد پر لوگوں کو ایک علاقے میں منتقل کردیا گیا تھا۔ساٹھ ہزار کالے لوگوں کو قانوناً ان کے گھروں سے نکال کر سویٹو بھیج دیا گیا تھا۔کیپ ٹاؤن کا علاقہ ڈسٹرکٹ چھ مسمار کردیا گیا تھا اور یہاں کے رہنے والوں کو کہیں اور جانا پڑا تھا۔کالی نسل کا علاقہ ٹوٹا پھوٹا،بدحال چھوڑ دیا گیا تھا۔وہاں بہت برے اسپتال تھے۔بجلی نہیں تھی۔بچوں کو تعلیم بہت کم دی جاتی تھی کہ بڑے ہوکر وہ گوری نسل کے گھروں میں خدمت گار بنیں اور پھر۔۔۔۱۹۸۰ء کے آخر تک اپارٹ ہائیڈ کمزور ہونے لگا کیونکہ سویٹو کی بغاوت اور ہیکٹر کی موت کے بعد دنیا بھر میں بدنام ہوگیا تھا۔آخر ۱۹۹۰ء میں یہ عذاب ختم ہوا۔یہ گورنمنٹ مٹ گئی۔نیلسن منڈیلا ستائیس برسوں بعد قید بامشقت سے رہا ہوا۔۔۔اور ۱۹۹۴ء میں پہلا کالی نسل کا پریذیڈنٹ بنا۔آدھی رات تھی جب نیا پرچم قوسِ قزح کا لہرایا تھا۔جب ہر رنگ و نسل کے لوگ مل گئے تھے ساتھ ساتھ۔'' کیپٹن پرجوش آواز میں اپنے ملک کی داستان سنا رہا تھا۔سب پوری دلچسپی کے ساتھ سن رہے تھے وہ درد بھری کہانی جس کا انجام تو اچھا تھا۔اس کی باتیں جاری تھیں۔ہوٹل قریب آرہا تھا۔وہ کہہ رہا تھا۔۔۔''ساؤتھ افریقہ میں دنیا کا سب سے زیادہ سونا ہے۔ جوہانس برگ میں دنیا کی سب سے گہری سونے کی کان ہے تقریباً چار کلومیٹر گہری۔۔۔''

بے چینیاں

ہوٹل پہنچ کر زندگی کے معموں نے اسے اپنے پنجوں میں جکڑ لیا تھا۔ نیند نے دغا دے دی تھی۔نہ جانے کہاں بھٹک رہی تھی اُس کی آنکھوں سے

دور۔۔۔وہ اٹھ کر بالکنی میں آ گئی تھی۔قدرتی نظارے دعوت نظارہ دے رہے تھے۔چاروں طرف سر بفلک پہاڑ بانہیں پھیلائے کھڑے ہوئے تھے۔۔۔دور چھوٹی چھوٹی روشنیوں کے قطرے ستاروں کی طرح دمک رہے تھے لیکن وہ کچھ بے چین تھی اب بھی سویٹو کی ٹاؤن شپ کی کچی گلیوں میں بھٹک رہی تھی۔۔۔اس وقت اُسے قدرت کے حسین نظارے بھی پرسکون نہیں کر پائے تھے۔وہ اندر کمرے میں چلی آئی تھی اور قیمتی تعیّشات کی طرف دیکھ رہی تھی۔اسے وہ گھر یاد آ رہا تھا دو کمروں والا جہاں نوافراد رہ رہے تھے۔اس کو وہ نو عمر لڑکی کی بیزاری اور اَنا یاد آ رہی تھی۔اُسے گلی میں کھیلتے ہوئے غربت زدہ گرد آلود بچے یاد آ رہے تھے۔سلیمان یاد آ رہا تھا جو بہت کامیاب وکیل بننے کا خواب دیکھ رہا تھا۔اُس بچے کی آنکھوں کی چمک اور خوابوں کی پرواز یاد آ رہی تھی۔اس علاقے کے ٹن کی چھتوں والے خستہ حال گھر یاد آ رہے تھے اور نظریں اس کمرے کے سامان عیش و راحت پر مرکوز تھیں۔وہ بہت گھٹن محسوس کر رہی تھی۔اس کی بے کلی یہ نظم بن گئی تھی۔۔۔

مختلف رنگ

وہاں خاشاک سے لپٹے
گلی کی گرد اوڑھے پھول
ننگے پاؤں، ننگے سر
ادھورے اور بوسیدہ
لباسوں میں بھٹکتے ہیں
وہ یخ بستہ ہواؤں کے تھپیڑے تن پہ سہتے ہیں
یہاں مخمل کے غالیچے ہیں
ابریشم کی باہیں ہیں
زمستاں میں یہ آتش دان کے خوش رنگ
لہراتے ہوئے شعلے
مجھے آسودگی کی تھپکیاں دیتے ہیں
لیکن۔۔۔یہ خلش، یہ درد، یہ بے چینیاں کیسی؟
کہ کاغذ پر قلم رکھے ہوئے
میں کب سے بیٹھی ہوں
مگر میرے قلم کا خون سارا منجمد ہے اور
مرے الفاظ کے سارے
پرندے سو گئے ہیں اب
پریشاں ہو کے شعلوں کے حوالے کر دیا اپنے قلم
اور کورے کاغذ کو
بہت ہی مختلف اب ہو گئے ہیں رنگ شعلوں کے۔۔۔!

اُس گلی میں سلیمان کی باتیں اسے یاد آئے جا رہی تھیں۔اس بچے کے عزم نے ترقی کی منزلوں تک جانے کے خواب نے پروین کو ایک سیاہ نسل کے مصنف Dick Gregory کی یاد دلائی تھی۔اُس نے۔۔۔ڈِک گریگری کی سوانح حیات پڑھی تھی جس کا نام تھا Nigger(نِگر) یہ وہ لفظ ہے جو سیاہ لوگوں کے لیے حقارت سے استعمال کیا جاتا ہے۔اُس کتاب کو پڑھ کر آنسو کوشش کے باوجود اندر نہیں رکے تھے۔نہ جانے کہاں سے اتنا درد بھر آیا تھا دل میں۔ڈِک گریگری (پیدائش ۱۹۳۲ء) ایک افریقی امریکن ہے جو ایک منفرد حسِ مزاح رکھتا تھا اور جس نے اپنی اس کتاب سے نہ جانے کتنے دلوں کو دہلا دیا تھا۔اس کی ماں سفید نسل کے بچے کی آیا تھی اور یہ خود جوتے پالش کر کے خاندان کو سنبھالتا تھا۔اس کے منہ پر سفید لوگ اپنے جوتوں سے ٹھوکر مارتے تھے یہ کہتے ہوئے کہ کوئی سیاہ شخص ان کے جوتے نہیں چمکا سکتا۔لیکن ڈِک گریگری نے ہمیشہ منفی حالات کو مثبت بنا دیا تھا۔اپنے درد کو دور کرنے کے لیے Stand up Comedy کے فن سے خود اپنا مذاق اڑاتا تھا لوگوں کو ہنسانے کے لیے۔یہ پہلا کالا کامیڈین تھا جو اس فن میں بہت کامیاب تھا۔اس کے طنز آمیز مزاح نے سفید نسل کی ذہنیت بدل دی تھی۔اس کی تصنیف Nigger نے ناانصافیوں اور تعصب کے خلاف آگہی پیدا کی۔مارٹن لوتھر کنگ اور جونیئر Malcomx کی طرح یہ بھی اپنے حق کے لیے لڑا تھا۔اس کتاب کا انتساب ہی ایک کہانی ہے۔بہت وقار کے ساتھ خوبصورتی نے بدصورتی کو طمانچہ مارا ہے۔جب وہ اپنی ماں کے لیے یہ لکھتا ہے ''پیاری ماں۔۔۔تم جہاں بھی رہو اگر کبھی لفظ ''نِگر'' سنو تو سمجھو کہ وہ لوگ میری کتاب کا اشتہار دے رہے ہیں'' برسوں پہلے سویٹو کے طلبا کی بغاوت اور آج ٹاؤن شپ کی گلیوں والے سلیمان کی آنکھوں کی چمک نے پروین کو ڈِک گریگری کی کتاب کے ان الفاظ کی یاد دلا دی تھی۔

"You did not die a slave for nothing Momma. You and all those Negro Mothers who gave their kids the strength to go on and now we are ready to change a system where a white man can destroy a black man with a single word - "Nigger" - when we are through, Momma, there won't be any nigger any more."

(تم اس دنیا سے غلام بن کر بے وجہ نہیں گئیں ماں!۔۔۔تم اور وہ تمام سیاہ مائیں جنھوں نے اپنے بچوں کو طاقت دی، آگے بڑھنے کے لیے اور اب ہم تیار ہیں کہ وہ نظام بدل دیں جہاں ایک سفید شخص ایک سیاہ شخص کو برباد کر سکتا ہے صرف واحد لفظ ''نِگر'' سے۔۔۔جب ہم کامیاب ہوں گے ماں! یہاں پھر کبھی کوئی ''نِگر'' نہیں ہو گا۔)

ڈِک گریگری خوش ہوتا تھا جب سرد ہوا خاموش رہتی تھی اور اس کے دریچے کے ٹوٹے ہوئے شیشے کی درازوں سے اندر آ کر اُس کو بر فیلے خنجر سے زخمی نہیں کرتی تھی۔وہ خوش ہوتا تھا جب کبھی چوہے اور کاکروچ کمرے میں نہیں

آتے تھے۔ پروین کی نگاہیں ہوٹل کے کمرے کی قیمتی اشیا پر تھیں اور ذہن و دل بے چین تھے۔ وہ پھر سے باہر بالکنی پر آ گئی تھی۔ اس وقت تازہ ہوا کی تھپکیاں بھی بیکار تھیں۔ اُس کی نظریں دور پہاڑوں کی چوٹیوں پر تھیں اور ذہن ڈِک گریگری کے عظیم خیالات کی بلندیوں پر۔ ڈِک نے اپنی کتاب میں یہ تذکرہ کیا ہے کہ کسی ریستوراں میں اپنے ساتھ ہونے والے بے رحمانہ اور حقارت سے بھرپور سلوک کا کس دانش مندی سے مقابلہ کیا تھا اس نے۔ جب اس نے سفید فام ویٹریس کو کھانے کا آرڈر دیا تھا تو اُس ویٹریس نے کہا تھا "We serve only white people" ڈِک گریگری کا جواب تھا "I don't eat white people, so bring me a chicken" جب اُس کے سامنے مرغی آئی اور اُس نے چھری اٹھائی کاٹ کر کھانے کے لیے تو سامنے دوسری میز پر بیٹھے ہوئے کچھ سفید فام لوگوں نے یہ کہہ کر دھمکی دی کہ "Anything you will do to the chicken, we will do to you" (تم جو کچھ اس مرغی کے ساتھ کروگے، ہم تمہارے ساتھ کریں گے) ڈِک گریگری نے خاموشی سے چھری میز پر رکھ دی تھی اور مرغی کو ہاتھوں میں اٹھا کر چوم لیا تھا۔ آج۔۔۔ پروین کو وہ کتاب یاد آئے جارہی تھی۔ وہ بالکنی پر خیالات میں غرق کھڑی تھی۔۔۔ دور پہاڑوں پر مکانات میں روشن بتیوں کے

ستارے بجھنے لگے تھے۔ رات گہری ہورہی تھی۔ نیند کہیں دور جا کر اب تک واپس نہیں آئی تھی۔ خاموشی مسلسل شور مچارہی تھی۔۔۔ ہوٹل کے آرام دہ کمرے میں، نرم بستر کی آغوش میں سمٹی ہوئی وہ سوچ رہی تھی۔۔۔ کٹھن زندگیوں کے متعلق، معصوم چہروں کے متعلق، ان آنکھوں کے متعلق، بوسیدہ کپڑوں میں لپٹے ہوئے جسم کے اندر دل میں نہاں ریشمی خوابوں کے متعلق۔ غربت کے بلبلوں میں بند اُن پرندوں کے متعلق جو اونچی اڑانوں کے خواب دیکھتے ہیں۔ پروین کی آنکھیں تو ریگستان تھیں لیکن دل کی خندق میں قطرہ قطرہ آنسو جمع ہورہے تھے۔ سویٹو کے بدحال علاقے میں رہنے والوں کی حالت زار سے زیادہ اُسے اپنی بے بسی کا غم تھا۔ وہ صرف ایک قطرہ تھی اور پورے ریگ زار کو سیراب کرنا چاہتی تھی۔ وہ خود کو قربان بھی کردے تو ریگستان تو تشنہ ہی رہے گا۔ اُس کی نظریں کمرے کی چھت پر ٹکی تھیں جہاں کسی اور جہاں کا ایک ویڈیو آن تھا۔ بدرنگ دیواریں، انا سے بھرپور سیاہ آنکھیں، نیم روشن کمروں میں بھٹکتی ہوئی زندگانیاں۔۔۔ جہاں بے بسی بھی ایک ذریعہ معاش ہے۔ بیچارگی تفریح کا ذریعہ ہے۔۔۔ اُس کے دل کی خندق آنسوؤں سے بھری جارہی تھی۔ کبھی نہ بھلائے جانے والے لمحات ذہن پر قابض تھے۔ ہزاروں "کیوں" کی مکڑیاں ذہن کو اپنے جال میں قید کررہی تھیں۔۔۔

'' بھوک ہے زندہ''

ندافاضلی
(ممبئی، بھارت)

کل دیوالی کی چھٹّی

کل دیوالی کی چھٹّی تھی
چھوٹے قد کا سانولا لڑکا
دروازہ پر دستک دے کر
رکھ جاتا تھا روز جو پیپر
آج نہیں آنے والا وہ!!!
میں کمرہ میں تنہا بیٹھا
دیکھ رہا ہوں
وقت کھڑا ہے جبڑے کھولے
روز کا پیپر!
پیٹ کو اس کے
کالے گورے انسانوں کے
زندہ گوشت سے بھر دیتا تھا
رشوت
کرسی
مذہب
سرحد
کھا پی کر وہ سو جاتا تھا
آج مگر بھوکا ہے درندہ
غذا ہے غائب
بھوک ہے زندہ
کمرہ میں اب میرے علاوہ
کوئی نہیں ہے!

○

آسماں تک رہا ہے ہر طوفاں

شاخ پہ بیٹھی چیل کی آنکھیں
اڑ رہی ہیں
شکار کے پیچھے
خواہشیں رقص میں ہیں
ہر جانب
اپنے اپنے مزار کے پیچھے
روشنی کا لباس پہنے ہوئے
ہر اندھیرا
ٹہل رہا ہے یونہی
ڈھل چکی دھوپ
سو چکے منظر
راستہ مجھ میں چل رہا ہے یونہی

آسماں تک رہا ہے
ہر طوفاں
جیسے سچ مچ ہی
فاختہ پھر سے
شاخ زیتون لے کے آئے گی

○

پروین شیر
(کینیڈا)

کالا سمندر

دہن وا کیے تیز لہروں کا لحظہ بہ لحظہ
وہ کالا سمندر
دبے پاؤں ساحل کی جانب
بڑھا آ رہا ہے!
جہاں ریت کے خوبصورت گھروندے
بنانے میں بچے مگن ہیں
حسیں سیپیوں کے چمکتے
دھنک رنگ سے جگمگاتے
ہوئے ریت کے ذرے ذرے
گھروندے نہیں یہ ہزاروں
ستاروں کا جھرمٹ ہو جیسے
یہاں چار سو مخملی سبزہ زاروں
پہ اُڑتی ہوئی تتلیاں وجد میں
جھومتے سرخ پیلے
ہرے لہلہاتے ہوئے پھول پتوں سے
اٹھکھیلیاں کر رہی ہیں
یہ ساحل پہ بکھرے ہوئے
رنگ سرشار ہیں اپنی تابانیوں میں
اُنہیں کچھ خبر ہی نہیں چپکے چپکے
وہ کالا سمندر دہن اپنا کھولے
قریں آ رہا ہے.....!

○

شیشے اور دھند کی فصیلیں

چوراہے پر دائیں بائیں
گہری خندق منہ کھولے بیٹھی ہے
' آگے۔۔۔دھند کی اونچی دیواروں کے پیچھے
گڈمڈ منظر کہتے ہیں آجاؤ لیکن
سب دروازوں پر تالے ہیں
پیچھے۔۔۔سبزے، بھونرے، غنچے
رنگ برنگی ابریشم کی
شال میں لپٹے لہراتے ہیں
ہوا کی انگلی جھیل کے صفحے پر نغمے لکھتی ہے
ہرے شجر کی جھومتی شاخیں
نرم گھنیرے ٹھنڈے سائے کی چادر پھیلائے
پیہم مجھے پکاریں
لیکن میرے قدم جو اُٹھیں
شیشے کی ان دیواروں سے
ٹکرا کر زخمی ہو جائیں.....!

○

ابدی پیاس

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ
(امریکہ)

مُرتعش ذہن پہ ہیں ، آئینہ خانے کتنے
قریۂ جاں میں گزارے ہیں زمانے کتنے

راہ میں بھٹک گئے، قرنوں سے پھیریں آوارہ
خضر و راہ زن کے ہوئے قصّے پُرانے کتنے

تُو کہ ہر آن رہا کارِ جہاں میں اُلجھا
مئے وحدت کے چلتے رہے مے خانے کتنے

خواہشوں نے سبکدوش کہاں ہونے دیا
شرمندۂ تعبیر ہیں خواب سہانے کتنے

فلک شگاف تان گیت قوالی گانے
تسبیح بدست گھماتے رہے دانے کتنے

ق

تیری نیت ، تیری پاکھنڈ سبھی ، وہ جانے
بہروپیئے بن جائیں چاہے سیانے کتنے

پیاس ہے ابدی تری، کیسے بجھے گی تشنہؔ
دم بہ دم دیئے ہیں، اشکوں کے نذرانے کتنے

○

بھٹّہ مزدور کو اب بھلائے گا کون

یونس صابر
(پشاور)

شام پچھلے پہر کوئی آواز تھی یا مرا خواب تھا
ہڑبڑا کر جو کھڑکی سے دیکھا وہاں تھا ہجومِ گراں
پی گیا خوفِ حیرانگی دوقِ نظّارگی کھا گیا
ہاں یہی خواب یسوعؑ کا تھا جزوِ ایمان تھا
اُس کا عاشق وہی ہے جسے تھپّڑ اک گال پر
جب لگے تو کرے فخر وہ حسنِ اعمال پر
تاج وہ زیست کا پا گیا دوسری چوٹ بھی کھا گیا
بالیقیں، روح اب فاطمہؑ بی بی اور ماتاؑ مریم کی بھی
کیوں تڑپتی نہ ہوگی شہادت پہ شہزادؔ اور شمعؔ کی
خیر سے، اس کے باوصف میری جماعت کو احساس ہے
ایک کیا لاکھ بحران ہوں دہر میں، امن کی آس ہے
ہم کو اُمید ہے عدل و انصاف کی، شکر ربّ سائیں کا
ہم کریں معاف پھر کیسی ناراضگی، شکر ربّ سائیں کا

○

قطعات

کرشن پرویز

(روپڑ، بھارت)

دیدۂ اشکبار میں گزری
جستجوئے بہار میں گزری
وہ قیامت کی تھی گھڑی پرویز
جو ترے انتظار میں گزری

لبِ ساکت سے بول سکتا ہوں
حسنِ فطرت کو تول سکتا ہوں
کیا سمجھتے ہو تم جہاں والو
رازِ قدرت بھی کھول سکتا ہوں

کون سمجھا حیات کا مقصد
کس نے رازِ ممات پائے ہیں
زندگی کے حسین دامن
موت کے ہولناک سائے ہیں

برہمی کس لیے میاں ناصح
جوسمجھتے ہو تم جناب نہیں
ان چھلکتے سے آبگینوں میں
میرے آنسو ہیں یہ شراب نہیں

کوئی شعلہ نظر نہیں ہوگی
مے میسّر اگر نہیں ہوگی
تری جنّت میں اے میاں ناصح
اپنی پل بھر گزر نہیں ہوگی

○

دوہے

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

(بہار، بھارت)

خط آیا ہے میت کا، بھیجا ہے پیغام
بھیجا کیا پیغام ہے، لکھا ہے میرا نام

مرکر بھی مرتے نہیں ، صدیوں سا شہید
رانا بھی، رنجیت بھی، عبدل ویر حمید

جنگل جنگل کٹ گئے، لگے کٹے سے کھیت
اب ہریالی بیچ میں ، اُگ آئے گی ریت

جیتی بازی ہار کر پایا من کا چین
ایسے سکھ کا کیا کریں جب ہوگیلے نین

کس کا کیسا دیس یہ، یہاں موت کی چھاؤں
کیوں دوجے کو دوش دوں، اپنا بدتر گاؤں

تنہا کیسے کاٹ لوں ساون کی برسات
تن من بھیگا سا لگے، کیسی ہے سوغات

بادل گرجے شام کو جیسے بکھرے بال
ایسے میں آکاش یہ لگتا گوری گال

پاکر تیرے پیار کی، انچھوئی سی چھاؤں
ہاتھ ہوئے کچنار کے،مولسری کے پاؤں

○

سرنگیا

اقتدار جاوید

(لاہور)

یہیں پہ تھا سرنگ والا
اک سرنگ سے نئی سرنگ کھودتا ہوا
مجھے بتا رہا تھا
آنا ہی نہیں قریب اپنے آپ کے
نقاب اتارنا نہیں
پلک جھپک کے
لوٹنا نہیں مدارِ اوّلیں کی سمت
جوڑنی نہیں
پلک سے دوسری پلک
لبوں پہ کوئی بات آئے
اس کو ڈھالنا نہیں حروف میں
خیال جو جھٹک دیئے گئے تھے
جمع کرنا ہے انہیں
نہیں ہے سونے کے لیے سیاہ رات
جاگنے کے واسطے بنی رات
جسم کو تپاگنے کے واسطے
بنا ہے دن
تمام عمر، ایک سانس کھینچنا ہے اپنی سمت
سانس کو نکالنا ہے موت پر
مجھے ترا وجود
یاد آ گیا
خطوط جو خیال سے اتر گئے تھے
اُن کو جوڑتا ہوا
میں سانس توڑتا ہوا
کھلی فضا میں آ گیا!!

❍

وہ نہیں آئے گا

فرحت یاسمین

(بہار، بھارت)

دلِ ناداں کیا تو نہیں جانتا
کہ وہ نہیں آئے گا نہیں آئے گا
پھر یہ کیسی بے قراری
پھر یہ کیسا انتظار
شب کی آنکھیں جھپکنے لگیں
چراغ امید بجھنے لگے
پھر یہ کیسی بے قراری
پھر یہ کیسا انتظار
ہوا بھی سسکیاں بھرنے لگیں
شجر بھی جھوم کر چپ ہو گئے
رات کا دامن چاک ہونے لگا
ستاروں کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں
کہ وہ نہیں آئے گا نہیں آئے گا
پھر یہ کیسی بے قراری
پھر یہ کیسا انتظار
سنّاٹے بھی تڑپ کر سو گئے
رات بھی خاموش ہو گئی
یہ کیسی چاہت ہے
یہ کیسی بے قراری ہے
یہ جذبوں میں ہلچل کیوں
یہ امنگوں کا طوفان کیوں
اب تو رات کا لباس بھی اترنے لگا ہے
سو جاؤ کہ ساری فضا سو گئی
دلِ ناداں کیا تو نہیں جانتا
کہ وہ نہیں آئے گا نہیں آئے گا
پھر یہ کیسی بے قراری
پھر یہ کیسا انتظار

❍

آیاہے نیاسال!

کرشن گوتم
(چندی گڑھ، بھارت)

○

دل میں نئی اُمنگ نئی سرخوشی کے ساتھ
سُر کی نئی بہار، نئی نغمگی کے ساتھ
ہرشخص کے چہرے پہ اِک پیاری ہنسی کے ساتھ
آیا ہے نیا سال، نئی روشنی کے ساتھ

گزرا جو سال خیر سے اچھا تو تھا مگر
اُمید سے ہماری رہا کچھ نہ کچھ کمتر
کچھ دوست کچھ احباب کچھ اغیار کچھ دلبر
خوش تھے مگر اے کاش ہوتے اور بھی خوشتر

باتیں وہ کرتے پہلے سی کچھ شاعری کے ساتھ
دل میں نئی اُمنگ نئی سرخوشی کے ساتھ

پہلے سے دن وہ پہلی سی راتیں کہاں ملیں
دل چھین لینے والی وہ گھاتیں کہاں ملیں
قربان جن پہ ہوں وہ ملاقاتیں کہاں ملیں
ہو بات جن باتوں میں وہ باتیں کہاں ملیں

اے کاش ! دوست ملتے ذرا دوستی کے ساتھ
دل میں نئی اُمنگ نئی سرخوشی کے ساتھ

اے میرے دل زار! کیوں ہے فسردہ حال
دنیا کے رنگ ڈھنگ پر کیوں ہے تجھے ملال
جینا ہوا ہے آدمی کا اس لیے مُحال
بدلی جو اس زمانے نے خود اپنی چال ڈھال

رکھا نہ میل زندگی کا سادگی کے ساتھ
دل میں نئی اُمنگ نئی سرخوشی کے ساتھ

اک عزم لے کر ہم اٹھے ہیں اب نئے دم سے
کروٹ زمانے نے ہے بدلی آج خود ہم سے
اب واسطہ کچھ بھی نہ رکھا رنج سے، غم سے
بدلیں گے مل کے آنسوؤں کو ہم تبسم سے

آساں کریں گے مشکلیں ہم مل کے سب کے ساتھ
دل میں نئی اُمنگ نئی سرخوشی کے ساتھ

آیا ہے نیا سال کیا؟ ہم اسکو لائے ہیں!
اک جوش لے کر ہوش میں سپنے سجائے ہیں
جو سب کے دل کو بھائیں، منصوبے بنائے ہیں
محنت میں ہے ملاپ تو رحمت کے سائے ہیں

ہم منزلوں کو پائیں گے مل کر سبھی کے ساتھ
دل میں نئی اُمنگ نئی سرخوشی کے ساتھ

اک روشنی سی پھیلتی جاتی ہے ہرطرف
نغمے نسیم پیار کے گاتی ہے ہر طرف
خوشبوئے گل، مستی سی پھیلاتی ہے ہر طرف
خوشحالی کھیت کھیت لہراتی ہے ہر طرف

اب زندگی جئیں گے نئی زندگی کے ساتھ
دل میں نئی اُمنگ نئی سرخوشی کے ساتھ
آیا ہے نیا سال نئی روشنی کے ساتھ

تخلیقِ کائنات

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

یہ قِصہ بہت پارینہ ہے　　پر فکر و علم کا خزینہ ہے
جب سارا منظر خالی تھا　　نہ گلشن تھا نہ مالی تھا
آواز بِنا خاموشی تھی　　نہ ہلچل نہ سرگوشی تھی
نہ بادل تھے نہ دریا تھے　　نہ صحرا تھے نہ ہمالہ تھا
نہ تارے تھے نہ سورج تھا　　بس ہر سو ہُوکا عالم تھا

گو ظاہر منظر خالی تھا　　پردے میں نِہاں اِک خالق تھا
جب اُس نے پکارا ''کُن'' فیکون　　تب ہو گیا عالم گونا گون
پھر بادل برسے صدیوں تک　　سر سبز ہوا یوں سارا جگ
آباد ہوئے گلشن ہر سُو　　اور ساتھ ہی پھوٹے رنگ و بو

خالق نے بُلائیں سب ارواح　　جولانی تھیں اِس عالم میں
تب پوچھا اُن سے ایک سوال　　لایا ہے تمہیں کون عالم میں
سب بولیں ہو کر ایک زبان　　ہم جان گئی ہیں کون ومکان
اِک آپ ہمارے خالق ہیں　　جو اوّل ہیں اور آخر ہیں

تب علم سکھایا آدم کو　　اور بھیجا اس کو جنت میں
اک حاسدِ آدم جلتا تھا　　کیوں بھیجا آدم جنت میں
آدم کو نکالا جنت سے　　اس حاسد نے اک دھوکے سے
یہ حاسد اب بھی تاک میں ہے　　آدم نہیں لوٹے جنت سے

حق راہ دکھانے آدم کو　　اللہ نے رہبر بھیجے تھے
پر رہبرِ اعظم آخر میں　　جو کامل نسخہ لائے تھے
وہ نسخہ ایک خزینہ ہے　　جنت کے لیے اِک زینہ ہے

جنت میں دوبارہ جانے پر　　سب پردے وا ہو جائیں گے
اَرواح جہاں کے محشر میں　　سب راز عیاں ہو جائیں گے
جنت یا جہنم دونوں میں　　سب اپنے ٹھکانے پائیں گے
پھر نورِ خدا چھا جائے گا　　اِک دور نیا آجائے گا

○

''تمام عمر کی کمائی''

حسن عسکری کاظمی

(لاہور)

شاعری کو مکالمہ بنانے اور تخلیقی ہنر مندی میں قاری کا اعتبار بڑھانے کا ہنر ایک ایسا معجزہ ہے جو دستِ سخنور میں سنبھالے ہوئے قلم کی نوک سے شعاعِ نور بن کر نمو پذیر ہوتا ہے اور سادہ کاغذ پر مرقعِ حسن تخیل معرض وجود میں آتا ہے جسے نیم ماورائی قوت اظہار کا استعارہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ دنیائے ادب میں مختلف اصنافِ شعروسخن متعارف ہوئیں۔ برصغیر ہندوپاک میں صنفِ غزل کو جتنی مقبولیت حاصل ہوئیں اور اسی طرح مخالفت کے باوصف جتنی پذیرائی صنفِ غزل کے حصے میں آئی وہ شاید کسی دوسری صنفِ سخن کا مقدر نہ بن سکی، دراصل کوزے میں دریا بند کرنا، یا قطرۂ آب میں سمندر کا نظارہ کرنا اور ذرۂ خاک میں خورشید کا منظر پیش کرنا عام آدمی کے بس کا روگ نہیں۔ یہ کام کوئی اور نہیں۔ وہی کر سکتا ہے جسے قدرت نے جوہرِ تخلیق سے نوازا اور حرفِ ہنر سے آشنائی کی سندِ اعتبار عطا کی، یہ نشۂ اظہارِ سخن خالق کے لطف وکرم کا زندہ معجزہ ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے، شاعر کی محبوبیت کا راز یہی ہے کہ وہ زمانے کی بدلتی قدروں کو کسی صورت نظر انداز نہیں کرتا بلکہ اپنے اندر سمو کر طرزِ احساس کی انفرادیت اور اپنی فکرِ معتبر کام میں لاتا ہے وہ نفسِ مضمون کے تنوع کی بدولت قوس قزح کے رنگ، پاکیزہ اور لطیف جذبوں میں ایجاز واختصار کی خوشبو کو اپنے قاری کے دل میں اتارنے کا ہنر آزماتا ہے، پھر بھی اسے ملال دامن گیر رہتا ہے کہ وہ نہ کہہ پایا جو اسے کہنا تھا۔ یہی ملال عرفانِ ذات کا دریچہ کھولتا ہے اور کائنات کے اسرار ورموز سے آگہی کے سفر آغاز ہوتا ہے اور شاعر پر الہامی ارمغان کا دسترخوانِ نعمت بصورت شعر کھلنے لگتا ہے۔

غزل کے بارے میں یہ حقائق کہ اس کے ہر شعر میں جہان معانی یا عالم امکان کی جھلک اور تہہ در تہہ مطالب کے انبار نظر آتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ اس کے لیے دیدۂ بینا درکار ہے، لالۂ صحرائی کا نظارہ کرنے والی آنکھ غیر معمولی بصیرت وبصارت رکھتی ہے، اسے دیدۂ بیدار بھی کہا جاسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ شاعرِ لالۂ صحرائی حنیف ترین عرفان ذات کے مرحلۂ جاں گداز میں یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ:

ملا نہ ظاہر وباطن میں کچھ سراغ اپنا
حنیف میں تو سدا سے کسی نہیں میں ہوں

نہیں سے اثبات یا نیستی سے ہستی میں یقین کے مرحلے طے کرنے کا عمل معرفتِ ذات سے آگے عرفان خداوندی کا عکس ناپیدا کنار رہے لیکن اس کے اظہار میں انفس وآفاق اور شعور وادراک بے دست و پا نظر آتے ہیں البتہ توفیق الٰہی شامل حال ہو جائے تو کون ومکاں کی وسعتیں سمٹ کر مٹھی بھر دل کے نقطۂ روشن پر عکس نما ہو جاتی ہیں:

تجھ میں کون ومکاں کے منظر ہیں — خود سے باہر کہیں نگاہ نہ کر

حنیف ترین کی غزل سے متعلق پروفیسر مشکور حسین یاد نے پتے کی بات کہی ہے کہ ان کی شاعری بڑی شاعری ہے، ان کی شاعری محض خارجی اشیا کا اظہار نہیں بلکہ وہ سطح کے سینے کو چیر کر اندر سے ایسے مطالب ومفاہیم کے جوہر نکال کر لاتے ہیں کہ آدمی بس دیکھتا رہ جاتا ہے'' مشکور حسین یاد نے مجھے ٹیلی فون پر یہ بھی بتایا ہے کہ ''حنیف ترین ریاض میں کاروبار کرتے ہیں، ان کے کارخانے میں مہمان نواز ہیں، ان سے وہاں کئی مرتبہ ملاقات ہوئی، وہ ایسے شاعر ہیں کہ ان کی تخلیقی انفرادیت کا اعتراف ہندو پاک اور دوسرے ملکوں میں اردو دان طبقے کے افراد اس طرح کرتے ہیں کہ ان کی شاعری پوری ایک نسل کا مکالمہ ہے۔''

حنیف ترین بھارت کے رہنے والے ہیں اور سعودی عرب ان کا دوسرا وطن ہے، بھارت میں غزل کہنے والے بہت ہیں لیکن غزل میں ندرتِ فکر ونظر سے زیادہ لذتِ بیان کو اہمیت دی جاتی ہے جبکہ حنیف ترین صحراؤں کی وسعتوں کے دلداہ غزل میں نئے امکانات کی جستجو میں سرگرداں نظر آتے ہیں، انہوں نے بھارت سے رشتہ بپا رہنے کے باوصف روایتی غزل کے برعکس نئے اکتشافات کو اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے، اپنی عمر عزیز اسی ندرت فکر ونظر کے لیے وقف کر رکھی ہے، پھر بھی وہ میر انیس کی طرح دل میں فروتنی کو جگہ دینا پسند کرتے ہیں:

یہ چند لفظ جو نظما دیئے ہیں غزلوں میں
تمام عمر کی اپنی یہی کمائی ہے

حنیف ترین نے ''سانحہ بابری مسجد''، ''زمین لاپتہ رہی''، ''ابابیلیں نہیں آئیں'' اور ''باغی سچے ہوتے ہیں'' جیسی معرکتہ الآرا نظمیں لکھ کر غزل کے سلسلہ تخلیق کو ایک بار پھر جوڑا، دراصل بابری مسجد کا انہدام جہاں بھارت کے مسلمانوں کے مستقبل کو مخدوش بنانے کا نقطہ آغاز تھا اور بھارتی تاریخ کے دامن پر بدنما داغ کہ جہاں سیکولر نظام کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے اسی طرح ان منفی رویوں اور دہشت پسند طبقوں نے ہمارے ملک پاکستان کا امن وامان تباہ وبرباد کر دیا ہے اس لیے ہمیں ان عصبیت پسند نام نہاد مذہبی دہشت گردوں کے خلاف مشترکہ طرز عمل اختیار کرنا ہوگا، حنیف ترین کا یہ کہنا درست ہے کہ ''نااہل، چالاک اور طاقتور لوگ ہر چیز پر قابض ہوتے جارہے ہیں'' عالم انسانیت ایک کنبے کی طرح اس خاکدان ارضی پر مدتوں دریاؤں، صحراؤں اور وادیوں کے علاوہ بستیوں، شہروں اور قریوں میں اشرف المخلوقات ہونے کے ناتے ایک زندہ اکائی بن کر رہا لیکن دشمن انسانیت اور درندہ صفت لوگوں نے کچھ ایسی روش اختیار کی اور مختلف خانوں میں بٹ کر اس قدر نفرتوں بھرا برتاؤ اختیار کیا کہ حنیف ترین کو یہ سوال کرنا پڑا:

قطع رحمی کا کیوں ہدف ہوں حنیف
غیر گھس آئے خاندان میں کیا

ہمارے تہذیبی شعور میں کشاکش اور باطن میں تنہائی ایسا المیہ ہے جس کا ذکر احتجاج بن کر حنیف کی غزل میں در آیا ہے وہ اضطراب اور درد و کرب میں مبتلا ضرور ہیں لیکن یہ طرز احساس ان کی شناخت بن گیا ہے اور ان کی شاعری میں یہ کرب آ گہی، یہ دردمندی اور سوز و گداز ان کی انفرادیت کا نشان امتیاز بھی ہے اور شمس الرحمٰن فاروقی کے بقول ''حنیف ترین ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جو اپنی شاعری میں دنیا کی پیچیدگی، گہرائی اور حیرت و انبساط کو الفاظ کے ذریعے کاغذ پر اعلیٰ ترین تخلیقی انداز میں لے آتے ہیں۔''

جس کو کہتے ہو تم سپر بازار — درد بکتا ہے اس دکان میں کیا
خامشی کا مذاق اڑاتا ہے — آج پھر قہقہہ لگانا ہے
اپنے جانے کا غم نہیں مجھ کو — جانے والوں کی یاد آتی ہے

غزل کے درونِ خانۂ دل ہونے والے حوادث سے پردہ اٹھانے اور تحلیل نفسی کو موضوع سخن بنانے میں بیشتر شعراء کی دلچسپی ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ فکر و فلسفہ کی کوکھ سے جنم لینے والے سوالات کا جواب شعری صداقتوں کے حوالے سے ہمیشہ پسندیدہ کہلایا، حنیف ترین کی غزل میں سہل ممتنع اشعار اور ان میں حوادث اور تحلیل نفسی کی امثال بکثرت ملتی ہیں، وہ کاروبار شوق ہو، ناکامی و نامرادی کا تذکرہ ہو یا کسی معاشرتی المیے کو اجاگر کرنا مقصود ہو، وہ غزل کی نزاکت کا لحاظ رکھتے ہوئے مائل اظہار ہونا چاہتے ہیں:

ایک آواز چھن سے آتی ہے — کوئی شے مجھ میں ٹوٹ جاتی ہے
ٹوٹا رشتہ بحال مت کرنا — اور اس کا ملال مت کرنا
مٹ جاتی ہے حسنِ لطیف — بھوکوں میں آداب کہاں
رات کے سوتے ہی تیری — جاگتی ہے خوشبو مجھ میں
دریا کرتا ہے قید آنسو میں — درد میں اس قدر روانی ہے
وہ جو میرے اندر ہے — بات اسی کی لب پر ہے

حنیف ترین کو اپنے قاری سے ہمکلام ہونے کے علاوہ اس کی ذہنی سطح کا جائزہ لینے اور سخن فہمی کے حوالے سے یہ خیال دامن گیر رہتا ہے کہ معانی و مفہوم کی تمام پرتیں اس پر کھلنے کے مراحل بطریق احسن وا ہونا ضروری ہیں۔ شعر پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسنے سے یقیناً شاعر کیف و سرمستی میں مبتلا ہو جاتا ہے لیکن شاعر مشرق علامہ کے بقول:

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ — کہ میں ہوں محرمِ رازِ درون ے خانہ

ہر باشعور اور زیرک فنکار ورق زندگی پر لکھی ہوئی تحریر کو خون جگر سے تابناک بناتا ہے۔ وہ اندھیرے کاٹنے کی خاطر اپنی بہترین صلاحیتیں کام میں لاتا ہے خصوصاً شاعر ایک مقصد عظیم کی ترسیل کا اہتمام کرتا ہے اس لیے وہ چاہتا ہے کہ اس کا قاری غور و فکر سے کام لے اور اس کی رسائی شعر کے صوتی آہنگ سے بڑھ کر مفہوم تک ہونی چاہیے:

لطف پورا لے اس کے معنی سے — صرف شعروں پہ واہ واہ نہ کر

ان کے نظریے کے مطابق شاعری قدرت کی رہنمائی کے بغیر ممکن نہیں اور یوں بھی جملہ فنون لطیفہ میں شاعری کا فن سب سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ حنیف ترین ہر لحمہ حصارِ نشۂ سخن میں مبتلا پائے گئے، ہوسکتا ہے کہ ان کی نظر کسی پیکر جمال پر ٹھہری ہو لیکن قاری نے غزل کو ان کا محبوب جانا ہے:

کہیں بھی جاؤں وہ رہتی ہے کُو بہ کُو مجھ میں
اسی سے رہتی ہے فرحت کی ہاؤ ہُو مجھ میں
نشاطِ عشق مرا اب اسے بھی لایا وہاں
جہاں پہ کرتی ہے وہ اپنی جستجو مجھ میں

گویا غزل میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جنہیں حنیف ترین کی نگاہِ انتخاب نے صفحۂ قرطاس پر جلوۂ جاناں کی صورت میں قاری کے روبرو الفاظ و معنی کے ارتباط و امتزاج کے ساتھ پیش کرنے کا عزم کر رکھا ہے:

رہتا ہوں میں بھی اس میں — گو وہ اس کا پیکر ہے
ہیں آنکھیں بھی مری اب پاس اس کے — وہ خود کو ان سے ہر دم دیکھتا ہے
ہوں گے تسخیر سارے کون و مکاں — خود یہ اب اعتبار سا کچھ ہے

حنیف ترین کے ہاں جذب و مستی، عشق ارضی اور فطری میلان کے اظہار میں بے باکانہ رویہ بھی ملتا ہے ان کی غزل میں اپنی کھوج لگانے اور محبوب کی مکمل سپردگی سے لذت کشید کرنے جیسے مضامین میں شائستگی اور دل بستگی کا ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ فرشتہ نہیں بلکہ آدمی ہیں:

وہ جب آنکھوں سے اپنی بولتی ہے
تو گرہیں لذتوں کی کھولتی ہے
ہیں یوں پیوست ہم اک دوسرے میں
میں سوچا کرتا ہوں وہ بولتی ہے

تری یادوں کی مستی لمس بن کر
مرے احساس میں رس گھولتی ہے
ہے نشہ تا کراں اس کے بدن کا
پہن کر مجھ کو اب وہ ڈولتی ہے

پھر میں دیکھوں گا وہ گدرِیلا بدن آج حنیفؔ
پھر وہ تلوار سی سینے میں اتر جائے گی
پھر نہ ملنے کے تو اب لاکھ بہانے کر لے
مجھ سے بچ کر تُو مری جان کدھر جائے گی

حنیف ترین برصغیر ہندوپاک کے ایسے شاعر ہیں کہ بیک وقت ان میں ولی دکنی اور ظفر اقبال کے لہجے کی کھنک پائی جاتی ہے، اس کے باوجود وہ اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں، ان کا منفرد لہجہ اور نیا میلان طبع قاری کو چونکانے کے لیے کافی ہے۔

ایک صدی کا قصہ

راج کھوسلہ

دیپک کنول (ممبئی' بھارت)

راج کھوسلہ کا جنم 31 مئی1925 کو پنجاب کے صنعتی شہر لدھیانہ میں ہوا۔اُسے بچپن سے ہی کلاسیکل سنگیت کی تعلیم ملی۔جب وہ جوان ہوا تو اُس نے آل انڈیا ریڈیو میں ایک قلیل وقفے کے لئے میوزک اسٹاف کے ساتھ کام کیا۔آل انڈیا ریڈیو کا ماحول اُسے زیادہ دنوں تک راس نہیں آیا اور وہ بمبئی چلا آیا۔وہ اصل میں فلمی گلوکار بننا چاہتا تھا۔اُسنے کئی مہینوں تک بمبئی شہر کی خاک چھانی۔کئی نامی گرامی سنگیت کاروں سے ملاقات کی مگر بات کہیں سرے چڑھی ہی نہیں۔جدوجہد کے ان ہی ایام کے دوران اُسکی ملاقات دیو آنند سے ہوئی۔دیو آنند چونکہ خود ایک پنجابی تھا اس لئے وہ پنجابیوں کے لئے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتا تھا۔دیو آنند کم عمری کے باوجود کافی نظر شناس تھا۔اُسنے راج کھوسلہ کو اپنی چھتر چھایا میں لے لیا۔دیو آنند کامیابی کی منزلیں تیزی سے پار کرتا جا رہا تھا۔اُسنے اپنی ایک فلم کمپنی بھی کھولی تھی جس کا نام اُس نے''نوکیتن فلمز'' رکھ دیا تھا۔وعدے کے مطابق اُسنے اپنی پہلی فلم''بازی'' کی ہدایت کاری گورودت کو سونپی تھی۔راج کھوسلہ تو اب بھی گلوکار بننے کے سپنے دیکھ رہا تھا۔یہ دیو آنند تھا جسنے راج کھوسلہ کو ڈائرکشن سیکھنے کی صلاح دی اور اُسے گورودت کے ماتحت کام کرنے پر آمادہ کرلیا۔دیو آنند نے دیکھا کہ یہ لڑکا کافی ذہین ہے اسلئے وہ اُسکی مسلسل حوصلہ افزائی کرتا رہا۔فلم''بازی''1951 میں ریلیز ہوئی اور بیحد کامیاب رہی۔راج کھوسلہ کو بھی اب معاون ہدایت کاری کا کام راس آنے لگا تھا۔اُسنے گورودت کے معاون کے طور پر کئی فلموں میں اُسکے ساتھ کام کیا جیسے 1952 میں ریلیز ہونے والی فلم''جال''میں1953 کی''باز''میں اور 1954 کی گورو دت بینر تلے بننے والی پہلی اور بیحد کامیاب فلم''آر پار''میں بھی وہ گورودت کے ساتھ ہی رہا۔''آر پار'' کو چھوڑ کے باقی ساری فلمیں''نوکیتن فلمز'' کے بینر تلے بنی تھیں۔''نوکیتن فلمز'' دیو آنند کی ذاتی فلم پروڈکشن کمپنی تھی جسکے روح رواں بذات خود دیو آنند تھے۔راج کھوسلہ گورودت کی چھتر چھایا میں رہ کر ہدایت کاری کی باریکیوں کو پوری طرح سمجھ چکا تھا۔دیو آنند اس نوجوان کی جودت کو پہچان چکا تھا۔اُسنے راج کھوسلہ کو بطور ہدایت کار پہلا بریک دلوایا۔فلم تھی''ملاپ''۔اس فلم کے مکھیہ اداکاروں میں دیو آنند اور گیتا بالی تھے۔اس فلم کی موسیقی ایک نئے موسیقار این دتہ نے دی تھی۔باوجود اچھی اسٹار کاسٹ اور مدھر سنگیت کے جب یہ فلم 1954 میں ریلیز ہوئی تو یہ فلم باکس آفس پر کوئی کمال نہ دکھا سکی۔کوئی اور ہدایت کار ہوتا تو اپنی فلم کی ناکامی کے ساتھ ہی وہ اپنا بوریا بستر سمیٹ کر اپنے گھر لوٹ چکا ہوتا مگر راج کھوسلہ پر قسمت مہربان تھی۔اُسکے سر پر دیو آنند کا ہاتھ تھا۔دیو آنند اب ایک اسٹار بن چکا تھا۔اُسے اپنے اس نوجواں ڈائرکٹر کی قابلیت پر اسقدر بھروسہ تھا کہ اُس نے اپنے دوست گورودت کو آمادہ کر کے اُسے گورودت فلمز کی پہلی فلم''سی۔آئی۔ڈی'' کی ہدایت کاری کا چانس دلوا دیا۔اس فلم میں دیو آنند ہیرو کا رول ادا کر رہا تھا جب کہ اس فلم کی ہیروئن شکیلہ تھی۔گورودت نے ساؤتھ کی ایک لڑکی کو بھی اس فلم میں بریک دیا تھا جس کا نام وحیدہ رحمان تھا۔سانولی رنگ کی چھریرے بدن والی یہ خوبصورت حسینہ ساؤتھ کی کئی فلموں میں کام کر چکی تھی۔گورو دت پہلی ہی نظر میں اس حسینہ کے زلف گرہ گیر کا اسیر ہو چکا تھا۔اس فلم کی شوٹنگ جب شروع ہوئی تو گورودت نے راج کھوسلہ پر حاوی ہونے کی کوشش کی۔یہ بیجا مداخلت راج کھوسلہ کو پسند نہ تھی۔اُس نے اپنے محسن سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ اُسے اپنے ڈھنگ سے اس فلم کو بنانے کی چھوٹ دیں۔وہ اُس پر اپنا اسٹائل لادنے کی کوشش نہ کریں۔گورودت جانتا تھا کہ راج کھوسلہ کو دیو آنند کی پشت پناہی حاصل ہے اس لئے وہ کڑوے گھونٹ پی کر بیٹھ گیا۔اچھی بات یہ ہوئی کہ اُس کے بعد اُس نے راج کھوسلہ کے کام میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی۔

راج کھوسلہ کو باقی کے سبھی اداکاروں سے بھرپور تعاون مل رہا تھا سوائے وحیدہ رحمان کے جس نے راج کھوسلہ کی ناک میں دم کر کے رکھا تھا۔وہ اُس کے ہر شاٹ میں مین میخ نکالتی رہتی تھی۔کبھی کبھی راج کھوسلہ اپنا آپا کھو بیٹھتا تھا۔یہ دیو آنند تھا جو بیچ میں پڑ کر معاملہ سلجھا دیتا تھا۔چونکہ وحیدہ رحمان کو گورودت کی پشت پناہی حاصل تھی اسلئے وہ ہر بات میں فی نکالتی تھی۔راج کھوسلہ نے تمام تر مشکلوں کے باوجود اس فلم کی فلمبندی میں کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کیا۔یہ فلم ایک سسپنس تھرلر تھی جو راج کھوسلہ کی بہترین ہدایت کاری سے آراستہ تھی۔یہ فلم جب 1956 میں ریلیز ہوئی تو اس نے باکس آفس کھڑکی پر ہنگامہ مچا دیا۔فلم کو بے پناہ کامیابی ملی۔راج کھوسلہ اپنے آپ کو ایک کامیاب ڈائرکٹر ثابت کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔اس فلم کی کامیابی کو دیکھ کر وحیدہ رحمان کو کھلے عام اس بات کا اعتراف کرنا پڑا کہ راج کھوسلہ واقعی ایک باصلاحیت ہدایت کار ہے۔وحیدہ رحمان کو اس فلم نے راتوں رات ہندی فلموں کا اسٹار بنا دیا تھا۔

راج کھوسلہ نے''سی۔آئی۔ڈی'' کے بعد ایک کہانی لکھی جس کا نام''سولہواں سال'' تھا۔اس کہانی پر چندرکانت ڈیسائی نے فلم بنانے کا فیصلہ کیا۔اُس نے راج کھوسلہ کو اس فلم کی ہدایت کاری سونپ دی۔راج کھوسلہ نے اپنے محبوب اور مربی دیو آنند کو اس فلم کے لئے سائن کیا۔دلچسپ بات یہ تھی کہ وحیدہ رحمان اس فلم میں راج کھوسلہ کے ساتھ کام کرنے پر فوراً راضی ہوگئی۔یہ ایک عام ڈگر سے ہٹ کر فلم تھی جو ایک رات کی کہانی پر مبنی تھی۔اس کی موسیقی ایس۔ڈی۔برمن نے ترتیب دی تھی۔اس فلم کا یہ مشہور گانا''ہے اپنا دل تو آوارہ، نہ جانے کس پہ آئے گا'' آج بھی دل میں سوئی ہوئی اُمنگیں جگا دیتا ہے۔راج

کھوسلہ چونکہ کلاسیکل سنگیت میں مہارت رکھتا تھا اسلئے اُس کی ہر فلم کی موسیقی بڑی پُر کیف اور مدھر ہوتی تھی۔ ''سولہواں سال'' بھی کامیاب رہی۔

دیو آنند نے راج کھوسلہ سے جسطرح کی اُمیدیں لگا رکھی تھیں وہ اُن سے بھی آگے نکل چکا تھا۔ اُسنے اپنے آپ کو ہر کسوٹی پر کھرا ثابت کر کے دکھایا تھا۔ دیو آنند نے اُسے نوکیتن کی فلم ''کالا پانی'' ڈائرکٹ کرنے کا موقع عطا کیا۔ راج کھوسلہ اپنے محسن کو اس بار بھی مایوس کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ''کالا پانی'' بھی کرائم تھرلر تھی۔ راج کھوسلہ کو اب فلمساز کرائم تھرلر کا ماسٹر سمجھنے لگے تھے۔ فلم ''کالا پانی'' اُمید سے بھی زیادہ کامیاب ثابت ہوئی۔ اس فلم نے سبھی سرکٹوں میں بزنس کے ریکارڈ توڑ دئے۔ یہ فلم بھی سن 1958 میں ہی ریلیز ہوئی۔ اس فلم میں مدھوبالا دیو آنند کی ہیروئن تھی جب کہ ساتھی کلاکاروں میں نلنی جیونت اور کشور ساہو تھے۔

''کالا پانی'' کے بعد راج کھوسلہ نے جال مستری کے ساتھ ایک فلم بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس بار اُنہوں نے راجندر سنگھ بیدی کی ایک کہانی چنی جس کا نام اُنہوں نے ''بمبئی کا بابو'' رکھ لیا۔ اس فلم کا ہیرو راج کھوسلہ کا محبوب اداکار دیو آنند تھا اور اُسکے مد مقابل بنگال کی حسینہ سچترا سین تھی۔ یہ فلم عام ڈگر سے ہٹ کر ایک متضاد موضوع پر مبنی تھی۔ دیو آنند ایک پیشہ ور چور ہے جو اپنی مجرمانہ زندگی سے تنگ آ کر شہر چھوڑ کے ایک گاؤں میں پہونچ جاتا ہے جہاں ایک پریوار اُسے اپنا کھویا ہوا بیٹا سمجھ کر اپنے گھر میں پناہ دیتا ہے۔ اس پریوار کی ایک جوان بیٹی ہے جو دیو آنند کو اپنا کھویا ہوا بھائی سمجھتی ہے جب کہ دیو آنند اُسے پیار کرنے لگتا ہے۔ اسی کشمکش میں ایک دن بہن کا پیار جیت جاتا ہے اور دیو آنند اُسے ایک بھائی کی طرح گھر سے رخصت کر دیتا ہے۔ یہ فلم وقت سے پہلے بنائی گئی تھی۔ اسلئے لوگوں کو اس طرح کا موضوع پسند نہ آیا اور فلم کو خاطر خواہ کامیابی نہ ملی۔

راج کھوسلہ نے ششادھر مکھر جی کو ایک کہانی سنائی جس کا نام ''ایک مسافر ایک حسینہ'' تھا۔ ششادھر مکھر جی کو یہ کہانی اتنی پسند آئی کہ اُسنے اس فلم کو پرڈیوس کرنے کا فیصلہ کیا اور اس فلم کو ڈائرکٹ کرنے کے لئے راج کھوسلہ کو سائن کیا۔ اُن کے بیٹے جائے مکھر جی کی تین فلمیں ریلیز ہوئیں تھیں جن میں ''لو ان شملہ'' کو چھوڑ کے باقی دو فلمیں ''ہم ہندوستانی'' اور ''اُمید'' نہیں چلی تھیں۔ ششادھر مکھر جی اپنے بیٹے کو ایک اچھے اور کامیاب ڈائرکٹر کے ہاتھوں میں دینا چاہتا تھا جو اُس کی کلا کو نکھار سکے۔ راج کھوسلہ اب وہ پارس بن چکا تھا جس کے چھونے سے پتھر بھی سونا بن جاتا تھا۔ راج کھوسلہ نے سادھنا کو لے کر فلم ''ایک مسافر ایک حسینہ'' مکمل کی جس کا مدھر سنگیت او۔ پی۔ نیر کا تھا۔ فلم ہٹ ثابت ہوئی اور جائے مکھر جی کی ڈوبتی نیّا پھر سے کنارے لگی۔ یہ فلم 1962 میں ریلیز ہوئی۔

راج کھوسلہ کو سسپنس تھرلر کے لئے جانا جاتا تھا۔ ''ایک مسافر ایک حسینہ'' کے ہٹ ہونے کے بعد راج کھوسلہ دیو آنند کے کیمپ سے باہر نکل آیا اور اُسے بمبئی کے ٹاپ کے فلمساز سائن کرنے لگے۔ اُنہیں این۔ این۔ سپی نے اپنی فلم ''وہ کون تھی'' کے لئے سائن کیا۔ اس فلم کے مرکزی کلاکار منوج کمار اور سادھنا تھے۔ وہ سادھنا کے حسن پر ایسے فریفتہ ہو گئے تھے کہ اپنی بیشتر فلموں میں اُس نے سادھنا کے ساتھ کام کیا۔ این۔ این۔ سپی کی یہ فلم سن 1964 میں ریلیز ہوئی۔ فلم نے ہر شہر میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ دئے۔ راج کھوسلہ نے ایک بار پھر یہ ثابت کر دیا کہ وہ اس طرح کی فلمیں بنانے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

اس فلم کی کامیابی کے بعد راج کھوسلہ کو ایک اور فلم ڈائرکٹ کرنے کو ملی۔ یہ فلم تھی پریم جی کی ''میرا سایہ''۔ پریم جی کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہونگے کہ پریم جی ایک زمانے میں دلیپ کمار کا سیکرٹری ہوا کرتا تھا۔ دلیپ صاحب کے نام کا فائدہ اُٹھا کر وہ پرڈیوسر بن بیٹھا اور اُس نے کئی کامیاب فلمیں بنائیں۔ ''میرا سایہ'' اُن میں سے ایک تھی۔ اس فلم میں سنیل دت کے مقابل سادھنا نے کام کیا تھا۔ سادھنا کا اس فلم میں ڈبل رول تھا۔ سادھنا راج کھوسلہ کی کمزوری بن چکی تھی۔ سادھنا کی بے مثال اداکاری اور راج کھوسلہ کی جاندار ہدایت کاری نے اس فلم میں چار چاند لگا دئے تھے۔ اس فلم کی موسیقی مدن موہن نے ترتیب دی تھی فلم شروع سے لے کر آخری فریم تک ناظرین کو باندھ کے رکھتی ہے۔ اس فلم نے باکس آفس پر ہنگامہ مچا دیا۔

اسی سال راج کھوسلہ کی ایک اور فلم ریلیز ہوئی۔ یہ فلم تھی ہدا بہاری کی ''دو بدن''۔ اس فلم میں راج کھوسلہ نے پہلی بار ہندی فلموں کی ٹاپ کی ہیروئن آشا پاریکھ کے ساتھ کام کیا تھا۔ اس فلم کا ہیرو منوج کمار تھا۔ یہ ایک جذباتی پریم کہانی تھی۔ اس فلم کو بنا کر راج کھوسلہ نے فلمی پنڈتوں کو جھٹلا کے رکھ دیا تھا کہ وہ صرف سسپنس والی فلمیں ہی بنا سکتے ہیں۔ یہ فلم بھی اپنے زمانے کی مشہور اور کامیاب فلم تھی۔ اس کا سنگیت روی نے ترتیب دیا تھا جو کافی مقبول رہا تھا۔

راج کھوسلہ کی کامیابی کو دیکھ کر فلم فائنانسر راج کھوسلہ کی ذاتی فلموں پر سرمایہ لگانے کے لئے تیار تھے۔ راج کھوسلہ نے اپنے بینر تلے ایک اور سسپنس فلم ''انیتا'' بنانے کا فیصلہ کیا۔ منوج کمار تو اُس کا پسندیدہ ستارہ بن کر رہ گیا تھا۔ ساتھ ہی وہ سادھنا کا بھی دیوانہ تھا۔ وہ اس فلم میں اپنے دونوں من پسند ستاروں کو لے کر آیا۔ اس فلم کی موسیقی کے لئے اُس نے لکشمی کانت پیارے لال کو چنا۔ فلم 1967 میں ریلیز ہوئی۔ فلم ''انیتا'' متوقع کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ فلم ٹھیک ٹھاک رہی۔

پریم جی نے ایک بار پھر راج کھوسلہ کے ساتھ فلم بنانے کا فیصلہ کیا۔ یہ فلم تھی۔ ''چراغ''۔ اس فلم میں وہ سنیل دت کے ساتھ آشا پاریکھ کو لے آئے تھے۔ اس فلم کا سنگیت وہ اپنے محبوب موسیقار مدن موہن کو سونپ چکے تھے۔ یہ فلم بھی کافی جذباتی تھی۔ اسمیں آشا پاریکھ نے ایک اندھی لڑکی کا رول نبھایا تھا۔ اس فلم کو ملی جلی کامیابی ملی۔ فلمی نقادوں نے اس فلم کو کافی سراہا اور راج کھوسلہ کی ہدایت کاری کی کھل کر تعریف کی۔

اس فلم کے بعد راج کھوسلہ نے اپنے بینر کے تلے ایک اور فلم بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس بار اُس نے نہ ہی سسپنس اور نہ ہی کوئی جذباتی پریم کہانی پر فلم بنانے

کی کوشش کی بلکہ اُس نے ایک ایسا سبجکٹ چنا جو ہر خاص وعام کو پسند ہو۔ وہ اب کے کوئی کمی پیشی رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ سبجکٹ طے ہوگیا۔ فلم کا نام "دوراستے" رکھا گیا۔ اس فلم کے کلیدی رول میں راجیش کھنہ کو سائن کیا گیا۔ یہ وہ دور تھا جب راجیش کھنہ کی طوطی ہر طرف بولتی تھی۔ اس کے علاوہ ممتاز، بلراج ساہنی، پریم چوپڑہ، کامنی کوشل جینت اور بندو کو بھی اس فلم میں شامل کیا گیا۔ موسیقاروں کی مشہور جوڑی لکشمی کانت پیارے لال کو اس فلم کے سنگیت کے لئے چنا گیا۔ راج کھوسلہ نے انڈسٹری میں وہ مقام حاصل کرلیا تھا کہ کوئی بھی اُسکی آفر کو لبیک کہتا تھا۔ فلم کی شوٹنگ شدومد سے شروع ہوئی۔ یہ فلم راج کھوسلہ نے دل سے بنائی تھی۔ جب یہ فلم 1969 میں ریلیز ہوئی تو اس فلم نے باکس آفس پر تہلکہ مچا دیا۔ یہ ایک فیملی ڈرامہ تھا جسے ہر خاص وعام نے پسند کیا۔ اس فلم کو سات فلم فیئر ایوارڈس کی کیٹگری کے لئے منتخب کیا گیا جو کہ اپنے آپ میں ایک ریکارڈ ہے۔ اس فلم کی کامیابی نے راج کھوسلہ کو شہرت کی معراج تک پہونچا دیا۔

راج کھوسلہ کی کامیابی کا یہ سفر جاری وساری رہا۔ 1971 میں فلم "میرا گاؤں میرا دیش" ریلیز ہوئی۔ ڈاکوں کے موضوع پر بننے والی یہ پہلی فلم تھی جسے راج کھوسلہ ڈائرکٹ کر رہا تھا۔ اس فلم کے مکھیہ اداکار تھے دھرمیندر، آشا پاریکھ اور ونود کھنہ۔ یہ فلم بھی بہت بڑی ہٹ ثابت ہوئی تھی۔ اس کے بعد 1972 میں دوچور، 1973 میں "شریف بد معاش" اور "کچے دھاگے"۔ 1975 میں "پریم کہانی" اور 1976 میں "نہلے پہ دہلا"۔ ان سبھی فلموں کو ملی جلی کامیابی ملی۔ 1978 میں راج کھوسلہ نے اپنے بینر تلے فلم "میں تلسی تیرے آنگن کی" بنا کر باکس آفس پر دھاکہ کر دیا۔ یہ فلم تین کرداروں پر مشتمل تھی جنہیں وجے آنند، نوتن اور آشا پاریکھ نے اس خوبی سے نبھایا تھا کہ فلم دیکھنے والے اُن کی اداکاری دیکھ کر عش عش کر اُٹھے۔ اس فلم کے کہانی کار چندر کانت کاکوڑکر تھے جنہوں نے راج کھوسلہ کی کامیاب فلم "دوراستے" لکھی تھی۔ اس فلم کو دس فلم فیئر ایوارڈ کے لئے منتخب کیا گیا تھا جب کہ اس فلم کو تین ایوارڈ ملے جن میں بہترین فلم کے لئے راج کھوسلہ، بہترین اداکاری کیلئے نوتن اور بہترین مکالمے کے لئے راہی معصوم رضا کو فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔

فلمساز لیش جوہر نے راج کھوسلہ کو اپنی فلم کے لئے سائن کیا جس کی کہانی سلیم جاوید نے لکھی تھی۔ فلم کا نام "دوستانہ" تھا۔ لیش جوہر اس فلم کو اونچے پیمانے پر بنانے کا خواہاں تھا اسلئے اُس نے اس فلم کے لئے امیتابھ بچن، شترو گھن سنہا اور زینت امان کو سائن کیا۔ یہ تینوں اُس دور کے اسٹار تھے۔ لیش جوہر فلم انڈسٹری میں بڑی اچھی ساکھ رکھتا تھا۔ تینوں اداکار اس فلم میں کام کرنے کے لئے راضی ہو گئے۔ یہ فلم 1980 میں ریلیز ہوئی۔ اس فلم نے ریکارڈ توڑ کامیابی حاصل کی۔ یہ راج کھوسلہ کی ہدایت میں بننے والی آخری کامیاب فلم تھی۔

اس کے بعد راج کھوسلہ جیسے اپنی کامیابی کا منتر بھول گیا۔ اُس نے سنی دیول کو لے کر فلم "سنی" بنائی جو اوندھے منہ گری۔ راج کھوسلہ ناکامی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ فلموں کی ناکامی اُسے شراب کی اور لے گئی۔ وہ اپنے غم بھلانے کے لئے بوتل کا سہارا لینے لگا۔ حالت یہ ہوگئی کہ وہ صبح شروع کرتا تھا اور تب تک پیتا رہتا تھا جب تک اُسکے ہوش قائم رہتے تھے۔ اس بے ہوشی کے عالم میں وہ دھیرے دھیرے سب کچھ کھوتا چلا گیا۔ اُسکی فلمیں 1984 کی "میرا دوست میرا دشمن" 1984 کی ہی "مٹی مانگے خون" اور 1989 کی "نقاب" فلاپ ثابت ہوئیں۔ "نقاب" میں تو وہ کھڑا رہنے کی حالت میں ہوتا نہیں تھا۔

راج کھوسلہ بڑا ہی ذہین اور قابل آدمی تھا۔ اُسکی جودت کو دیو آنند اُسکے ابتدائی دنوں میں ہی پہچان گیا تھا۔ وہ ہمہ صفت فن کار تھا۔ بہت کم لوگ جانتے ہونگے کہ راج کھوسلہ ایک اچھا لیکھک بھی تھا۔ اُس نے "ملاپ" "سولہواں سال" "ایک مسافر ایک حسینہ" "کچے دھاگے" اور "پریم کہانی" کی کہانیاں اور منظر نامے لکھے۔ اُس نے فلم "جال" میں اداکاری بھی کی۔ اُس فلم میں پولیس سپرڈنٹ کے کردار میں جو کلاکار نظر آتا ہے وہ اور کوئی نہیں بلکہ راج کھوسلہ ہی تھا۔

راج کھوسلہ کئی عورتوں سے بے پناہ پیار کرتا رہا۔ ایک اُس کی ماں تھی جس کا ذکر آتے ہی وہ رو پڑتا تھا۔ ایک سادھنا تھی جسے وہ دل ہی دل میں چاہتا تھا۔ اُسنے عورت کو ہمیشہ عزت وتوقیر کی نظر سے دیکھا۔ اپنی فلموں میں بھی اُسنے عورت کی عظمت کو سر بلند رکھا۔ فلموں کا یہ سرتاج 9 جون 1991 کو 66 سال کی عمر میں اس جہاں کو چھوڑ کے چلا گیا۔

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وقار جاوید

(راولپنڈی)

عزیزِ گرامی گلزار جاوید۔

سلامتی اور خیر کی دعا کے ساتھ شکر گزاری اور تحسین کہ آپ نے تازہ چہارسو کے قرطاسِ اعزاز کو آخر کار اس بندہِ عاجز کے نام کر ہی دیا اور ایسی مدیرانہ ہنر مندی اور سلیقے کے ساتھ کہ ہر جانب سے داد و تحسین کی صدائیں آتی ہیں۔ آپ نے ذرّے کو آفتاب بنانے کی اچھی کوشش کی۔ اللہ آپ کی توفیقات میں اضافہ فرمائے اور صحت و تندرستی کے ساتھ سلامت رکھے۔ آمین۔

مجھے یاد ہے کہ کئی برس پہلے آپ نے مجھ ہیچمداں کو قرطاسِ اعزاز کے لیے چنا تھا۔ مگر میری ازلی کم توجہی کی بنا پر بات آئی گئی ہوگئی اور میں شرمندگی میں پناہ لیے رہا۔ پھر یہ معاملہ تازہ ہوا اور میرے برادرِ گرامی نند کشور وکرم نے پھر میری توجہ اس جانب مبذول کرائی۔ ادھر یہ دیکھ کر میں حیران ہوا کہ آپ کی دلچسپی اور محبت بھی ویسی ہی برقرار ہے۔ بھائی نند کشور وکرم سے میں واقف تو مدتوں سے تھا۔ میں ہی کیا ان کے نام اور کام سے تو پوری اردو دنیا واقف ہے۔ آج وہ اردو زبان و ادب کے حوالے سے چند سینئر ترین مدیران میں سے ہیں۔ میں جب ان سے ملا تو کھلا کہ وکرم صاحب جیسا صاحبِ نظر، سچّا، کھرا اور بے لاگ معاملت رکھنے والا شخص تو ڈھونڈنے سے بھی ملنا آسان نہیں۔ پس جب سے ہی میں ان کا معتقد ہوگیا۔ ان سے رابطہ کم مگر رشتۂ محبت استوار ہے۔ قرطاسِ اعزاز کے ذیل میں وکرم بھائی کا حکم اور آپ کی دلچسپی اور خوشدلی نے ہی مجھے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ احسان مند ہوں۔

سلیقے اور حسن سے مزّین یہ قرطاسِ اعزاز آپ نے خوب ترتیب دیا۔ چہارسو میں اس اعزاز کے ساتھ شامل ہونا میرے لیے یقیناً باعث اعزاز ہے۔ یہاں میں یہ اعتراف بھی کروں کہ اس سارے معاملے میں کچھ خاص معاونت میں آپ کی نہیں کر سکا۔ ساری زحمتیں آپ ہی کو اٹھانی پڑیں۔ بس اسی طرح میری شرمندگی کے سوسو سامان پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ مگر اب جو آپ نے چہارسو میں براہِ راست سے پہلے چوکٹے میں جو الفاظِ ستائش چن کر رکھ دیئے ہیں ان کا یہ ہیچمداں، ہیچ سخن، ہیچ عبارت کسی طور بھی خود کو اہل نہیں پاتا۔ میرے حق میں دعا فرمایئے کہ اس خوش کن بوجھ کی سہار پیدا ہو سکے۔

ادھر امجد اسلام امجد کی محبت بھری پُر خلوص نظم بھی آپ نے خوبصورت انداز میں چھاپی ہے۔ جی خوش ہوا۔ امجد میرے دل سے بہت قریب ہیں۔ اپنے ادبی استحقاق کے تحت وہ بجا طور پر آج اردو شاعری کے منظر نامے پر چند معتبر اور مقبول ترین ناموں میں ایک ہیں۔ اللہ تعالیٰ انُ پر اور آپ پر مزید کامیابیوں اور کامرانیوں کے در وا کرے۔ آمین۔ آپ سے تعاون کرنے والوں میں شعیب زیدی، عظمیٰ رشید، صاعقہ انعام اور عطیہ سکندر بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں۔ سو ان کے لیے دعائیں اور نیک تمنا ئیں۔ جن کے مضامین یا تاثرات میرے بارے میں آپ نے شریکِ اشاعت کیے ان کے لیے میرا دل ممنونیت کے جذبات سے لبریز ہے۔ چہارسو ہمیشہ کی طرح آسودگی کا بہت کچھ سامان لئے نظر نواز ہوا ہے۔ ادبی ذوق کی آبیاری اور روایت کے استحکام کے لیے یہ سب کچھ کارِ خیر کے ذیل میں آتا ہے اور اس کا سہرا آپ کے سر ہے۔

پیرزادہ قاسم (کراچی)

میرے گُل و گلزار، تمام دعائیں تمہارے لیے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب آپ ۲۰۰۵ء میں ساہتیہ اکادمی دہلی تشریف لائے تھے تو پروفیسر وارث علوی آپ کو دنیا کا خوبصورت انسان کہہ کر پکار رہے تھے۔ عین اُسی طرح آپ بھی ایک سے ایک خوبصورت انسان کو ''قرطاسِ اعزاز'' کی زینت بنا کر یہ ثابت کرتے ہیں کہ اردو ادب ایک زندہ و تابندہ حقیقت ہے جس کی خوبصورتی اور مہک سے چہار جانب اُجیارا پھیلا ہوا ہے۔ ڈاکٹر قاسم پیرزادہ کی شاعری اُن کی شخصیت کی طرح براہِ راست دل میں اترتی محسوس ہوتی ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کے ہمراہ پیرزادہ قاسم صاحب سے مل چکا ہوں۔ یوں تو ڈاکٹر صاحب کی شاعری چندے آفتاب و چندے مہتاب ہے مگر پروفیسر جگن ناتھ آزاد و جون ایلیا، علی سردار جعفری، عزیز حامد مدنی اور وسیم بریلوی کے مضامین صراحت کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کی شاعری اور شخصیت کو نمایاں کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے ابتدائی دور کی کاوش ''زندگی بڑی حسین ہے'' بھی خوبصورت تحریر ہے۔ صاعقہ انعام نے ڈاکٹر صاحب کی شاعری سے خوبصورت انتخاب چنا ہے۔ اور جناب ''براہِ راست'' تو اس بار کمال کی چیز ہے۔ آپ کے سوالات تحقیقی بھی تھے اور تنقیدی بھی مگر ڈاکٹر صاحب کے جوابات نہایت بلیغ اور شریں گفتار کی عمدہ مثال ہے۔ پروین شیر صاحبہ کا سفر نامہ ''چند سیپیاں سمندروں سے'' نئی دنیا کی عمدہ سیر ہے اور فیروز عالم صاحب ''ہوا کے دوش پر'' روانی سے تحریر کر رہے ہیں اور قاری کی جکڑ بندی بھی خوب کرتے ہیں۔ دیپک کنول صاحب نے انڈین سینما کے بہت بڑے اداکار پرتھوی راج کپور کے حالات زندگی بڑے مربوط اور دلنشیں انداز میں تحریر کیے ہیں۔

رئیس الدین صاحب نے پروفیسر مظفر حنفی کی تصنیف کے حوالے سے ''قرطاس وقلم کا قیدی'' کے عنوان سے مختصر مگر جامعہ تحریر سپرد قلم کی ہے۔ حنفی صاحب قادر الکلام شاعر اور شریف النفس انسان ہیں۔ ایک اور کارنامہ آپ کا شموئل احمد صاحب کے ناول ''گرداب'' کا پورا باب شامل کرنا ہے۔ یہ ایک عمدہ تحریر ہے اور قاری کی دلچسپی کے تمام لوازمات اس کے اندر موجود ہیں۔ شعری

حصہ مزے لے کر پڑھ رہا ہوں۔

یوگیندر بہل تشنہ (یو۔ایس۔اے)

گلزار صاحب! آداب۔

نومبر دسمبر ۲۰۱۴ء کا شمارہ موصول ہوا۔ بہت بہت شکریہ۔ برادرم مَیں مکتوباتی ادیب نہیں لہذا بہت کم ہی رسائل کے صفحات پر مدیرانِ رسائل کو خطوط لکھتا ہوں۔ ہاں کبھی کبھار جب مجھے کسی شمارے میں کوئی خاص مضمون یا گوشہ اچھا لگتا ہے تو مَیں مدیر رسالہ کو ٹیلی فون ضرور کرتا ہوں۔ اور شاذ و نادر ہی خط لکھتا ہوں۔

اس بار آپ نے قرطاسِ اعزاز کے لئے اُردو شاعری کی ایک ممتاز و منفرد ادبی شخصیت پیرزادہ قاسم صاحب کا انتخاب کر کے ایک قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے کیونکہ چہارسو کے بہت سے قاری برسوں سے اس کی کمی محسوس کر رہے تھے کیونکہ انہیں بہت پہلے چہارسو کے قرطاسِ اعزاز کے لئے منتخب ہو جانا چاہیے تھا۔ خیر۔ مَیں نے بھی کئی بار محسوس کیا کہ پاکستان کی اتنی مقتدر ادبی شخصیت پر چہارسو میں گوشہ کیوں شائع نہیں ہو پایا۔ انہیں تو بہت پہلے شائع ہو جانا چاہیے تھا۔ یہی سوال مَیں نے قطر میں ملاقات کے دوران پیرزادہ صاحب سے بھی پوچھا تھا کہ ابھی تک آپ پر گوشہ منظرِ عام پر کیوں نہیں آیا؟ تو انہوں نے کہا کہ اس میں مدیر چہارسو کی نہیں بلکہ اُن کی کوتاہی ہے کہ گلزار صاحب کی فرمائش پر بھی مَیں ان کی فرمائش پوری نہ کر سکا۔ بہر حال اب آپ نے اُن پر گوشہ نکال کر ایک بہت اہم خدمت انجام دی ہے کیونکہ میری طرح اُن کے ہزاروں پرستار انہیں قرطاسِ اعزاز کے لئے منتخب کیے جانے کے منتظر تھے۔

اس گوشے کی اشاعت سے بے شمار اہلِ ادب استفادہ کریں گے اور مستقبل میں اُن پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے بھی مذکورہ شمارہ ایک مشعل راہ کا کام دے گا کیونکہ آپ نے حتیٰ الوسع اُن کے فن و شخصیت کے تمام گوشوں کو اس میں کور کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں آپ کا انٹرویو ''براہِ راست''، بہت ہی معلوماتی ہے اور پیرزادہ قاسم صاحب کے خیالات و افکار سے متعلق قارئین کو بڑی جانکاری فراہم کرتا ہے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر محمد علی صدیقی، شہزاد احمد، جون ایلیا، علی سردار جعفری، عزیز حامد مدنی، ابو الخیر کشفی، جگن ناتھ آزاد، وسیم بریلوی، عزیز اندوری کے مضامین بھی اُن کی شاعری اور شخصیت کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اُن کے منتخبہ کلام کو بھی پیش کر کے آپ نے ایک مستحسن قدم اُٹھایا ہے کیونکہ اُن کا کلام ہندوستان میں خاص طور پر بہت کم دستیاب ہے۔ مَیں اس خصوصی گوشے پر ایک بار پھر آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

نند کشور وکرم (دہلی، بھارت)

پھول ہی پھول!! گلزارِ چہارسو، السلام علیکم۔

چہارسو کی تازہ تقریبانہ افتاد (صورت) نے ایسا خوش کیا ہے کہ دل بقول بلّیوں اچھل رہا ہے۔ نجانے ہر خوشی کے موقع پر درمیان بلّیاں کہاں سے آ جاتی ہیں۔ رسالے میں صفحہ در صفحہ یہ اچھل کود بطرز خوب نظر آ رہی ہے۔ معیارات گویا آپ کے گھر پانی بھرتے ہیں۔ آپ بہر صورت انہیں اپنے قبضے میں رکھتے ہیں۔ ''چہارسُو'' ایک مقررہ ''توقف'' سے آتا ہے۔ اور ''خوش مطالعہ'' کے جملہ اسباب بہم پہنچاتا ہے۔ اب کے پروفیسر ڈاکٹر قاسم رضا صدیقی کے اس مخصوص قسم کے دیدار سے مسرت بے پایاں کو منہ دیکھا۔ پیرزادہ قاسم کی شاعری من بھاوتی ہے بدیں سبب ''ہماشا'' میں پذیرائی ٹھہرتی ہے۔ میں ان کے ترنم کا رسیا ہوں شعر کی تاثیر اپنی جگہ اور گلے کی مٹھاس اپنی جگہ۔ لفظیت کی شان دماغ میں ابھرتی ہوئی اور آواز کا رنگنا برس دل میں اُترتا ہوا۔ مشاہیر نے ان کی شاعری سے متعلق بڑی اچھی اور دل افروز رائے زنی کی ہے ایک مانے ہوئے خوش فکر اور خوش گلو شاعر کو جیسے لیا جا سکتا ہے اس طرح لیا گیا ہے۔ چہارسو نے پیرزادہ قاسم کو حسبِ دلخواہ عزت دی ہے۔ ایک بڑے شاعر کو اس اعزاز کے بڑے پن کا احترام دے کر آپ نے دل کی بڑائی کا ثبوت دیا ہے۔

پیرزادہ قاسم کی ٹائٹل غزل سے یہ شعر ملاحظہ ہوں:

غم سے بہل رہے ہیں آپ، آپ بہت عجیب ہیں
درد میں ڈھل رہے ہیں آپ، آپ بہت عجیب ہیں
دائرہ وار ہی تو ہیں، عشق کے راستے تمام
راہ بدل رہے ہیں آپ، آپ بہت عجیب ہیں
دشت کی ساری رونقیں خیر سے گھر میں ہیں، تو کیوں
گھر سے نکل رہے ہیں آپ، آپ بہت عجیب ہیں

بحر کے تکلّم اور تجمّل کی ہر بہر (گویا بحر) میں شاعر ایسا دست و قلم ہے کہ بذاتِ خود خوبصورت اور عجیب تر دکھائی دیتا ہے۔

ایک صدی کا قصہ پرتھوی راج کپور محبتوں اور لگاوٹوں سے مملو ایک خوش انداز تحریر ہے۔ دیپک کنول نے اس موضوع کو بڑی کامیابی سے سپردِ قلم کیا ہے۔ مجھے اس کے مطالعے سے بہت خوشی ہوئی۔ پرتھوی راج ایک عظیم فنکار تھے۔ فلم ''مغل اعظم'' میں دلیپ کمار، مدھو بالا اور دوسرے اداکاروں کا فن بھی عروج پر تھا مگر پرتھوی راج کپور ان سے دو قدم آگے تھے۔ پرتھوی راج لہجے کی تشکیل اور چہرے کی تمثیل میں ایک تخصیصی منظر نامہ در پیش کرنے میں حد درجہ کامیاب رہے فلم آوارہ میں ان کی اداکاری سنجیدہ کاری کا بلند پایہ نمونہ تھی غرض دیپک کنول ''ایک صدی کا قصہ'' میں کبھی کبھی معرکہ آرا ہو جاتے ہیں اور خوب ہوتے ہیں۔ نوید سروش یاد کرتے ہیں اور دل نکال لیتے ہیں۔ خدا ان کے زورِ بیاں کو اور زیادہ کرے۔ مزے کی بات ہے کہ وہ سب دوستوں کی عزت کرتے ہیں۔ کسی سے زیادتی ان کے بس کی بات نہیں۔ نوید سروش کی غزل کے پیرائے کیسے ہیں ذرا بتایئے تو۔۔۔ ان کا یہ شعر؟

مانا کہ منتظر اب کوئی نہیں ہے لیکن

مجھ کو پرانے گھر کے جالے پکارتے ہیں

آصف ثاقب (بوئی، ہزارہ)

بہت ہی پیارے گلزار جاوید، السلام علیکم۔

تازہ شمارے پر سرورق ڈاکٹر پیرزادہ قاسم صدیقی کی تصویر و تحریر سے مزین دیکھ دل خوش ہو گیا شاید آپ کے علم میں نہ ہو کہ ڈاکٹر صاحب سے میرے مراسم اسّی (۸۰) کی دہائی سے قائم ہیں اور آج تک بھی میں اُن کی محبتوں کا امین ہوں۔ میرا پہلا شعری مجموعہ ''آ گہی سزا ہوئی'' اگر اُن کے دیباچے سے منور تھا تو میری چوتھی کتاب ''روشنی اور پرچھائیاں'' کی تعارفی تقریب گزشتہ دنوں اُن ہی کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی۔ اُن کی عالی نسبی اور اُن کے بارے میں بہت ساری باتیں تو آپ کے ''براہِ راست'' نے مجھ پر منکشف کی ہیں وہ جتنے بڑے شاعر ہیں اُس سے کہیں بڑے وہ عظیم و نفیس انسان ہیں۔ ''چہارسو'' کا تازہ شمارہ ملنے کے بعد بھی اُن سے فون پر تفصیلی گفتگو ہوئی۔ اُن کے تعلق سے لکھے ہوئے اور چھپے ہوئے سارے مضامین تاریخ کا حصہ ہیں۔ سرورق پر شائع غزل کا ایک شعر جو دل و دماغ میں حشر برپا کر رہا ہے:

وقت نے آرزو کی لو دیر ہوئی بجھا بھی دی

اب بھی پگھل رہے ہیں آپ، آپ بہت عجیب ہیں

افسانوں میں بہترین افسانہ ''وہ چار جیل جانے والے'' تھا جس میں شہناز خانم عابدی نے ایک حقیقت کو افسانے کا روپ دے کر قدرت کے کھیل کا محاکمہ بہت خوبصورتی سے کیا ہے۔ مبارکباد۔

غالب عرفان (کراچی)

پیارے گلزار جاوید، سلام مسنون۔

چہارسُو کے رینوبہل نمبر کا مطالعہ ابھی مکمل کیا ہی تھا کہ تازہ چہارسُو سرورق پر ڈاکٹر قاسم پیرزادہ کی خوبصورت شبیہ اور اندر کے صفحات پر اُن کے بارے میں بہت سے عمدہ مضامین لے کر موصول ہو گیا۔ جس طرح پھول کی خوشبو پھول کی قربت سے پہلے حاصل ہو جاتی ہے اسی طرح چہارسُو کے تازہ شمارے کی خبر ہی نہیں بلکہ بہ نفسِ نفیس چہارسُو کا شمارہ انٹرنیٹ پر مل جاتا ہے مگر خدا جانے کیوں ابھی تک نیٹ پر کوئی کتاب یا جریدہ پڑھنے کی عادت نہیں پڑ سکی، جس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ نیٹ پر دستیاب ہونے کے چند دن کے بعد جب بذریعہ ڈاک پرچہ پہنچتا ہے تو اس کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد اس پر تبصرہ ارسال کرنے کے لئے بہت کم وقت بچتا ہے۔ اس مرتبہ مَیں نے کوشش کی کہ باقی تمام کتب یا رسائل کا مطالعہ ملتوی کر کے پہلے چہارسُو پڑھ لوں، اور اب اگر چہ سو فی صد نہیں، مگر کافی حصہ پڑھ چکا، اور اسی حوالے سے اس پر اپنی رائے دینے کی جسارت کر رہا ہوں۔

قرطاسِ اعزاز کا آغاز امجد اسلام امجد کی خوبصورت نظم 'روشنی بانٹتے لوگ' سے ہوتا ہے اور بہت خوب ہے، کہ ان چند سطروں میں امجد اسلام امجد نے پیرزادہ قاسم کی شخصیت اور فن پر وہ سب کچھ لکھ دیا ہے جو نثر میں کسی طویل مقالے میں ہی لکھا جا سکتا ہے۔ صاعقہ انعام صاحبہ نے پیرزادہ قاسم کی شاعری کا تبرّک نہیں، عطر پیش کرنے میں سلیقے کا ثبوت دیا ہے۔ ادبی دنیا کے سینئیر اور معروف مشاہیر نے مختلف زاویوں اور انداز سے پیرزادہ قاسم کی شاعری اور شخصیت پر جو اظہارِ خیال کیا ہے وہ واقعی پڑھنے سے تعلّق رکھتا ہے، مجھے ان مضامین میں شہزاد احمد، جون ایلیا اور پروفیسر وسیم بریلوی کے مضامین زیادہ پسند آئے۔ البتہ ایک بات جس کی جانب پتہ نہیں کیوں میری توجہ مبذول ہو گئی یہ ہے کہ پیرزادہ صاحب پر شامل گیارہ مضامین میں سے سات مضامین کے لکھنے والے اب اِس دُنیا میں نہیں ہیں گویا یہ مضامین گذشتہ برسوں میں لکھے گئے تھے۔ کتنا اچھا ہوتا کہ ایسی معروف شخصیت پر آج کے کچھ معروف ادیبوں اور تنقید نگاروں سے بھی مضامین لکھوائے جاتے۔ یہ سلسلہ پرانی نسل سے ادبی سرمائے اور ادبی تنقیدی صلاحیت کو نئی نسل میں منتقل کرنے کے لئے اہم سمجھا جانا چاہئے۔

افسانوں میں محترمہ سیمیں کرن کا افسانہ ''کلموہی کہیں کی'' بہت پسند آیا کہ اِس میں مرد غالب (male dominant) معاشرے میں ذہین سے ذہین خاتون کے بارے میں بھی وہی دیرینہ تعصّبات ابھی تک جاری و ساری ہونے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مرد (افسانے میں فخر الزّماں) محنت مشقّت کر کے ترقّی پائے تو ہر نظر میں اپنے لئے ستائش، رشک و حسرت اور فخر دیکھے، اور اسی کی کولیگ تابندہ حسین کو اسی کی طرح محنت مشقّت کر کے ترقّی حاصل کرنے پر اسے چھنال کہہ دیا جائے اور اس کے کردار پر انگلیاں اٹھائی جائیں، یہی ہمارا مجموعی رویّہ ہے جسے سیمیں کرن نے خوبصورتی سے قلمبند کیا ہے۔

ڈاکٹر فیروز عالم کی داستانِ حیات کی چھبیسویں قسط بھی دلچسپی سے پڑھی۔ ڈاکٹر صاحب کی عظمت اسی میں ہے کہ وہ اپنا ماضی اور اپنا 'ٹال والا گھر' نہیں بھولے اور شاید اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں اتنا نوازا ہے اور ڈاکٹر صاحب کی والدہ کی دعائیں بھی ان کے کام آئی ہیں جن میں انہوں نے کہا تھا کہ اللہ تمہیں ایسے گھر میں رہنا نصیب کرے گا جس کے فرش شیشے کی طرح چمکیں گے۔ جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کرم اور ماں کی دعائیں ہوں بھلا اُس کے نصیب کیوں نہ ایسے ہوں گے۔ اور جو لوگ زندگی کی اس انتہائی اعلیٰ سطح پر پہنچ کر بھی اپنا ماضی یاد رکھتے ہیں، یقیناً انتہائی قابلِ قدر ہوتے ہیں۔

رس رابطوں میں جناب سید نصرت بخاری کی اِس تجویز کی مَیں بھی تائید کرتا ہوں کہ تا حال چہارسُو میں جن لکھنے والوں کے گوشے شائع ہو چکے ہیں انہیں کتابی صورت میں بھی لانا چاہئے۔ یہ نہ صرف ان شخصیات پر تحقیق کرنے والوں کے لئے بلکہ دوسرے ادیبوں کے لئے بھی مفید ہو گا کہ انہیں ایک ہی جگہ بہت سے لکھنے والوں کے بارے میں قیمتی مواد میسّر آ جائے گا۔ اور مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ کام اس لئے زیادہ مشکل بھی نہیں ہو گا کہ ان تمام شخصیات کے گوشے کمپوزڈ صورت میں تو آپ کے پاس پہلے ہی موجود ہیں، بس انہیں یکجا کرنا ہے اور طابع کے حوالے کر دینا ہے۔

تازہ شمارے پر بس اتنا ہی لکھ سکوں گا۔ ہاں، اس سے پچھلے شمارے پر اس سے کہیں زیادہ لکھ سکتا ہوں کہ اُس کا ایک ایک لفظ پڑھ چکا ہوں اور اپنی عادت کے مطابق بہت سے صفحات پر پنسل سے نشان بھی لگا دیئے تھے کہ اُن کے بارے میں کچھ لکھوں گا، مگر اب شاید اُس پر تبصرہ بے وقت کی راگنی ہو لہٰذا کچھ نہیں لکھوں گا۔

نسیمِ سحر (راولپنڈی)

برادرِ محترم، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ مل گیا۔ شکریہ صد شکریہ! رسالہ ملتے ہی ''رس رابطے'' کی طرف دھیان جاتا ہے۔ اس دفعہ خطوط کی دنیا بھر پور ہے۔ بہت کچھ حاصل ہوا۔ میں میر پور خاص کے جناب نوید سروش کا شکر گزار ہوں کہ انہیں میرا شعر پسند آیا:

مِرے گھر میں کبھی تو ہوگا چین آرام زہیر
سرسٹھ سال گزارے میں نے جس کو بنانے میں

پھر قرطاسِ اعزاز کی طرف آیا۔ اور ''براہِ راست'' پڑھا۔ اس دفعہ پیرزادہ قاسم رضا کے بارے بڑے بڑے حضرات نے بڑے اونچے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ چاروں افسانے پڑھ ڈالے۔ آغا گل کا افسانہ ''بروری روڈ'' اچھا لگا۔ غزلیں زوردار اور دل نشیں ہیں۔ ''وقت کی آندھی'' سے تین شعر اور ''روحِ وجدان'' کے کئی شعر پسند آئے اور اچھے لگے۔

پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)

برادرِ محترم گلزار جاوید، مزاجِ گرامی۔

چہارسو نظر نواز ہوا۔ پرچہ حسبِ روایت خوبصورت، دیدہ زیب اور مندرجات کے حوالے سے وقیع، جامع اور موثر نظر آیا۔ پیرزادہ قاسم اردو ادب کے نامور تخلیق کار ہیں اور ماہرِ تعلیم بھی۔ اُن کی تحریریں ہمیشہ متاثر کرتی ہیں۔ اتنے بڑے بڑے لوگوں کی آراء اور تحریریں پرچہ کو اعتبار اور وقار فراہم کر رہی ہیں۔ عزیز حامد مدنی، علی سردار جعفری، جگن ناتھ آزاد، جون ایلیا، محمد علی صدیقی، کیا کیا لوگ یاد آئے۔ جگن ناتھ آزاد ہمارے میانوالی سے تھے، ان کے والد گرامی تلوک چند محروم میرے والد صاحب کے استاد تھے۔ اور نامی گرامی شاعر اور ادیب تھے۔ ''سندھ کا پانی''

اے بادِ صبا کچھ پیغام رسانی
گر تجھ کو نظر آئے کہیں سندھ کا پانی

اُن کی نظم بہت مشہور ہوئی جو کہ بہت سارے بزرگوں کو زبانی یاد ہے۔ برادرم آغا گل کا افسانہ ''بروری روڈ'' بہت اچھا لگا۔ غزلیں، نظمیں، مکتوبات اور شخصیات سب کچھ دل کو چھو لینے والا ہے۔ ''چہارسو'' اپنی ایک پہچان اور اردو زبان کی آن بان اور شان بن چکا ہے۔ اللہ قائم دائم رکھے۔

کرامت بخاری (لاہور)

مدیرِ محترم، سلام ورحمت۔

نومبر دسمبر ۲۰۱۴ء کا آخری شمارہ پیرزادہ قاسم صاحب کے سکیچ و خوبصورت غزل کے ساتھ ملا، بہت شکریہ۔ اپنی محدود رسائی اُن کے بہت اچھے شاعر و جامعہ کراچی کے باکمال وائس چانسلر ہونے تلک ہی تھی، شاندار شناسائی تو براہ راست اور مشاہیر ادب کے مضامین سے ہوئی جو نہایت اخلاص مندی وضعداری اور قریبی موانست سے تحریر کیے گئے جن سے ڈاکٹر صاحب کے متصوفانہ پس منظر، قد آور علمی ادبی شخصیات سے فیضیابی، تہذیبی شائستگی، شعری آگہی، اعتدال پسندی، رجائی و اثباتی نکتہ نظر اور اس سے سوا بھی بہت کچھ کا علم ہوا جو ان کے منفرد و ممیز صاحبِ اسلوب شاعر ہونے کا تعین کرتے نیز شعوری روشنی و ذہنی آسودگی بھی عطا کرتے ہیں، اس کے علاوہ بھی جستہ جستہ دیگر دانشوروں کی آراء و تاثرات سے مزید سائنسی و شعری، تنظیمی و تدریسی فکری و لاشعوری جہات کا عالمانہ سطح پر ادراک ہوا نظمیہ و غزلیہ انتخاب بھی بہت خوب رہا۔

''وہ چار'' حقیقت پر مبنی کہانی الگ طرح سے ہی متاثر کیا کرتی ہے کہ وہ کہانی ہوتے ہوئے بھی حقیقت ہی ہوتی ہے اور بعض اوقات یہ بھی درست ثابت ہوتا ہے کہ منفی رویوں سے اثباتی راہیں نکلتی ہیں۔ ''کلموہی کہیں کی'' کے مرکزی کردار فخر الزماں کو نظر انداز کر کے آخری پیراگراف سے متعارفہ تابندہ حسین سے کہانی منسوب کرنا باعثِ اختلاف بنتا ہے۔ قرطاس قلم کا قیدی ڈاکٹر مظفر حنفی صاحب کی ادبی وابستگی و والہانہ شیفتگی کا غماز ہے جناب شاد عارفی کی تخلیقات کی نشر و اشاعت کا خصوصی اہتمام اُنہیں شاگردِ رشید ہونے کا مستحق ٹھہراتا ہے۔

نظمیں اپنے اپنے مخصوص پس منظر و موضوعات کے ساتھ نیز سیلابی قطعات بھی حقیقی صورتِ حال کے ترجمان تھے، غزلیں اپنے انفرادی اشعار و مجموعی تاثر کے ساتھ آصف ثاقب صاحب، غالب عرفان صاحب، پروفیسر خیال آفاقی، نسیم سحر صاحب، مقبول منظر اور نذیر فتح پوری صاحب کی پسندیدہ رہیں۔ ''ہوا کے دوش پر'' اپنے اس اختصاص کی بنا پر ہمیشہ یاد رہے گا کہ اسے ابتداء تا انتہا قارئین نے سندِ پسندیدگی عطا کیے رکھی اور یہی مقبولیت اس خاص آدمی کی داستانِ حیات کا اعزاز دیتی ہے۔ جناب حنیف باوا نے جس منکسر المزاجی سے سب کا تشکر ادا کیا وہ ان کی وسیع النظری و قلبی کشادگی کا منہ بولتا ثبوت ہے ورنہ ممنون تو ہمیں اُن کا اور ادارۂ چہارسو کا ہونا چاہیے جن کے توسط سے باوا جی کی فنی عظمت اور مختلف تخلیقی نہجوں سے متعارف و مستفید ہونے کا موقع ملا۔ میرے سارے اکٹھر کے لیے، بہت مبارکباد۔۔۔

نصرت بخاری صاحب کی رائے بڑی صائب و مناسب ہے۔ ایم۔فل کے مقالوں اور پی۔ایچ۔ڈی کی ریسرچ کے لیے قرطاسِ اعزاز کی معاونت ہر اشتباہ سے بالاتر ہے جبکہ مطلوبہ مواد کی یکجائی و دستیابی گوگل پر سرچ سے کم نہیں اور یوں بھی۔۔۔آسانیاں بانٹنے کا شرف کسی کسی کو ہی حاصل ہوتا

ہے۔گزشتہ شمارے کی غزل کے دومصرعے صحیح صورت میں اس طرح سے تھے:

دستور کی شہراہ کو کیوں مسدود کرتے ہیں

اور

سب مل کے صرف قومی ترانہ ہی گایئے

۲۰۱۵ء کے لیے صاحبِ قرطاسِ اعزاز کا یہ بولتا اور سوچتا ہوا شعر:

وہ بات جو آپ کہہ نہ پائے مری غزل میں بیاں ہوئی ہے

میں آپ کا حرفِ مدّ عا ہوں، مجھے دعاؤں میں یاد رکھیے!

شگفتہ نازلی (لاہور)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

اس بار قرطاسِ اعزاز ایسی ادبی شخصیت کے لیے مختص کیا گیا جو خود غزل نہیں کہتے بلکہ غزل انہیں کہتی ہے۔ مجھے اگر سچ کہنے کا موقع ملا ہے تو کہنے دیں کہ محترم پروفیسر ڈاکٹر پیرزادہ قاسم رضا صدیقی کے افسانے نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیا یا نہیں لیکن آپ کی نعت اور سرِ ورق پر چھپی غزل نے مجھے چاروں شانے چت گرا دیا ہے، اس غزل نے مجھے آگے بڑھنے نہیں دیا۔ ڈاکٹر صاحب پر لکھنے والوں نے بھی کمال تحسین کیا ہے لیکن ایک تشنگی کا احساس بہر حال ہے کہ صدیقی صاحب کے کوائف درج نہیں کیے گئے۔

اس شمارے میں چار افسانے شامل ہیں۔''بروری روڈ'' پڑھنا شروع کیا تو یہی سوچتا رہا کہ اب افسانہ شروع ہوگا لیکن ''سپاہی بھی خوش ہوں گے'' پڑھنے کے بعد مجھ سے یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ اس تحریر میں افسانے کی مقدار کتنی ہے۔''وہ چار جیل جانے والے'' مسلسل کہانی ہے، حالات کہیں بھی ڈانواں ڈول نہیں ہونے پائے۔ خطا انسانی خمیر میں شامل ہے لیکن خطا کے بعد پچھتاوا آئندہ گناہ سے روکتا ہے۔ افسانے کے اختتام پر شہناز کی اپنی سوچ مثبت ہے اور قابلِ داد بھی۔''شعور کا سفر'' مغربی معاشرے میں جنم لینے والی کہانی ہے جہاں گورے اور کالے بلا تمیز قانون کی زد پہ رہتے ہیں لیکن ان میں ایک خطِ امتیاز بہر حال ہے۔ الزبتھ کو اپنی بیٹی جین اور سیاہ فام مائک کے تعلقات سے یہی فکر لاحق تھی کہ کہیں تاریخ خود کو دہرا نہ دے، ممکن ہے مائک ان تین سیاہ فام جوانوں جنہیں پھانسی کی سزا ہوئی تھی، کی نسل سے ہو۔ اسلوب بھی مغربی طرزِ نگارش سے مملو ہے۔''کلموہی کہیں کی'' کہانی ایک ایسے کردار کی گرد بُنی گئی جو Self made ہے، دوستوں کا اس کی کامیابی پر تالیاں بجانا اس امر کی گواہی ہے کہ ان میں رنجش یا حسد جیسی کوئی دیوار نہیں تھی لیکن انجام نے کہانی کو Super نہیں ہونے دیا۔

احسان بن مجید (اٹک)

گلزار بھائی، آداب۔

اس بار چہارسو کا مطالعہ رس رابطے سے شروع کیا۔ آپ نے میری ادنیٰ سی خدمت کو اس انداز سے پیش کیا کہ کئی قارئین کے پُر خلوص خطوط، ای میلز اور فون کالز نے میری حوصلہ افزائی بھی کی اور دلی مسرّت بھی عطا کی۔ خدا آپ کو صحت عطا کرے، آپ کی عمر دراز کرے اور آپ کی کاوش اسی طرح سرحدوں کی دوریاں مٹاتے رہیں۔ (آمین)

پیرزادہ قاسم کے شمارے کی شروعات سرورق سے کریں تو بہتر ہے۔ پوٹریٹ کے ساتھ ساتھ غزل بھی خوب ہے''آپ بہت عجیب ہیں'' کیا بات ہے۔ غزل کا ہر شعر قابلِ داد ہے اور اسے سرِ ورق پر ہی ہونا چاہیے تھا۔ آپ کی بدولت ہمیں پیرزادہ قاسم صاحب کی شاعری پڑھنے کا موقع ملا۔ محنت آپ کرتے ہیں اور اس کا لطف ہم اٹھاتے ہیں۔

حسبِ معمول''براہِ راست'' بھی خوب رہا۔ سوال جواب سے پہلے تعارف میں ہر مرتبہ نیا پن کہاں سے لے آتے ہیں آپ؟ سوالات بھی چُن چُن کر کیے ہیں اور اُن کے جواب بھی عمدہ ہیں۔ میر صاحب کے والد کا قصّہ بھی اچھا ہے۔ علی سردار جعفری، ڈاکٹر عزیز اندوری، عزیز حامد مدنی، جناب ابوالخیر کشفی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، جناب شہزاد احمد نے قاسم صاحب کی شخصیت اور اُن کی شاعری کے حسن کا بیان بخوبی کیا ہے۔ اس شمارے میں آپ نے فلرز کو بھی بخوبی استعمال کیا ہے اور اس طرح اعجاز کا ایک درجہ اور بڑھ جاتا ہے۔ افسانوں کی تعداد کم رہی۔ سبھی افسانے اور شموئل احمد صاحب کے ناول کا باب بھی دلچسپ ہے۔ فیروز عالم صاحب نے اس بار ایک نا فراموش قصے کا ذکر کیا ہے۔ بچے کی موت وہ پینتالیس سال بعد بھی نہیں بھولے۔ اُنہیں نے سارے قصے کا بیان اس طرح کیا ہے کہ لگتا ہے کوئی دردناک کہانی پڑھ رہے ہیں اور کہانی ختم ہوتے ہی دل پر تو اثر کرتی ہی ہے اور یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر کتنے حساس ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بڑی ایمانداری سے اپنے گھر کے حالات درج کرتے ہیں تو میری نظر میں اُن کی عزت کئی گُنا بڑھ جاتی ہے۔ بہت کم ایسے لوگ آج کے دَور میں نظر آتے ہیں جو زندگی میں اعلیٰ مقام پر پہنچ کر بھی اپنی یادوں کو نہیں بھولتے۔ اُن کی یہ داستان بہت سے لوگوں کو متاثر کرے گی۔ پروین شیر کی''چند سیپیاں سمندروں سے'' قسط وار چھاپنے کا آپ کا فیصلہ درست ہے۔ پروین شیر کا اندازِ بیان بہت خوب ہے اُن کی نثر میں بھی شاعری کا مزا آتا ہے۔ اُن کی شخصیت کھُل کر پڑھنے والے کے سامنے آ جاتی ہے اور''احتجاج'' نظم میں اُنہیں لفظوں سے پوٹریٹ بنا دیا۔''ایک صدی کا قصہ'' ہر بار کی طرح اس بار بھی دلچسپ ہے۔

ڈاکٹر رینو بہل (چندی گڑھ، بھارت)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

اس بار قرطاس اعزاز پروفیسر پیرزادہ قاسم رضا صدیقی کے نام خوب ہے۔ اچھے شعر، اچھا ترنم اور اچھا عہدہ جب کسی پیکر میں ڈھلتے ہیں تو پیرزادہ قاسم وجود پاتے ہیں:

ایں سعادت بزور بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

''تندہوا کے جشن میں''''مجھے دعاؤں میں یاد رکھیئے'' اچھے اچھے تجربات کے عکاس ہیں آپ نے تو ماشاء اللہ براہِ راست استفادہ کیا اور ہمیں کروایا، ساتھ ہی علی سردار جعفری، عزیز حامد مدنی، ابوالخیر کشفی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، جون ایلیا، شہزاد احمد، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، عزیز اندوری، محسن احسان، وسیم بریلوی جیسے مشاہیر بھی پیرزادہ کے قائل نکلے گویا:

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے

سب اسی زلف کے اسیر ہوئے

ناخلف اولادوں کی روداد''فائق باپ کی لائق اولاد'' اتنا پسند کیا جا رہا ہے کہ ''شاعر'' کے مدیر افتخار امام صاحب نے فرمایا کہ اس کی دوسری قسط ہو تو میں ''شاعر'' کے لیے بھیجوں۔ میرا مضمون جناب آصف ثاقب، یوگیندر بہل تشنہ، امرناتھ دھمیجہ اور پروفیسر زہیر کنجاہی جیسے اربابِ نظر نے پسند فرمایا اس کے لیے میں ان سب کا ممنون ہوں۔

رؤف خیر (حیدرآباد، دکن)

گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

قرطاسِ اعزاز اس بار پروفیسر ڈاکٹر پیرزادہ قاسم رضا صدیقی صاحب کے حصے میں آیا۔ بلاشبہ وہ اس کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ آپ نہ صرف بلند پایہ ادیب، دانشور بلکہ ہماری معدوم ہونے والی سنہری تہذیب کے وارث، شائستگی اور اعلیٰ اقدار کے علمبردار بھی ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ ہمارے سماجی، ادبی، علمی، اخلاقی اور تخلیقی ارتقا کی راہوں میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ موجودہ شمارے میں بے شمار ممتاز اہلِ قلم نے ان کے علمی و ادبی کام پر اپنی آراء پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں خراجِ تحسین بھی پیش کیا۔ ان احباب کی تحریروں میں ڈاکٹر صاحب کے حسب نسب، تعلیمی و تدریسی خدمات کے علاوہ زندگی کے دیگر محاسن بھی واضح ہوئے۔ بطور خاص ''براہِ راست'' میں ڈاکٹر صاحب سے آپ کی گفتگو نہایت عالمانہ اور چشم کشا اور ان کے بارے بے شمار معلوماتی پرتیں کھولتی نظر آتی ہے۔ یوں تو ان کے متعلق تحریر کردہ تمام مضامین سیر حاصل اور توجہ طلب ہیں لیکن محترم جون ایلیا، شہزاد احمد، ابو الخیر کشفی، ڈاکٹر محمد علی صدیقی اور جگن ناتھ آزاد کی تحریریں بہت وقیع اور زبان و بیان کے ارفع نمونے ہیں۔

متذکرہ شمارے میں سید سعید نقوی صاحب کی کہانی ''شعور کا سفر'' محترمہ سیمیں کرن کا افسانہ ''کلموہی کہیں کی'' محترم شہناز خانم عابدی ''وہ چار جیل جانے والے'' دلچسپ تحریریں تھیں۔ دیپک کنول صاحب حسبِ معمول بھارتی فلم انڈسٹری کے کسی مہان کلاکار کو متعارف کروا کر بربطِ خوابیدہ کے تاروں کو مرتعش کر دیتے ہیں اور چند لمحات کے لیے عہدِ شباب آنکھوں میں گھوم جاتا ہے۔ ان کا ہر مضمون نہایت معلوماتی ہوتا ہے جس سے متعلقہ فنکار کے جیون اور اس کی فنکاری کے مختلف پہلو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع نصیب ہوتا ہے۔

نیر اقبال علوی (لاہور)

بھائی گلزار جاوید، السلام علیکم۔

''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ اپنے علمی و ادبی وقار کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ سرورق پر پروفیسر ڈاکٹر پیرزادہ قاسم رضا صدیقی صاحب کی تصویر اور غزل دیکھ کر دل و دماغ مہک اٹھے۔ آپ بھی کمال کے آدمی ہیں۔ ''براہِ راست'' میں آپ کے سوالات کے جوابات میں جس علمی، ادبی، ثقافتی اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ادب و علم کے موتی بکھیرے ہیں وہ ڈاکٹر صاحب ہی کا خاصا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت روایت پسند اور نستعلیق قسم کی ہے یہی خوبی ان کی گفتگو اور کلام میں نمایاں ہے۔

گلزار بھائی پیرزادہ قاسم صاحب کے حوالے سے کیسے کیسے نابغۂ روزگار شخصیات کے فکر انگیز مضامین جمع کیے ہیں۔ عزیز حامد مدنی، محسن احسان، جون ایلیا، محمد علی صدیقی، شہزاد احمد کے مضامین کی تازگی اور گہرائی ڈاکٹر صاحب کی منفرد شخصیت اور فکر و فن کے مختلف دریچے وا کرتے ہیں۔ پیرزادہ قاسم صاحب کی غزلوں کا انتخاب صاعقہ انعام نے اس زاویے سے کیا ہے جس سے مختلف کیفیات کی خوشبو پھیلتی محسوس ہوتی ہے۔

ڈاکٹر فیروز عالم صاحب کی ایک عام آدمی کی داستانِ حیات ''ہوا کے دوش پر'' کی قسط نمبر ۲۵ کے مطالعے سے اللہ تعالیٰ پر کامل یقین اپنی محنت پر بھروسہ اور اپنی صلاحیتوں پر اعتماد کا درس دیا ہے۔ لانڈری والے شریف صاحب کی شرافت اور انسان دوستی کو سلام ''ٹال والا گھر'' اور ''نئی پینٹ شرٹ'' کے واقعات بظاہر معمولی ہیں مگر غور کیا جائے تو ایسے واقعات کو یاد رکھنے سے زندگی میں حوصلے کے ساتھ آگے بڑھنے کا باب کھلا رہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب یقیناً وہ قبولیت کی گھڑی تھی جب والدہ محترمہ نے کہا ''بیٹا تجھے اللہ شیشے کے فرش والا مکان دے''۔

سعید نقوی کی کہانی لاجواب ہے۔ دیپک کنول نے ہر بار کی طرح متاثر کیا۔ ابھی اتنا ہی مطالعہ کر سکا تھا کہ میر پور خاص سے کراچی جاتے ہوئے کوچ میں چہارسو پڑھنے کی نیت سے ساتھ تھا مگر جب کوچ سے کراچی اُترا تو رسالہ ساتھ نہیں تھا۔ میری غزل کے مطلع کے مصرعِ ثانی میں مشینی کتابت کی ذرا سی غلطی سے قافیہ ''ہالے'' کی جگہ ''بالے'' ہو گیا ہے۔

منزل سے روشنی کے ہالے پکارتے ہیں

نوید سروش (میر پور خاص)

محبی و محترمی گلزار جاوید صاحب، سلام و رحمت۔

چہارسو موصول ہوا پڑھ کر طبیعت حظ اندوز ہوئی۔ آپ کی منتخب کی ہوئی علمی و ادبی شخصیات کا تعارف ہمیشہ خوش آئند ہوتا ہے۔ اب کے بھی ڈاکٹر پیرزادہ قاسم کے بارے میں بہت کچھ پڑھ کر طبیعت پر نہایت خوشگوار اثر ہوا۔

ان کی شاعری ایک جداگانہ رنگ وآہنگ رکھتی ہے۔آپ نے ان کا انتخاب کر کے قارئین کوایک بلند وبالا ادبی شخصیت سے روشناس کرایا۔"چہارسوٗ" آپ کے دم سے دن دونی رات چوگنی ترقی کی منزلیں طے کررہا ہے۔اللہ تعالیٰ آپ کواس ادبی خدمت کا بیش از بیش صلہ دے۔

صدیق شاہد (شیخو پورہ)

گرامی قدر گلزار جاوید صاحب،السلام علیکم۔

"چہارسوٗ" بابت ماہ نومبر و دسمبر نظر نواز ہوا جو ہم نے بصد شوق پڑھا۔خوبصورت نثری اور منظوم تحریروں سے مرصع ومرقع "چہارسوٗ" عصرِ حاضر میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔جدیدیت اور انفرادیت کے جملہ پہلوؤں سے عبارت یہ ادبی جریدہ استفادے کی ہزار ہا صورتیں رکھتا ہے۔قرطاسِ اعزاز ایسا منفرد اور مقبول سلسلہ گویا ایک مکمل دستاویز ہے۔جس سے مختلف نوعیت کے تنقیدی اور توصیفی حوالے کشید کیے جاتے ہیں۔زیرِ نظر شمارہ ڈاکٹر پیرزادہ قاسم کے اعزاز میں ہے۔اس حصے میں سکہ بند اور ممتاز قلم کاروں کے مضامین پڑھنے کو ملے۔براہِ راست کا عنوان بھی معلومات اور ملاقات کے ذیل میں خصوصیت کا حامل ہے۔ڈاکٹر صاحب کے منتخب کلام نے دامن دل کھینچا۔افسانے چاروں ہی بہت شاندار اور جاندار ہیں۔غزلیات کے باب میں بڑے نام اور معیاری کلام ایک خوبصورت امتزاج ہے۔نظمیں ہر اعتبار سے ایک کِھلتا ہوا گلزار ہیں۔دیگر مستقل سلسلے شوق اور دلجمعی سے پڑھے۔الغرض "چہارسوٗ" کا ساتھ مجھ ایسے ادبی طالب علموں کے لیے رات کے اندھیرے میں ایک روشن چراغ کی مانند ہے۔

تصور اقبال (پنڈی گھیپ)

مکرمی گلزار جاوید،آداب وتسلیم۔

اس بار قرطاسِ اعزاز ڈاکٹر پیرزادہ قاسم رضا صدیقی کے نام دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ شہر کے ادبی حلقوں میں ان کی حیثیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔مختلف ادبی محفلوں میں ان سے ملنے اور مشاعروں میں سننے اور ان کے ترنم سے لطف اندوز ہونے کا اعزاز بھی رکھتا ہوں۔ان کے متعلق مضامین اور ان کی شاعری کا کچھ حصہ چہارسو کو رنگین بنا گیا۔۱۹۵۹ء کا افسانہ "زندگی بڑی حسین ہے" سے اندازہ ہوا کہ اس صنف کو بھی انہوں نے برتا لیکن کم کم۔زندگی کے حسین ہونے کا ادراک ہو جائے تو زندگی کے غم ڈھل جاتے ہیں اور انسان بدحالی میں بھی خوش ہوسکتا ہے۔میرا ایک شعر اس حوالے سے:

ہر ایک لمحۂ ماضی کو جاوداں کر لو
یہ زندگی تمہیں ملنے کی بار بار نہیں

آپ کے "براہِ راست" نے ہمیں پیرزادہ قاسم کو اچھی طرح سمجھنے کا موقع دیا۔بلوچستان کے حوالے سے آغا گل کے افسانے اہمیت کے ہوتے ہیں۔تاریخی حقائق اور جغرافیے کے آمیزے سے آغا صاحب نے معرکۃ الآرا افسانے لکھے ہیں۔یہ افسانہ "بروری روڈ" ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ دشمن کی کمزوری کو جانے بنا ہم اس پر قابو نہیں پاسکتے۔"وہ چار جیل جانے والے" شہناز خانم عابدی نے ایک سچے واقعے پر مبنی افسانے کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا کہ شر میں بھی خیر کا پہلو ہوسکتا ہے۔سید سعید نقوی کا "شعور کا سفر" نسلی اور طبقاتی تعصبات گزرتے وقت کے ساتھ کیوں کر اپنے مفاہیم بدل لیتے ہیں۔یہ اس افسانے کا ماحصل ہے۔سیمیں کرن کی "کلموہی کہیں کی" اگر ایک سطر میں تبصرے کی شرط ہو تو کہا جاسکتا ہے کہ "لوگوں کو دوسرے کی آنکھوں کا تنکا تو نظر آتا ہے اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا"

نجیب عمر (کراچی)

مکرمی ومحترمی گلزار جاوید صاحب،السلام علیکم۔

ستمبر اکتوبر کا تازہ شمارہ موصول ہوا جس کے لیے انتہائی ممنون ہوں۔اس مرتبہ "قرطاس اعزاز" ڈاکٹر رینو بہل کے نام کر کے آپ نے حق بحقدار رسید کے مصداق بڑا احسن اقدام سرانجام دیا ہے وہ اس اعزاز کی جائز طور پر حقدار ہیں یہ کام کافی تاخیر سے ہوا ہے لیکن پھر بھی غنیمت ہے۔دعا ہے اللہ تعالیٰ اُنہیں ادب کی خدمت کے لیے تادیر زندہ وسلامت رکھے (آمین)

سُرور انبالوی (راولپنڈی)

محترمی جاوید صاحب،آداب ونیاز۔

یوں تو "چہارسوٗ" کا ہر شمارہ اردو ادب میں انفرادیت کا حامل ہوتا ہے لیکن محترمہ رینو بہل سے متعلق گوشہ نے اس میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔آپ کا انتخاب قابلِ ستائش ہے اُن کے افسانوں کے بارے میں جو مختلف ادیبوں کی آراء ہیں وہ حق پر مبنی ہیں ورنہ آج کے دور میں مصنف کے بارے میں جو آراء دی جاتی ہیں وہ ذاتی تعلقات کی بنا پر ہوتی ہیں اس سے تنقید نگاری یا تبصرہ نگاری کی اعتباریت ختم ہوتی جارہی ہے۔

عرش صہبائی (جموں،بھارت)

محترم بھائی گلزار جاوید صاحب،السلام علیکم۔

اس بار قرطاس اعزاز رینو بہل کے نام پڑھ کر ان کی شخصیت اور فن کے بارے میں کما حقہ واقفیت حاصل ہوئی بے شک اردو ادب سے ان کی وابستگی اور خدمات قابلِ قدر ہیں۔نیز ادب میں کسی مقام ومرتبے سے قطع نظر پنجاب صوبہ ہریانہ کی واحد اردو کی افسانہ نگار خاتون ہونا ہی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔علاوہ ازیں دیہاتی زندگی اور ادب برائے زندگی کی ترجمانی بھی ان کی دوسری اہم خوبی ہے۔ان کا ڈرامہ "قبضہ" نہایت مختصر،دلچسپ تاہم انجام کار قاری سوچتا ہے کہ کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے؟

اسی طرح انجم جاوید صاحب کا "قصہ چہار درویش" بھی ایک خوبصورت تحریر ہے تاہم اس کا انجام بھی ماورائے عقل اور یہی سوچ کا حامل کہ کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے؟ افسانہ "کالی دھوپ" محبت کے حوالے سے ہزاروں واقعات کا پرتو منیرہ احمد کا یہ افسانہ کسی حد تک میرے اس شعر کا آئینہ دار ہے کہ:

آدمی بے وفا نہیں ہوتا

ہاں تغیر پذیر ہوتا ہے

آپ کا افسانہ ''استاد'' کہانی کی بنت کاری اور طرزِ تحریر کے ساتھ ساتھ اعصاب کو جھنجھوڑنے اور رونگٹے کھڑے کردینے والا افسانہ ہے۔ غیر فطری انسانی خواہش کو کتے جیسی نجس مخلوق کے ساتھ جس طرح خلط ملط کیا انتہائی متاثر کن ہے۔ کت۔۔۔تا۔۔۔آ د۔۔۔می۔۔۔آ د۔۔۔می۔۔۔کت۔۔۔تا ۔۔۔کتا۔۔۔کتا۔۔۔آدمی۔۔۔کتا!!!

مجھے یاد نہیں کہ کسی افسانے کی اتنی زوردار پنچ لائن میری نظر سے گزری ہو۔ استاد کی شخصیت کا خاکہ اور معاشرے کی پوشیدہ برائی کو اس ہنر مندی کے ساتھ پیش کیا کہ اُس برائی کے مرتکب انسان سے شدید نفرت پیدا ہوئی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ انسان سے تو نہیں البتہ اس برے عمل سے نفرت پیدا ہوئی۔ بہرحال اس انتہائی با مقصد اور تلخ حقیقت پر مبنی افسانہ تحریر کرنے پر دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

سلمٰی اعوان، دیپک کنول اور فیروز عالم صاحب کی نگارشات دلچسپی کی سند حاصل کر چکیں۔ رؤف خیر صاحب کا ''خدا بھول گئے'' بعض مشہور ادیبوں، شاعروں کی ناخلف اولادوں کے بارے میں چشم کشا انکشافات پڑھ کر افسوس ہوا۔ شاعری کے حوالے سے پروفیسر خیال آفاقی کی غزل کے علاوہ دیگر شعراء کی غزلیں بھی مجموعی طور پر شاندار اور معیاری انتخاب تھا۔

سلیم ناز (کراچی)

مکرمی و محترمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

نئی آن بان اور شان و شوکت لیے ادبی مجلّہ چہارسو ہاتھ میں کیا آتا ہے گویا ایک دبستان کھل جاتا ہے۔ ادب کے ساتھ آپ کی محبت کے رنگ ہر صفحے پر مہک رہے ہوتے ہیں۔ اس بار ''قرطاسِ اعزاز'' محترمہ ڈاکٹر رینو بہل کے نام تھا جو اردو سے محبت کرنے والی ایک جواں ہمت افسانہ نگار ہیں۔ ابرِ گوہر بار میں عطیہ سکندر علی نے مختلف اہلِ قلم کے خطوط اکٹھے کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ ڈاکٹر رینو بہل دنیائے ادب کا ایک معتبر نام ہے۔ نسیم سحر اور ماہر اجمیری کی نعتیں جذبے اور عقیدت سے بھرپور ہیں۔ آنگن میں کالی دھوپ، بستی اور استاد ایسے افسانے ہیں جو بار بار پڑھے جانے کا تقاضا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر فیروز عالم کی سوانح چہارسو کے رنگوں میں معتبر اور خوشگوار رنگ ہے۔ محترمہ سلمٰی اعوان کا سفرنامہ ''عراق جل رہا ہے'' بڑی درد مندی اور خلوص سے لکھی ہوئی تحریر ہے جس سے صرف نظر کرنا ممکن ہی نہیں۔ ''ایک صدی کا قصہ'' میں دیپک کنول صاحب نے نوشاد علی کی زندگی پر معلومات افزا تحریر فراہم کی ہے۔ ''خدا بھول گئے'' رؤف خیر کی اچھی اور خوبصورت تحریر ہے۔ غرض چہارسو ادبی رسائل کے حلقے میں اپنا ایک منفرد مقام قائم رکھے ہوئے ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید کامیابیاں عطا فرمائے۔ (آمین)

ابراہیم عدیل (جھنگ)

''ڈاکٹر وزیر آغا بطور اقبال شناس''

یوں تو علامہ اقبال پر دنیا کے ہر خطے بالخصوص انڈو پاک میں بہت زیادہ تحقیقی اور تنقیدی کام ہو رہا ہے مگر زیرِ نظر کتاب میں ڈاکٹر وزیر آغا صاحب نے جس نظر اور زاویے سے اقبال کو جانچا اور پرکھا ہے اُس سے اقبالؔ کی شخصیت اور فن کے بہت سے نئے زاویے نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آئے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے جن زاویوں سے اقبال کی جانب رجوع کیا ہے وہ کچھ اس طرح ہے ''اقبالؔ اور شپنگلر، اقبال کے تصورات عشق و خرد، کلامِ اقبالؔ میں ڈرامے کا عنصر، کرمکِ ناداں سے کرمکِ شب تاب تک، اقبالؔ اور بے داریٔ ذات، خودی اور بے خودی، جدید تنقید اور اقبالؔ، اقبالؔ اور جدید اردو شاعری، اردو ادب میں طنز و مزاح اور اقبالؔ، اردو شاعری کے مزاج میں اقبالؔ کی غزل گوئی، اردو شاعری کے مزاج میں اقبالؔ کی نظم گوئی، فطرت پرستی کی ایک مثال۔۔۔اقبالؔ''۔ ڈاکٹر ہارون رشید تبسم لائق صد مبارکباد ہیں کہ انہوں نے جا بجا بکھرے ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کے مضامین کو کتابی شکل دے کر اہلِ علم اور فکر کو ایک نادر تحفہ دیا ہے۔

اشاعت: ۲۰۱۴ء، قیمت: ۴۸۰ روپے، دستیابی: نظریہ پاکستان اکادمی، سرگودھا۔

''گردابِ وجود''

علی نقی خان نے ''گردابِ وجود'' تمام کا تمام خود کلامی کی تکنیک میں لکھا ہے۔ لہجہ تیز اور آواز قدرے بلند ہے فنی سطح پر یہ ایک نئی راہ نکالتا فن پارہ ہے۔ پلاٹ سارے کا سارا طویل انسانی تاریخ کے شعورِ زیست کا سرمایہ ہے جو متکلم اپنے وجود کے مسئلے پر غور و فکر کے دوران میں شاملِ حال پاتی ہے۔ ذات، سماج اور آفاق کے تناظر میں موجود تناقضات کی بے کراں لہروں پر بہے جا رہی ہے۔ نسائی مسائل کی بوقلمونی ہر سطر میں ایک کلائمکس کا منظر پیش کرتی ہے۔ شروع سے آخر تک زوردار کشمکش برقرار رہتی ہے تا آنکہ قاری عورت کے اعمالِ زیست کی کرب ناک داستان کے انجام تک پہنچنے کے لیے بے چین ہو جاتا ہے مگر انجام کہیں نہیں ہوتا صرف ایک لاینحل کشمکش، زیست کا نام پاتی ہے اور عورت اپنی تاریخ میں گمنامی کے گہرے غاروں میں سنگ بستہ نظر آتی ہے۔

......غائر عالم

اشاعت: ۲۰۱۴ء۔ قیمت: ۲۰۰ روپے، دستیابی: مثال پبلیشرز، فیصل آباد۔

...... تعبیرِ حرف ......

ڈاکٹرغفورشاہ قاسم کے تنقیدی مضامین کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ دیکھ کرخوشگوار حیرت ہوئی کہ موصوف مغرب میں ادبی مباحث سے بھی ناآشنا نہیں تاہم غالباً''خوفِ فسادِخلق'' کے باعث فی الحال وہاں کے معاصر دبستانِ تنقید کی تقلید نہیں کر سکتے۔ڈاکٹرغفورشاہ قاسم کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''تعبیرِ حرف''اس کے پیش لفظ میں ایسے دواور مجموعوں کا وعدہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ صرف اسی مجموعے کو پڑھ کرڈاکٹر صاحب کے مقام بہ حیثیت تنقید نگار کاتعین قبل از وقت ہوگا۔تین سو باون (۳۵۲) صفحات کی یہ کتاب دوحصوں پر مشتمل ہے۔پہلے حصے''مضامین ومقالات''میں معاصر ادبی مباحث کے علاوہ بعض اہم ادبی شخصیات کی شاہکار تخلیقات کا تجزیاتی مطالعہ بھی شامل ہے۔اقبالیات کے حوالے سے دو مضامین اور نعت کے حوالے سے دو مضامین بھی کتاب کے اس حصے کی زینت ہیں۔کتاب کا دوسرا حصہ''کتابوں کے پیش لفظ/تبصرے/فلیپ''مختلف تخلیقات پر تبصروں اور تجزیات پر مشتمل ہے۔کتاب کے مشمولات کی دی ہوئی تقسیم اپنی جگہ، میں مصنف کی تنقید نگاری پر بحث میں سہولت کے لیے یہ کہوں گا کہ اس کتاب میں کچھ مضامین Theoretical Criticism ہیں اور کچھ Practical Criticism۔ادبی مباحث اور اصنافِ سخن کے حوالے سے مضامین کو میں Theoreticial Criticism کہوں گا، اور تخلیقات وشخصیات کے حوالے سے مضامین کو Practical Criticism۔ ......منور علی ملک

اشاعت:۲۰۱۴ء، قیمت:۵۰۰روپے، دستیابی: مثال پبلشرز، فیصل آباد۔

...... تضمین ......

حضرت سہیل غازی پوری کے تضامین کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک حیرت انگیز مسرت کا احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے جن شعرائے کرام کی غزلوں کی تضمین کی وہاں اشعار کی تفہیم کے ساتھ ساتھ اپنے اسلوب میں کچھ نئے مضامین بھی تخلیق کیے ہیں۔حضرت سہیل غازی پوری کی پہلی پہچان تو غزل ہی ٹھہری ہے لیکن انھوں نے دیگر اصنافِ سخن میں فکری جولانی طبع کا بھی مظاہرہ کیا ہے کہ جس صنف کی طرف بھی توجہ کی ہے اس کو اپنے جداگانہ اور منفرد اسلوب کے ساتھ بڑے رواں دواں انداز میں بیان کر کے شاعری کو خواص پسند بنائے رکھنے کے ساتھ عوام سے گفتگو کا بھی سلسلہ قائم رکھا ہے۔حضرت سہیل غازی پوری کے تضامین کے جواب میں بلکہ دلیل کے طور پر بہت اختصار سے حضرت شاعرلکھنوی کی غزل کے ایک شعر کی تضمین پیش کر رہا ہوں۔شاعرلکھنوی کا شعر ہے:

ایک دریا تھی زندگی پھر بھی　　　عمر بھر کس غضب کی پیاس رہی

اب ملاحظہ کیجیے مذکورہ شعر پر حضرت سہیل غازی پوری کی تضمین:

تیرگی میں تھی روشنی پھر بھی　　　لحہ لحہ تھی آ گہی پھر بھی
موج در موج تھی خوشی پھر بھی
''ایک دریا تھی زندگی پھر بھی　　　عمر بھر کس غضب کی پیاس رہی''

اشاعت:۲۰۱۴ء، قیمت:۳۰۰روپے، دستیابی: شعری دائرہ، دستگیر سوسائٹی، فیڈرل بی ایریا، کراچی۔..... سلطان جمیل نسیم

...... روشنی بھی فریب دیتی ہے ......

دعا علی بنیادی طور پر نظم کی شاعرہ ہیں، دعا علی کی نظموں میں ہمیں خاندان ایک اکائی کی صورت میں نظر آتا ہے مگر یہ نظمیں رشتوں کی محبت اور اعتماد کے نغموں کے ساتھ ساتھ رشتوں کی پامالی اور بے اعتباری کی تصویریں بھی ہیں، خواہشات کا پورا نہ ہونا، عدم تحفظ اور ہر قدم پر اپنے کم تر ہونے کا احساس تلخیوں کو جنم دیتا ہے۔شاعرہ نے انہی تلخیوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ان نظموں کے موضوعات بھی ایک خاندان کی طرح جڑے ہوئے محسوس ہوتے ہیں، کسی دکھ، المیے یا واقعے کو مختلف زاویوں سے دیکھنا، محسوس کرنا اور پھر بیان کرنا آسان نہیں مگر دعا علی نے اپنے تجربات، احساسات کو نظموں کی صورت میں صفحہ قرطاس پر منتقل کر دیا ہے۔اُن نظموں کا تاثر دیرپا ہے۔ان کی نظموں میں قنوطیت نہیں بلکہ تمام تر مشکلات اور نامساعد حالات کے باوجود زندگی سے پیار کی فضا نظر آتی ہے۔بعض نظموں کا لہجہ اور بُنت منیر نیازی کی نظموں کے زیر اثر دکھائی دیتا ہے، جبکہ محبت کے حوالے سے نظموں میں پروین شاکر اور امجد اسلام امجد کی نظموں سے دعا علی متاثر نظر آتی ہیں۔ ...... نوید سروش

اشاعت:۲۰۱۴ء، قیمت:۳۰۰روپے، دستیابی: شاز پبلی کیشنز۔

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی